سرما ۱۹۹۷

آج

ترتیب: اجمل کمال

سید محمد اشرف — اسد محمد خاں — رابندر ناتھ ٹیگور

تادیوش بوروسکی — مارین شورسکو — جان پروکوپ

وسلاوا شمبورسکا — لنڈسے بلسم — مارک ڈاٹل

نجیب محفوظ

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سرما ۱۹۹۷

جنوری۔مارچ ۱۹۹۷

مینیجنگ ایڈیٹر

زینت حسام

اہتمام

آج کی کتابیں

بی ۱۴۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

طباعت

ایجوکیشنل پریس

پاکستان چوک، کراچی

رابطے کے لیے پتا:

اے ۱۶، سفاری بائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

فون: ۸۱۱۳۳۷۲

ای میل: aaj@biruni.erum.com.pk

بیرونِ ملک خریداری کے لیے پتا:

محمد عمر میمن

۷۱۵۳، ریجنٹ اسٹریٹ، میڈیسن، وسکانسن ۵۳۷۰۵، یو ایس اے

ترتیب

بطورِ اداریہ

۷

اقبال احمد: ایک بستی ـــ شانتی نگر نامی

ناصر جمال: شانتی نگر کے زخم

مظہر زیدی: جسم میں مکان

***

سید محمد اشرف

۲۱

نمبردار کا نیلا

اسد محمد خاں

۱۰۳

سارنگ

رابندرناتھ ٹیگور

۱۱۷

آرٹ کا مفہوم

***

Scanned with CamScanner

تادیوش بوروسکی

۱۳۵

پروجیکٹ: پرچم

ماریِن شوریسکو

۱۳۶

شیکسپیئر

شطرنج

سینیکا

جان پروکوپ

۱۴۰

وکٹری اسکوائر، سابق سیکسونین اسکوائر، پر
گمنام سپاہی کی قبر کے پاس چڑیوں کے لیے
پھینکے گئے روٹی کے ٹکڑے کا نغمہ

وِسلاوا شمبورسکا

۱۴۳

ایک ریزیوے کا لکھنا
یاسلو کے قریب فاقہ کیمپ

***

Scanned with CamScanner

لِنڈسے بلسّم

۱۳۹

کیگالی کہاں ہے؟

مارک ڈائل

۲۰۱

کوپیش سباہے دیا گئے

***

نجیب محفوظ

۲۱۱

شادیانے

(دوسرا اور آخری حصہ)

بطورِ اداریہ

ایک بستی ــــ شانتی نگر نامی

۶ فروری ۱۹۹۷ کو شانتی نگر کے بد قسمت عیسائی باشندوں کے ساتھ جنوبی مسلمانوں کے ہجوم نے جو وحشت ناک کارروائی کی اُس کی روداد بیشتر اخباروں میں یکساں ہے۔ فساد برپا کرنے والوں نے تیرہ گرجا گھر تباہ کیے اور سیکڑوں گھر جلا ڈالے۔ لیکن اعداد و شمار اس جرم کی سنگینی کا پوری طرح اظہار کرنے سے قاصر ہیں جس کا ارتکاب اکثریتی مذہبی گروہ کے ایک حصّے نے اقلیتی عقیدے سے تعلق رکھنے والے اپنے ہم وطن شہریوں کے خلاف کیا ہے۔

دستیاب ہونے والے شواہد اس جانب بھی اشارہ کرتے ہیں کہ لوگوں کو اس ظالمانہ کارروائی پر اُکسانے اور اس کی تنظیم کرنے کے عمل میں ضلع خانیوال کی پولیس فورس کے کچھ ارکان باقاعدہ شامل تھے جبکہ باقی ارکان نے ڈیوٹی پر موجود ہوتے ہوئے تماشا دیکھتے رہنے کا طرزِ عمل اختیار کر کے اس جرم میں اعانت کی۔ چند ایک کے بارے میں اطلاع ہے کہ انھوں نے لُوٹ مار میں بھی حصّہ لیا۔ اس بھیانک خواب کا انجام اُس وقت ہوا جب قانون نافذ کرنے کے لیے فوج وہاں پہنچی۔ حالیہ یادداشت کی رو سے یہ فرقہ وارانہ تشدد کا بدترین واقعہ تھا۔

اخلاقی اصولوں کے قائل کسی معاشرے میں ایسا بھیانک واقعہ رونما ہوا ہوتا تو ذرائع ابلاغ اور تعلیم یافتہ طبقات اس خرابی کی جڑ تک پہنچنے کے لیے غور و فکر شروع کرتے۔ ہمیں حکومت اور سیاسی پارٹیوں کی جانب سے بھی یہ توقع کرنے کا حق تھا کہ وہ اعتماد بحال کرنے، اقدار کا اثبات کرنے اور قانون کی حکمرانی قائم کرنے کے علامتی اور حقیقی اقدامات کریں۔ لیکن اس قسم کی کسی تشویش یا خود تنقیدی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ وفاقی یا صوبائی حکومت کے کسی سیاسی عہدے دار نے اس بد قسمت بستی کا دورہ نہیں کیا جس کا نام "شانتی نگر" بجائے خود ایک طنز بن گیا ہے۔ کسی منتخب یا غیر منتخب سیاسی لیڈر نے وہاں جا کر ان ڈرے ہوئے، ستم رسیدہ لوگوں کو دلاسا دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی جن کے ۷۰۰ یا اس سے زیادہ گھر جلا دیے گئے، اسباب لُوٹ لیا گیا اور عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ صرف ایک سیاسی لیڈر ــــ جماعتِ اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد ــــ نے اس ظلم کی برسرِ عام مذمت کی۔

انسانیت کا اثبات کرنے اور ملک کے ضمیر کو بچانے کا کام اخبار نویسوں پر اور ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے نہایت مصروف اور بہادر کارکنوں پر چھوڑ دیا گیا۔ کمیشن کی انسانی حقوق کے چھ ممتاز کارکنوں پر مشتمل ٹیم نے ۱۰ فروری کو شانتی نگر کا دورہ کر کے یہ رپورٹ دی کہ "۱۹۸۹ میں چک سکندر میں پیش آنے والے احمدی کُش فسادات کے بعد سے کسی پوری شہری آبادی کو لُوٹنے اور

Scanned with CamScanner

تباہ کرنے کے بدترین واقعات ہیں، اور جزوی طور پر ۱۹۴۷ کے دنوں کی یاد دلاتے ہیں۔" اپنی پانچ نکاتی سفارشات کے پہلے دو نکات میں کمیشن نے حکومت پر عیسائیوں کے اس مطالبے کو تسلیم کرنے کے لیے زور دیا کہ "ہائی کورٹ کے ایک جج سے ان واقعات کی تحقیقات کرائی جائے۔۔۔؛ اور قصوروار افراد کو ایسی سزا دی جائے جو مستقبل میں ایسے عناصر کو اس قسم کے جرم سے باز رکھ سکے۔ دوم، ٹبہ اور شانتی نگر کی آبادیوں کی مکمل بحالی کے سلسلے میں حقیقی اور بڑے پیمانے کی کوششیں کی جانی چاہییں۔" امید کی جاتی ہے کہ نئی منتخب ہونے والی وفاقی اور صوبۂ پنجاب کی حکومتیں ان سفارشات پر وقت ضائع کیے بغیر عمل کریں گی۔

ہیومن رائٹس کمیشن نے رپورٹ دی کہ اس کے ارکان غارت گری کے اس مقام سے واپس آتے ہوئے "صرف ان باتوں کی وجہ سے مضطرب نہیں تھے جو وہاں ان کے دیکھنے اور سننے میں آئی تھیں۔ انھیں یہ بھی تشویش تھی کہ یہ واقعات مستقبل کے لیے نہایت خطرناک امکانات کے حامل ہیں۔" ان افراد کو جو آج اقتدار پر فائز ہیں، اور ان کو بھی جو اقتدار پر فائز ہونے کے خواہشمند ہیں، ان "امکانات" پر غور کرنا چاہیے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس المیے کی ابتدا مذہب کی توہین کے ایک جھوٹے الزام سے ہوئی۔ دعویٰ کیا گیا کہ ۵ فروری کو قرآن کے چند جلے ہوئے اوراق شانتی نگر سے دو کلومیٹر دور سڑک کے کنارے بنی ہوئی ایک چھوٹی مسجد کے پاس سے ملے ہیں، اور ان پر ایک عیسائی کا نام لکھا ہوا ہے، جو وہی شخص ہے جس نے ان اوراق کو جلایا ہے۔ علاقے کی تمام مسجدوں نے اپنے لاؤڈاسپیکروں سے یہ دعویٰ نشر کرنا اور ایمان والوں کو جہاد پر اکسانا شروع کر دیا۔ ہیومن رائٹس کمیشن کی رپورٹ کہتی ہے کہ "یہ سلسلہ کئی گھنٹے جاری رہا جس کے دوران لوگ آس پاس کے علاقوں سے آ آ کر جمع ہونے لگے۔ اچھی طرح بھڑکائے ہوئے اس ہجوم نے خانیوال کے کئی گرجاگھروں پر حملہ کیا۔

حملوں کا سلسلہ اگلے روز صبح (۶ فروری کو) دوبارہ شروع کیا گیا اور ہجوم نے پہلے ٹبہ اور پھر شانتی نگر کی بڑی آبادی کا رُخ کیا۔ بادی النظر میں یہ ایک منظم کارروائی تھی۔ پہلے لوگوں کو گھروں سے باہر نکلنے کا حکم دیا جاتا، پھر لوٹ مار کی جاتی، مویشی نکال لیے جاتے اور مکان کو آگ لگا دی جاتی۔ اسی صبح خانیوال کے بڑے سینٹ جوزف چرچ اور اس سے ملحق بچوں کے ہاسٹل کو تباہ کیا گیا۔ "بچوں کی کتابوں کے اوراق،" کمیشن کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے، "جن میں اسکول کے نصاب میں شامل اسلامی دینیات کے متن بھی شامل تھے، ہاسٹل کے سامنے زمین پر بکھرے پڑے تھے۔"

اس واقعے سے حاصل ہونے والا سبق بالکل واضح ہے: توہینِ مذہب کا قانون (Blasphemy Law) نہ صرف انصاف کے بنیادی اصولوں کی نفی کرتا ہے بلکہ قانون کے ادارے کو فرقہ وارانہ جبروتشدد اور انفرادی یا اجتماعی انتقام کے آلۂ کار میں تبدیل کر دیتا ہے۔ مشتعل ہجوم کے ہاتھوں ہلاک ہو جانے والے ایک بے قصور حافظِ قرآن سے لے کر ملک کے معروف ترین سماجی انجینیئر ڈاکٹر اختر حمید

Scanned with CamScanner

خاص تک اس قانون کا نشانہ بننے والوں میں شامل ہیں جنھیں توہینِ مذہب کے ایک بے بنیاد الزام پر برسوں تک بد سلوکی، قتل کی دھمکیوں اور مقدمے بازی کا نشانہ بنایا گیا۔ ہیومن رائٹس کمیشن کے اس موقف سے اتفاق کیے بغیر چارہ نہیں کہ "توہینِ مذہب کے قانون میں مذہبی جنون اور عوامی شر پسندی بھڑکانے کی جو صلاحیت ہے وہ ایک بار پھر پوری طرح ثابت ہوئی — اور اس کی ادا کردہ قیمت میں ہزاروں انسانوں کو پہنچنے والی تکلیف اور قوم کے امیج کو پہنچنے والا نقصان دونوں شامل ہیں۔" اس قانون کو منسوخ کیا جانا چاہیے، اور یہ اس کے لیے بالکل موزوں وقت ہے۔

شانتی نگر کے المیے سے سامنے آنے والا دوسرا نہایت پریشان کن نکتہ ریاست کی مشینری کی مجموعی ناکامی ہے۔ فسادات کو منظم کرنے میں خانیوال پولیس کے اہلکاروں کے ملوث ہونے کے قوی شبہات موجود ہیں۔ شانتی نگر کے باشندوں نے یاد کیا کہ ۱۷ جنوری ۱۹۹۷ کو خانیوال صدر تھانے کے انچارج عزیز الرحمن ڈوگر نے شانتی نگر کے ایک باشندے ایوب کے گھر پر اس الزام کے تحت چھاپا مارا کہ وہ جوے کا اڈا چلاتا ہے۔ اسے وہاں کچھ نہیں ملا، اور غالباً اپنی ناکامی پر برافروختہ ہو کر اس نے گھر میں رکھی ہوئی ایک بائبل کو ٹھوکر ماری۔ گھر کے افراد نے اس کے خلاف رپورٹ درج کرائی جس کے نتیجے میں اسے معطل کر دیا گیا، لیکن وہ آزاد پھرتا رہا اور اس نے شانتی نگر والوں کو سبق سکھانے کی قسم کھائی۔ بستی والوں کے خلاف توہینِ مذہب کا الزام جس طرح ایک موٹر سائیکل سوار نے علاقے میں پھیلایا، اور پھر جس طرح اس الزام کو مسجد کے لاؤڈ اسپیکروں سے نشر کرنا شروع کیا گیا، اس سے شرپسندانہ منصوبہ بندی کا شبہ ہوتا ہے، اگرچہ اس کی حقیقت محض عدالتی تحقیقات ہی سے متعین کی جا سکتی ہے۔

خانیوال ۵ فروری ۱۹۹۷ کو فرقہ وارانہ فسادات کے لیے ایک نہایت موزوں مقام رہا ہوگا۔ خانیوال ہی کا ایک محلہ، کبیروالا، پاکستان کے پُرتشدد ترین "اسلامی" گروہوں میں سے ایک یعنی انجمن سپاہ صحابہ کی جائے پیدائش ہے۔ ضیاء الاسلام فاروقی نامی ایک مولانا نے اس حلقے سے رکن قومی اسمبلی کے انتخاب کے لیے کاغذات نامزدگی بھی داخل کیے تھے۔ علاقے میں مسلم لیگ کی مقبولیت کی لہر کا رُخ موڑ پانے سے پہلے ہی بدقسمتی سے مولانا لاہور سیشن کورٹ کی عمارت کے باہر ہونے والے ایک بم دھماکے میں ہلاک ہو گئے۔ مزید ستم ظریفی یہ ہوئی کہ پارٹی کے ایک اور رہنما اعظم طارق انتخابات میں شکست کھا گئے۔ تاہم، انھیں دوبارہ گنتی کے بعد کامیاب قرار دے دیا گیا۔ ایمان والوں کا طیش اونچی سطح پر تھا کہ عیسائیوں کو نشانہ بنانے کا یہ موقع پیدا ہوا۔

خانیوال کے سرکاری حکام اس واقعات اور ان سے پیدا ہونے والی کشیدگی سے ضرور واقف رہے ہوں گے — یا کم سے کم انھیں واقف ہونا چاہیے تھا۔ انھوں نے تشدد کی راہ روکنے کی، اور جب وہ پھوٹ پڑا تو اسے قابو میں لانے کی، ذرا بھی کوشش نہ کی۔ جس وقت ڈپٹی کمشنر اور سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ہیڈکوارٹر سے چند میل کے فاصلے پر لاؤڈ اسپیکر لوگوں کو تشدد پر آمادہ کر رہے تھے، وہ بیٹھے جماہیاں لیتے رہے۔ جب پولیس موقعے پر پہنچی تو تشدد کی کارروائی جاری تھی۔ کچھ پولیس والے اس

Scanned with CamScanner

کارروائی میں شامل ہو گئے، کچھ تماشا دیکھنے لگے اور باقی وہاں سے بھاگ گئے۔ ڈپٹی کمشنر کے ہیڈکوارٹر سے چند گز کے فاصلے پر واقع سینٹ جوزف چرچ اور اس سے ملحق بچوں کے ہاسٹل پر حملے کے دوران بھی ضلعی انتظامیہ مفلوج رہی۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہیومن رائٹس کمیشن کی ٹیم اس المیے کی بابت ڈپٹی کمشنر کی تشویش اور اس کا شکار ہونے والوں کے لیے اس کی ہمدردی سے بہت متاثر ہوئی" اور رپورٹ میں لوگوں کو "امداد اور دلاسا دینے پر ضلعی انتظامیہ کی تعریف کی گئی اور اس "متاثر کن" امداد کے سلسلے میں بھی جو ابھی راہ میں ہے۔ اس بطلے ڈپٹی کمشنر کے مفلوج رویے کی توجیہ کمیشن کی رپورٹ میں اس طرح کی گئی: سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس عمرے پر گیا ہوا تھا، اور ڈپٹی کمشنر نے "اس بات کو بہت زور دے کر بیان کیا کہ اس کے پیش رو کو اس کے دفتر کے سامنے ایک مذہبی جنونی نے دن دہاڑے ہلاک کر دیا تھا۔" کیا ملک کا انتظام چلانے والے افراد ان علامات سے بے خبر ہیں جن کا یہ حقائق اعلان کر رہے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر وہ خاموش کیوں ہیں؟

اس المیے سے ظاہر ہونے والا تیسرا، اور بہت اہم، نکتہ تبدیلی کے اس پُرخطر عمل سے تعلق رکھتا ہے جس سے یہ ملک اور معاشرہ گزر رہا ہے۔ شانتی نگر میں ۵ اور ۶ فروری کو کی جانے والی دہشت ناک کارروائی میں نہ تو کوئی روایتی بات تھی اور نہ حقیقی معنوں میں جدید۔ پندرہ ہزار افراد پر مشتمل اس بستی کو ۱۹۱۲ میں سالویشن آرمی نامی سماجی بہبود کی تنظیم نے بسایا تھا۔ اس کے قریب ہی ٹبہ نامی آبادی کوئی دس برس پہلے سات مرلہ اسکیم کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی۔ اس تمام عرصے میں عیسائی اکثریت والی یہ آبادیاں اپنے مسلمان پڑوسیوں کے ساتھ امن سے رہتی آئی ہیں۔ فرقہ وارانہ کشیدگی کا ان کے ماضی سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ لیکن حالیہ عشروں میں بازار کی طاقتوں نے معاشرے میں بہت تیزرفتاری سے اپنی جگہ بنائی ہے جس سے مقامی معیشتوں کا انحصار باہمی خاصا کم ہو گیا ہے۔ علاقے میں معاشی مسابقت بڑھ گئی ہے۔ نئی رقابتوں اور کامیابی کی تازہ تر اشتہاؤں نے جنم لیا ہے۔ پرانے طور طریقوں کا زور ٹوٹ چلا ہے، لیکن ان کی جگہ نئی روایتیں مستحکم نہیں ہو پائی ہیں۔

تیزرفتار تبدیلیوں کے اس ماحول میں لوگوں کو ایک دانش مند قیادت، منصفانہ اور مضبوط انتظامیہ، قانون کی یقینی حکمرانی اور شراکت اور خوداختیاری کا احساس درکار ہوتا ہے۔ جب یہ چیزیں غیر موجود ہوں تو لوگ فرقہ پرست نظریہ بازوں کے پھندے میں آ جاتے ہیں جو آبادی کے مختلف حصوں کے درمیان فرق پر زور دیتے اور عقیدے کو نفرت اور خوف کے نظریے کے طور پر فروخت کرتے ہیں۔ تغیر کے ایسے زمانے میں جب سیاست کا زور ہو، روشن خیال قوانین کا نفاذ نہایت ضروری اور منصفانہ نظام کا قیام بقا اور ترقی کے لیے لازمی ہے۔

اقبال احمد

روزنامہ "ڈان"، کراچی

(۱۸ فروری ۱۹۹۷)

***

شانتی نگر کے زخم

ضلع خانیوال میں ہونے والے فسادات کے پانچ روز بعد جب ہماری گاڑی شانتی نگر گاؤں میں داخل ہو رہی تھی تو ایک فوجی جوان نے ہمیں روکا اور ہماری شناخت کرنے کے بعد ہی ہمیں گاؤں میں داخل ہونے دیا۔ ڈرائیور، جو ۶ فروری کے فسادات کے بعد سے دو بار وہاں آ چکا تھا، بولا کہ آنے جانے والوں کی شناخت کی پڑتال اس واقعے کے بعد سے فوجی جوانوں کا معمول بن گئی ہے۔ فوج کو ہنگاموں پر قابو پانے کے لیے طلب کیا گیا تھا اور وہی فسادات کی تحقیقات بھی کر رہی ہے۔

بڑے پیمانے پر ہونے والی تباہی کے آثار دور ہی سے دکھائی دینے لگے تھے۔ گاؤں میں پہنچ کر ہم نے مردوں اور عورتوں کو اپنے جلے ہوئے مکانوں اور سامان کے ملبے پر روتے ہوئے دیکھا، جبکہ امدادی رضاکار انہیں نقصان کا تخمینہ لگانے میں مدد دے رہے تھے۔ جن چیزوں کی تعداد میں مکان اور دکانیں، فرنیچر اور ساز و سامان سمیت، جل کر خاک ہو چکی ہیں۔ زیادہ قیمتی چیزیں، مثلاً مویشی، زیور اور الیکٹرانک کی اشیا، فسادیوں نے لوٹ لیں۔ گرجا گھروں اور اسکولوں کو بھی حملہ کر کے تباہ کیا گیا۔ فساد میں استعمال کیے جانے والے پٹرول بموں، دستی بموں اور نامعلوم دھماکا خیز مادوں کی پیدا کردہ حدت سے بیشتر مکانوں کی کنکریٹ کی چھتیں بیٹھ گئیں، دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں اور فولادی گارڈر اور چھت کے پنکھے مڑ گئے یا پگھل گئے۔

شانتی نگر، جو خانیوال سے بارہ کلو میٹر مشرق میں واقع ہے، ضلعے کے آٹھ عیسائی گاؤوں میں سے ایک ہے۔ عیسائیوں کو یہاں ۱۹۰۶ میں انگریزوں نے پنجاب کے نہری نظام کی تعمیر کے بعد اپنی آبادکاری کی پالیسی کے تحت بسایا تھا۔ گاؤں میں تقریباً پندرہ ہزار عیسائی رہتے ہیں اور مسلمانوں کے کوئی بیس پچیس گھر ہیں۔ زیادہ تر عیسائی زمینوں کے مالک اور کاشتکار ہیں اور خاصے خوش حال سمجھے جاتے ہیں۔ نوجوان نسل کے بہت سے لوگ صوبے کے دوسرے حصوں میں کام کرتے ہیں اور بعض سرکاری ملازمت میں ہیں۔

"ہم معاشی طور پر برباد ہو گئے۔ پچھلے پچاس برس میں ہم نے جو کچھ جمع کیا تھا، سب تباہ کر دیا گیا،" گاؤں کے ایک باسی دنیال بھٹی نے کہا۔ گاؤں کے رہنے والوں کے ابتدائی اندازوں کے مطابق متاثرہ خاندانوں کا نقصان پانچ ہزار سے لے کر پندرہ لاکھ تک کا ہوا ہے۔

شانتی نگر ــــ یعنی امن کے مقام ــــ اور خانیوال میں فساد کی شروعات ۵ فروری کی شام کو ہوئی جب موٹر سائیکلوں پر اور گاڑیوں میں سوار کچھ افراد، جن کی شناخت نہیں ہو سکی، علاقے میں یہ افواہ پھیلاتے پھرے کہ شانتی نگر کے ایک عیسائی باشندے راج مسیح عرف بابا رجی نے قرآن کی بے حرمتی کی ہے۔ انہوں نے الزام لگایا کہ قرآن کے پھٹے ہوئے اوراق، جن پر توہین آمیز کلمات درج ہیں، شانتی

نگر سے ایک کلومیٹر دور واقع ایک چھوٹی سی مسجد میں ایک ورق عبدالرحمن ڈوگر کو ملے ہیں۔ پولیس کو ڈوگر کی شکایت پر ایف آئی آر درج کرنے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔

خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ خانیوال شہر اور اس کے گردونواح کی مسجدوں سے کئی بار اعلان کیے گئے جن میں مسلمانوں کو اکٹھا ہو کر شانتی نگر اور دوسری عیسائی آبادیوں پر ہلہ بولنے اور مسجد توہین کا انتقام لینے کی ترغیب دی گئی۔ مسجدوں سے عیسائیوں کے خلاف اعلانات کرنے والوں یا موٹرسائیکلوں پر اور کاروں میں سوار ہو کر یہ افواہ پھیلانے والوں کو پہچانا نہیں جا سکا۔

خانیوال کے اسسٹنٹ کمشنر محمد اسلم ملک کا کہنا ہے کہ یہ تمام واقعہ نہایت منظم انداز میں پیش آیا۔ منصوبہ تیار کرنے والوں نے رمضان کی ستائیسویں شب کا انتخاب کیا جب مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ ہزاروں افراد کو مشتعل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ سب بالکل اچانک ہوا۔ متعدد موٹرسائیکل سوار ایک دم شہر اور اس کے ارد گرد کے دیہات میں نمودار ہو گئے اور یہ خبر پھیلانے اور مسلمانوں کو مبینہ بے حرمتی اور توہین کا انتقام لینے اور عیسائیوں پر حملہ کرنے کے لیے اکسانے لگے۔ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں انھوں نے بیس ہزار مشتعل اور مسلح افراد کا ہجوم اکٹھا کر لیا۔

جس چھوٹی سی مسجد کے پاس مبینہ طور پر قرآن کے پھٹے ہوئے اوراق ملے تھے، وہ اب مقفل اور ویران ہے۔ یہاں تک کہ اس کی قریبی دکانیں بھی واقعے کے بعد سے اب تک بند ہیں اور آس پاس رہنے والے لوگ اس موضوع پر بات کرنے سے کتراتے ہیں۔ جب یہ سب کچھ پیش آیا، میں یہاں موجود نہیں تھا، وہاں کے ایک مسلمان باشندے نے بتایا۔ دکان دار پولیس کی تفتیش کے خوف سے دکانیں بند کیے بیٹھے ہیں، پاس ہی رہنے والا ایک لڑکا بولا۔ اس بات کی تصدیق نہیں ہو سکی کہ عبدالرحمن ڈوگر، جس نے پولیس کے پاس رپورٹ درج کرائی تھی، گرفتار ہوا ہے یا نہیں۔

ضلعی انتظامیہ اور پولیس اہلکاروں سے کی جانے والی بات چیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابا راجی پر لگایا جانے والا الزام قطعی بے بنیاد تھا، اور یہ تاثر بہت قوی ہے کہ پورے واقعے کی منصوبہ بندی پولیس والوں نے کی جو اب شعبے میں معطل ہیں اور فوجی اہلکاروں اور ملتان کی ضلعی انتظامیہ کے نمائندوں پر مشتمل تفتیشی ٹیم نے انھیں گرفتار کر رکھا ہے۔

شانتی نگر کے ساٹھ سالہ ان پڑھ باشندے بابا راجی کے مکان پر ۱۳ جنوری کی رات کو پولیس اہلکاروں — اے ایس آئی صادق محمد اور تین کانسٹیبلوں محمد رمضان، نور نبی اور خادم — نے جوئے کا اڈا چلانے کے الزام میں چھاپہ مارا۔ بابا راجی نے، جو تانگا چلاتا ہے، اس الزام کی تردید کی، لیکن چھاپہ مارنے والوں نے اس کے مکان کی تلاشی لینے پر اصرار کیا۔ تلاشی کے دوران پولیس والوں نے مبینہ طور پر بائبل کی بے حرمتی کی اور بابا راجی کو پکڑ کر تھانے لے گئے۔

گاؤں کے کچھ باشندوں نے خانیوال کے ڈی ایس پی حبیب محمد گھمن اور ایس ایچ او عزیز الرحمن ڈوگر سے مل کر بابا راجی کی رہائی اور پولیس اہلکاروں کے خلاف بائبل کی بے حرمتی کی شکایت درج کرنے کا

مطالبہ کیا۔ بالآخر جی کو رہا کر دیا گیا لیکن پولیس والوں کے خلاف مقدمہ درج۔ کیا گیا جس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے عیسائی برادری نے ۱۰ جنوری کو ایک جلوس نکالا۔ اس سے مجبور ہو کر پولیس کے اعلیٰ حکام نے واقعے میں ملوث پولیس اہلکاروں کو معطل اور گرفتار کیا۔ لیکن، کہا جاتا ہے، ان کے ساتھ مجرموں والا سلوک نہیں کیا گیا اور ہمدردی سے تھانہ جات میں ڈیوٹی ادا کرنے کے لیے طلب بھی کیا گیا۔ عیسائیوں کا الزام ہے کہ پولیس والوں کو ایک سول جج نے ضمانت پر رہا کر دیا اور شانتی نگر کے رہنے والوں کے خلاف سازش تیار کرتے رہے اور مسلمانوں کو عیسائیوں کے خلاف ہنگامے میں مصروف ہو گئے۔

خانیوال کے متعدد مسلمان باشندے بھی اس خدشے کا اظہار کرتے ہیں کہ اس واقعے میں پولیس ملوث تھی۔ ہم یہاں برسوں سے پُرامن طور پر رہ رہے تھے۔ کبھی بھی ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، اور پھر اچانک ہمیں عیسائیوں کے خلاف زہر سے بھرے اشتہار چسپاں دکھائی دیا۔ اس الزام پر یقین کرنا ناممکن ہے جس کے نتیجے میں فسادات شروع ہوئے۔ یہ پوری سازش پولیس والوں کی تھی جو اپنی معطلی کا بدلہ لینا چاہتے تھے، ایک ٹیکسی ڈرائیور کرم الٰہی نے کہا۔

خانیوال میں چند عیسائی پادریوں کی جان ان کے مسلمان دوستوں نے بچائی۔ کچھ مسلمان مذہبی رہنماؤں نے، جن کو عام لوگوں کو ہنگامے کے لیے استعمال کیا گیا تھا، اس واقعے کی مذمت کی اور قرآن کی توہین کے الزام کو بالکل غلط قرار دیا۔ بعض مقامات پر مسلمان مذہبی رہنماؤں نے صورت حال کو معمول پر لانے میں مدد دی اور لوگوں کو سمجھایا کہ وہ عیسائی مخالف اشتعال میں آ کر ہوش نہ کھو بیٹھیں، بشیر حبیب نے کہا۔ بعض لوگوں کو شبہ ہے کہ فسادات کرانے والوں نے حرکت الانصار نامی مذہبی تنظیم سے بھی مدد مانگی تھی جو بھارتی مقبوضہ کشمیر کی آزادی کے لیے کام کر رہی ہے اور علاقے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی کوشش کر رہی ہے۔

سہ پہر کے ۳ بجے جب ہم نے عیسائیوں کے خلاف اعلانات سنے اور ہمیں معلوم ہوا کہ آس پاس کے گاؤں سے ہزاروں افراد شانتی نگر کے عیسائی شہریوں پر حملہ کرنے کے لیے جمع ہو رہے ہیں تو ہم نے فوری طور پر ضلعی انتظامیہ سے رابطہ قائم کیا اور ان سے درخواست کی کہ ہمارے گرجا گھروں اور مکانوں کی حفاظت کا بندوبست کریں۔ ریذیڈنٹ ڈپٹی کمشنر (جنرل) نے ہمیں یقین دلایا کہ ضلعی انتظامیہ ہمارے خلاف مسلمانوں کے منصوبے کو ناکام بنانے کا انتظام کر رہی ہے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ ملتان سے فوج اور اضافی پولیس ریزرو دستے طلب کر لیے گئے ہیں، شاہدہ روڈ پر واقع سینٹ جوزف کیتھولک چرچ سے ملحق سکول کے ایک استاد مسعود فضل نے بتایا۔

انتظامیہ سے ہماری بات چیت کے چند گھنٹے بعد ہم نے دو سو افراد کے ایک ہجوم کو گرجا گھر کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ وہ گرجا گھر کے اندر گھس آئے اور توڑ پھوڑ کرنے لگے۔ وہ پادری کے گھر اور سکول کی عمارت میں بھی داخل ہو گئے اور پٹرول بم پھینک کر اور قالینوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔

ڈسپچر نے آگ پکڑ لی اور ہمیں جان بچا کر بھاگنا پڑا، فضل نے کہا۔ پولیس نے ہجوم کو روکنے یا ہماری حفاظت کرنے کے لیے کچھ نہ کیا۔ اُس رات ایسے ہی واقعات تین اور گرجا گھروں میں بھی پیش آئے۔

فضل نے یاد کیا کہ رات کے وقفے کے بعد گرجا گھر پر پولیس تعینات کر دی گئی تھی، لیکن مشتعل افراد اگلی صبح پھر واپس آئے تاکہ جو کچھ باقی رہ گیا تھا اُسے تباہ کر سکیں۔ اُس وقت اسکول کے ہاسٹل میں کوئی ڈیڑھ سو طلبا موجود تھے۔ جب ہجوم نے اسکول اور ہاسٹل کی عمارت کو آگ لگائی تو بڑے لڑکے کھڑکیوں سے کود گئے اور چھوٹے لڑکے پلنگوں کے نیچے چھپ گئے جنھیں فسادیوں کے جانے کے بعد وہاں سے نکالا گیا۔ پولیس ہجوم کے ہاتھوں گرجا گھر اور اسکول کی تباہی کا تماشا دیکھتی رہی، فضل نے بتایا۔

رات کے وقت شانتی نگر پر حملہ کرنے کی غرض سے جو ہجوم اکٹھا ہونا شروع ہوا تھا وہ کہا جاتا ہے کہ صبح تک بیس ہزار کی نفری تک پہنچ گیا اور یہ سب لوگ شانتی نگر سے ایک کلومیٹر باہر اکٹھے ہوئے۔ ڈی ایس پی سی آئی اے چودھری ریاض اور مجسٹریٹ چودھری اسلم کی قیادت میں پانچ سو کی نفری پر مشتمل پولیس پارٹی بھی صبح کے وقت وہاں پہنچ گئی۔ انھوں نے شانتی نگر کے رہنے والوں کو اطلاع دی کہ قرآن کی بے حرمتی پر مشتعل ہو کر ہزاروں لوگ جمع ہو گئے ہیں اور بستی پر حملہ کرنے والے ہیں۔

انھوں نے ہم سے کہا کہ کوئی فکر نہ کریں اور اگر خیریت چاہتے ہیں تو ان افراد کو پولیس کے حوالے کر دیں جنھوں نے پولیس والوں کے خلاف بائبل کی بے حرمتی کا مقدمہ درج کرایا تھا۔ مجسٹریٹ نے بتایا کہ اگر بستی والوں نے تعاون نہ کیا تو پولیس کے لیے تیس ہزار افراد کے اس جلوس کو روکنا ممکن نہیں ہوگا جو شانتی نگر کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے، شفیق صدی خان نے یاد کیا۔ ہم نے کہا کہ ہم کسی کو حوالے نہیں کریں گے کیوں کہ اس کا مطلب اُسے موت کے منہ میں بھیجنا ہوگا۔ اس کے باوجود کہا جاتا ہے، پولیس نے تین عمر رسیدہ افراد — ساٹھ سالہ چمن، ساٹھ سالہ سردار اور پینتالیس سالہ بشیر — کو اٹھا لیا جو اب تک لاپتا ہیں۔

بستی والوں نے بتایا کہ صبح نو بجے تک بڑی تعداد میں مسلح افراد شانتی نگر میں داخل ہو چکے تھے اور مختلف مقامات پر تعینات کیے گئے پولیس کے اہلکار ہٹا لیے گئے تھے۔ "پولیس نے فسادیوں کو روکنے کی کوئی کوشش نہ کی جنھوں نے پانی اور بجلی کی لائنیں کاٹ دیں، ہمارے گھروں میں گھس آئے، ہمارا اسباب لوٹا، مویشی کھول کر لے گئے، مردوں کو مارا، عورتوں کے ساتھ بدسلوکی اور بدتمیزی کی اور پٹرول بم اور ایک نامعلوم آتش گیر پاؤڈر چھڑک کر ہمارے مکانوں اور دکانوں کو آگ لگا دی، شفیق خان نے کہا۔

"میں اُس ہولناک صبح کو کبھی نہیں بھول سکتی، پندرہ سالہ عذرا روز نے کہا۔ "انھوں نے ہمیں بازوؤں سے پکڑ لیا اور زبردستی کلمہ پڑھوایا۔ انھوں نے دھمکیاں دیں کہ جس نے ان کا حکم نہیں مانا اسے

Scanned with CamScanner

جان سے مار دیا جائے گا۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کی پٹائی بھی کی۔

چاروں طرف عورتیں چیخ چلا رہی تھیں۔ بہت سے لوگوں نے اپنے گھروں سے نکل کر پہلے شانتی نگر کے ایک کونے میں اور پھر دوسرے کونے میں پناہ لینے کی کوشش کی، لیکن اس تمام جدوجہد کا پولیس پر کوئی اثر نہ ہوا اور انھوں نے کوئی اقدام نہ کیا، ۵۰ سالہ رحمت نے بتایا۔ رحمت کا بازو فسادیوں نے توڑ ڈالا۔ اطلاعات کے مطابق ۵۰ افراد زخمی ہوئے۔

پولیس والے فسادیوں کے آگے آگے چل رہے تھے اور فسادار کو روکنے کے بجائے انھیں اپنے مکان اور دکانیں خالی کرنے کا حکم دے رہے تھے، ۶۵ سالہ شریف بیگ نے کہا۔ شریف کا الزام ہے کہ کچھ پولیس والے فسادیوں کے ساتھ مل کر عیسائیوں کو مار بھی رہے تھے اور انھوں نے شانتی نگر کے ارد گرد کے علاقے میں تمام غریب گھروں اور پادریوں کے گھروں کو حملہ کر کے تباہ کرنے میں بھی حصہ لیا۔

ایک اور مشتعل ہجوم نے شانتی نگر سے متصل ایک ڈھنگ کے فاصلے پر واقع عیسائیوں کے تقریباً ۵۰۰ کچے گھروں پر مشتمل بستی ٹبہ کالونی پر حملہ کیا۔ پوری کالونی کو گرجا گھروں سمیت آگ لگا دی گئی۔ جب ہم نے انھیں آتے دیکھا تو ہم سب جان کے خوف سے بھاگ کر کھیتوں کی طرف آ گئے، سکول کی استانی میری روز نے بتایا۔ جب شام کے وقت ہم واپس آئے تو ہمارے گھروں کی ہر چیز یا تو لوٹی جا چکی تھی یا جل کر راکھ ہو چکی تھی۔

خانیوال کے اسسٹنٹ کمشنر نے پولیس کی بے عملی اور شانتی نگر و ٹبہ کالونی پر ہجوم کے حملے کے وقت کوئی اقدام نہ کرنے کے فیصلے کی مدافعت کی۔ اگر پولیس ہجوم کو روکنے کی کوشش کرتی تو اس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کی جان ضائع ہو سکتی تھی کیونکہ ہجوم میں شامل بہت سے افراد ہتھیار لیے ہوئے تھے۔ در حقیقت پولیس کی بے عملی سے بہت سے لوگوں کی جان بچی، اسسٹنٹ کمشنر نے کہا۔

اس نے دعویٰ کیا کہ انتظامیہ نے ان واقعات کو ہونے سے روکنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو اس کے بس میں تھا۔ ہم نے ملتان سے ریزرو پولیس کے دستے منگوائے، لیکن ہجوم اپنی کثیر تعداد اور اسلحہ اور گولا بارود کی وجہ سے بے قابو ہو گیا۔"

فسادی دوپہر کے آس پاس منتشر ہوئے۔ لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ دو گھنٹے سے کم وقت میں فسادیوں نے بستی کے ۵۰۰ سے زیادہ مکانوں، گرجا گھروں اور دکانوں کو جلا دیا تھا، اور ہمارے زیورات، ہماری بیٹیوں کے جہیز کا سامان، مویشی اور تمام قیمتی چیزیں لوٹ لی تھیں، اور جو کچھ وہ اپنے ساتھ نہ لے جا سکے تھے اسے تباہ کر دیا تھا، ساٹھ سالہ لیاقت ول نے بتایا۔

شانتی نگر کے رہنے والوں کا، جو لوگوں کو یہاں بچت دستہ سمجھتے ہیں، الزام ہے کہ پولیس نے موجودہ لوگوں کی آمد میں تاخیر کرنے کے لیے غلط اطلاعات دیں کہ بستی میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی ہے۔ بستی والوں نے بتایا کہ لوگوں کو جب یہ اندازہ ہوا کہ حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں تو انھوں نے ضلعی انتظامیہ کی جانب سے مداخلت کی۔ شانتی نگر کے باشندوں کا عام خیال ہے کہ انتظامیہ نے حالات کو

سنبھالنے میں سخت کوتاہی کا مظاہرہ کیا اور فسادیوں کو ان کے منصوبے پر بلا رکاوٹ عمل کرنے میں مدد دی۔

لیکن خانیوال کے اسسٹنٹ کمشنر محمد اسلم ملک نے اس الزام کی تردید کی "ہمیں اس واقعے سے پہلے کی رات کو جوں ہی اطلاع ملی کہ شانتی نگر کے نزدیک مشتعل ہجوم اکٹھا ہو رہا ہے، ہم نے فوراً فوج کو طلب کر لیا تھا۔ فوج ملتان سے صبح نو بجے پہنچی۔ گاؤں میں اس کی آمد میں تاخیر کا سبب یہ تھا کہ فوج کے ضوابط فوجی اہلکاروں کو ہجوم کے درمیان سے گزرنے کی اجازت نہیں دیتے، چنانچہ ہمیں پہلے گاؤں میں داخلے کا راستہ صاف کرنا پڑا جسے ہجوم نے گھیر رکھا تھا۔" اسلم ملک نے بتایا۔ اس بیان پر تبصرہ کرنے کے لیے کوئی فوجی اہلکار دستیاب نہ تھا۔

پولیس کا دعویٰ تھا کہ لوٹی ہوئی اشیا اب فوج کی مدد سے فسادیوں سے برآمد کی جا رہی ہیں۔ "ہم گاؤں گاؤں جا کر مسجدوں سے اعلان کرتے ہیں کہ لوگ شانتی نگر سے جو کچھ لائے ہوں وہ واپس کر دیں۔ فی الحال ہم ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہے ہیں تاکہ حالات مزید خراب نہ ہوں، لیکن ان کے خلاف یقیناً مقدمے درج کیے جائیں گے اور کارروائی ہوگی۔" ایک پولیس اہلکار نے کہا۔

شانتی نگر کے متاثرہ خاندانوں نے عیسائی رضاکار تنظیموں کے فراہم کیے ہوئے خیموں میں پناہ لے لی ہے اور یہ تنظیمیں ان کی مدد کرنے میں بہت سرگرم ہیں۔ لوگ حکومت کی بے حسی کی شکایت کرتے ہیں۔ "صدر، وزیراعظم، گورنر یا وزیر اعلیٰ کی جانب سے مذمت میں ایک لفظ تک نہیں کہا گیا۔ صرف صوبائی چیف سیکرٹری نے اس واقعے کے بعد شانتی نگر کا دورہ کیا۔" فریڈرک نے بتایا۔ فریڈرک کے مطابق سرکاری محکمے متاثرہ افراد کو ریلیف فراہم کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ "حکومت نے صرف ۲۰۰ خاندانوں میں پانچ ہزار روپے فی خاندان امداد تقسیم کی ہے۔" "محکمۂ صحت نے واقعے کے پانچ روز بعد طبی امداد کی پیش کش کی۔ تمام امداد عیسائی تنظیموں کی جانب سے آئی ہے۔" لیکن ایک مجسٹریٹ ناصر خان نے دعویٰ کیا مختلف سرکاری محکمے نقصان کا تخمینہ لگانے کے لیے بستی کا سروے کر رہے ہیں۔ ناصر خان نے کہا کہ حکومت نے تمام متاثرہ عمارتوں کی از سر نو تعمیر کا حکم دے دیا ہے اور متاثرہ خاندانوں کو معاوضہ دینے کا معاملہ محکمۂ مالیات میں آگے بڑھا ہے۔ مجسٹریٹ کا یہ بھی کہنا تھا کہ ۷ اور ۸ فروری کو حکومت کی طرف سے کھانا اور ایک درجن خیمے فراہم کیے گئے تھے، مگر بعد میں رضاکار تنظیموں کی جانب سے امداد آنی شروع ہو گئی اور ہماری امداد کی ضرورت نہ رہی۔"

ناصر جمال
روزنامہ "ڈان"، کراچی
(۱۳ فروری ۱۹۹۷)

Scanned with CamScanner

***

جہنم میں مکان

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملک ہمارے لیے نہیں بنایا گیا تھا۔ ہم اقلیت میں ہیں اور اقلیتوں کے ساتھ ہمیشہ زیادتی ہوتی ہے۔ ملک کا قانون صرف اکثریت کو تحفظ دیتا ہے، اقلیتوں کو نہیں۔ مجھے امید نہیں کہ حالات کبھی بہتر ہوں گے۔

کلیم، عمر ۱۴ سال۔ طالب علم، سینٹ جوزف چرچ اسکول، ساہیوال۔

میں نے پاکستان کے قیام کی تحریک کا ساتھ دیا تھا اور جب ہمارا ملک آزاد ہوا تو میں بڑا خوش ہوا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس ملک میں ایسے واقعات ہوں گے۔

چرن مسیح، عمر ۵۷ سال۔ شانتی نگر، ضلع ساہیوال۔

کلیم اور چرن دونوں کے لیے حالات اب پہلے سے بدتر ہو چکے ہیں۔ چرن، جس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ خرابی کہاں واقع ہوئی، کہتا ہے کہ وہ زندگی میں پہلی بار اپنے گاؤں شانتی نگر میں خود کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔ آزادی کے وقت اس نے لوگوں کے دل میں جس قدر جذبے کا جو خواب دیکھا تھا اور جس کے باعث اس میں آزادی کے لیے کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوا تھا، وہ خواب اب مٹی میں ملتا جا رہا ہے۔ ایسے واقعات تو ہم نے انگریز کے وقت میں بھی نہیں دیکھے۔ یہ ملک اس وقت کی لیجسلیٹو اسمبلی کے ایک عیسائی رکن کے ووٹ کی وجہ سے وجود میں آیا تھا، اور اب یہ ہمارے لیے روز بروز غیر محفوظ ہوتا جا رہا ہے۔

کمسن کلیم کے لیے حقیقت اس سے بھی کہیں زیادہ ہولناک ہے۔ کلیم کو راہ چلتے ہوئے دکانداروں اور دوسرے راہ گیروں سے جس قسم کے طنزیہ تبصرے سننے کو ملتے ہیں انھوں نے دسویں جماعت کے اس طالب علم کو اندر سے بالکل توڑ کر رکھ دیا ہے۔ بس میں سفر کرتے وقت اسے گردن میں صلیب پہننے کی وجہ سے ساتھی مسافروں کے جو جھڑکیاں اور دھکے سہنے پڑتے تھے، وہی اکثریتی فرقے کے دل میں اقلیت کے لیے ابلتی ہوئی نفرت ظاہر کرنے کو کافی تھے، لیکن ۵ فروری ۱۹۹۷ کو شانتی نگر میں پیش آنے والے واقعات اس نفرت کے بھڑک اٹھنے کے امکان کا بدترین مظاہرہ ثابت ہوئے۔

کلیم ساہیوال کے سینٹ جوزف چرچ اسکول کے ہاسٹل کے اسٹڈی ہال میں اپنے فائنل امتحان کی تیاری میں مشغول تھا کہ اس نے قریب کی مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر ایک عجیب و غریب اعلان سنا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ جہاد کا وقت آ پہنچا ہے۔ جو لوگ مجاہد بن کر ثواب کمانا چاہتے ہوں وہ باہر آ کر جمع ہو جائیں، اس نے بتایا۔ اس کے بعد اس نے کلہاڑوں، لاٹھیوں اور دوسرے ہتھیاروں سے لیس نوجوانوں کے ہجوم کو اسکول کے احاطے میں داخل ہو کر گرجا گھر پر حملہ کرتے دیکھا۔ بڑی عمر کے لڑکے پیچھے کی کھڑکیوں

Scanned with CamScanner

سے کود کر بھاگ گئے لیکن چھوٹے لڑکے کود نہ سکے اور پلنگوں کے نیچے چھپ گئے۔ جب ہجوم نے عمارت کو آگ لگائی تو ہمارے استادوں نے انھیں وہاں سے باہر نکالا۔ کلیم ۵ فروری کی رات کے دہشت ناک واقعات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

وہ آگ اب تک سرد نہیں ہوئی ہے۔ ایک ہفتے بعد جب کلیم گاؤں میں اپنی ماں سے مل کر واپس آرہا تھا، اس کی مڈبھیڑ نوجوان مولویوں کی ایک ٹولی سے ہوئی۔ انھوں نے ایسی باتیں کیں جو میرے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ انھوں نے کہا کہ عیسائیوں کو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اب انھیں گرجا گھر کی سی عمارت مل جائے گی۔

کلیم نے اپنے ہاسٹل واپس آ کر پہلا کام یہ کیا کہ دو پوسٹر تیار کیے۔ پہلا پوسٹر یہ تھا: کیا پاکستان میں عیسائی ہونا جرم ہے؟ ہاں! دوسرا یہ تھا: کیا ہمیں پاکستان میں تحفظ حاصل ہے؟ نہیں!

ورشا نتی نگر کی دیواروں پر آپ کو یہی تحریر دکھائی دے گی۔ جلا ہوا محلہ جسے فسادیوں نے ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا، ادھ جلی دری کتابیں، جھلسی ہوئی چھتیں ــــ اور ان سب سے بڑھ کر، دیواروں پر لکھے نعروں کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی نفرت۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں ہی اصل جنگ کا میدان تھا۔ اور گاؤں یہ جنگ ہار گیا ہے۔

جلی ہوئی چیزوں کے اس ڈھیر میں نوعمر امجد کی دستاویزات بھی تھیں جس کا ایف ایس سی کا نتیجہ ابھی حال ہی میں آیا تھا اور جو فوج میں بھرتی کی درخواست دینے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے اپنے رزلٹ کارڈ کی تو دوسری نقل مل جائے گی لیکن اصل سوال یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن سے اس واقعے کی دہشت ناک یادیں جھٹک کر اپنے ملک کے محافظوں میں شامل ہونے کی آرزو پوری کرنے کے قابل ہو سکے گا یا نہیں۔

خانیوال کے گرجا گھروں اور شانتی نگر کے مکانوں پر پرتشدد حملوں کے تکلیف دہ اثرات عیسائی برادری کو خصوصاً اور وہاں رہنے والے تمام باشندوں کو عموماً محسوس ہو رہے ہیں۔ یہ اب رہنے کے لیے محفوظ جگہ نہیں رہی۔ اب ہمارے ذہنوں پر خوف ہمیشہ چھایا رہے گا۔ ساٹھ سالہ چراغ مسیح کہتا ہے جو اب اپنے مکان کے صحن میں دن گزارنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ یہ مکان، وہ کہتا ہے، اب اسے اپنے مکان جیسا نہیں لگتا۔ چراغ کا نوجوان بیٹا ندیم اپنے احساسات کو زیادہ صاف گوئی سے بیان کرتا ہے۔ اب دشمنی کا بیج پڑ گیا ہے، اور جس کو بھی موقع ملے گا وہ حساب برابر کرنے کی کوشش کرے گا۔

اس شرمناک واقعے کے اثرات اس علاقے کی زندگی سے آسانی سے محو ہونے والے نہیں۔ حملے کے بعد سے کلیم کے اسکول میں ۱۵۰ میں سے صرف ۳۵ طلبا واپس آئے ہیں۔ خانیوال کے تمام گرجا گھروں اور عیسائیوں کے مکانوں پر پولیس یا فوج کا پہرا ہے۔ اور عیسائی نوجوانوں میں پایا جانے والا غصہ، جس میں ایک غیر دانش مند انتظامیہ اور ناعاقبت اندیش سیاست داں مزید اضافہ کر رہے ہیں، نہ صرف خانیوال بلکہ پورے ملک میں اقلیتی اور اکثریتی فرقوں کے پرامن بقائے باہمی کے سلسلے میں تباہ کن اثرات مرتب کر سکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

تاہم، وہاں کے مسلمان باشندوں کے ردعمل میں روشنی کی ایک کرن دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک نہایت افسوسناک واقعہ تھا اور مجھے اس کا سخت رنج ہے۔ ہم نے طویل عرصے سے ساتھ رہتے آئے ہیں اور کبھی اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ سب ہماری جانب موجود چند مفسدوں کی وجہ سے ہوا، خانیوال کے ایک مسلمان دکاندار نے کہا۔ یہ وقت ہے کہ اکثریتی فرقے کے دوسرے افراد بھی کشیدگی کو کم کرنے کے سلسلے میں اپنی ذمے داری محسوس کریں کیونکہ زیادتی کا شکار ہونے والی برادری کے بعض افراد کے ذہنوں میں دوسرے درجے کا شہری ہونے کا شدید احساس جڑ پکڑنے لگا ہے۔

پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کی صورت حال کبھی بہت خوشگوار نہیں رہی، لیکن شانتی نگر میں جس وسیع پیمانے پر تباہی ہوئی اور اس نے جس قسم کا ردعمل پیدا کیا اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ بہت ہو چکا۔ اب ہمارے صبر کا مزید امتحان نہیں لیا جانا چاہیے۔ یہ ملک ہمارا بھی ہے، ہم نے بھی اسے وجود میں لانے کی کوششوں میں حصہ لیا تھا، اور اس ملک نے ہمیں کیا دیا ہے؟ جنگ کے دنوں میں ہمیں جاسوس کہا جاتا ہے اور امن کے دنوں میں چوہڑے جیسے خطابات دیے جاتے ہیں۔ کیا ہم اسی سلوک کے مستحق ہیں؟ یہ جی ڈینئر کا سوال ہے جو تبلیغی رہنما کے طور پر اپنی سیاسی سرگرمیوں سے دستبردار ہو چکا تھا لیکن شانتی نگر کے واقعے نے اسے اپنی خاموشی ترک کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

جی ڈینئر کی طرح کچھ دوسرے عیسائی رہنما بھی شانتی نگر کے رہنے والوں کے جذبات کی تسکین کرنے میں مصروف ہیں — اور ان میں سے بعض کے اپنے ذاتی مفادات ہیں — جہاں مزید تشدد کے لیے فضا خاصی سازگار دکھائی دیتی ہے۔ شانتی نگر کے واقعے پر ہونے والا بے مثال احتجاج، جس میں کراچی میں ایک شخص کی جان گئی، بظاہر عیسائی برادری کے اس غصے کا اظہار ہے جو بہت عرصے سے اندر ہی اندر بڑھ رہا تھا۔

سیکڑوں پولیس والوں کی موجودگی میں جس آسانی کے ساتھ شانتی نگر کے امن کو تہ و بالا کر دیا گیا اس نے علاقے کے پورے سماجی ڈھانچے کو ہلا کر رکھ دیا ہے، لیکن اس نے پورے ملک کو اس بات پر غور کرنے کا موقع بھی دیا ہے کہ ہم نے اپنی آزادی کے پچاس برسوں میں کس طرح کا معاشرہ پیدا کیا ہے۔ شانتی نگر میں بھڑکنے والی آگ نفرت کی اس روایت کا حصہ ہے جو اس کے رواج کے پہلو بہ پہلو ہمیشہ موجود رہی ہے اور جسے اب تک چیلنج نہیں کیا گیا۔

مظہر زیدی

روزنامہ "دی نیوز" کراچی

(۲۱ فروری ۱۹۹۷)

کراچی کی کہانی (۱)

ناوٗں مل سوت چند — جان برینٹن — کیول رام رتن مل ملکانی — پیر علی محمد راشدی
گگیندر ناتھ گپتا — لوک رام ڈوڈیجا — سہراب کٹرک — فیروز احمد
گوپال داس کھوسلا — سوہن کلپنا — شیخ پیاز — سوبھوگیانچندانی — کیول موٹوانی
عاتم علوی — حسن حبیب — اے کے بروہی — انوار شیخ
میر امداد علی — عبدالحمید شیخ — حسن منظر — اسد محمد خاں
ٹیگرڈ کابلے — انیتا غلام علی — عارف حسن

۳۱۵ صفحات، کراچی کے مختلف ادوار کے ۱۲ نقشے
مجلد، قیمت: ۱۵۰ روپے

کراچی کی کہانی (۲)

فہمیدہ ریاض — اختر حمید خاں — آصف فرخی
محمد حنیف — زینت حسام — جیکس انتھونی — شریف سور
لیاقت منور — بیکسٹر جشی — نسرین اسٹیفن — آصف شہباز
محبوب جان — تسنیم صدیقی — کینتھ فرنانڈیز
یان فانڈر لنڈن — اکبر زیدی — مارک ٹلی — عارف حسن

۳۰۸ صفحات، کراچی کے بارے میں اہم اعداد و شمار، کتابیات
مجلد، قیمت: ۱۵۰ روپے

قلمکار اور قاری کے درمیان ایک پل

سہ ماہی

نیا ورق

مدیر: ساجد رشید

36/38, Alooparoo Bldg , 4th Floor, Room 25,
Umer Khadi Cross Lane, Mumbai 9

ادب اور فنونِ لطیفہ کا ترجمان

سہ ماہی

ذہنِ جدید

مرتب: زبیر رضوی

پوسٹ بکس ۷۰۳۲، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اردو ادب کا شش ماہی انتخاب

سوغات

مدیر: محمود ایاز

۸۴، تھرڈ مین، سیکنڈ کراس، ڈیفنس کالونی، اندرانگر، بنگلور ۵۶۰۰۳۸

ماہنامہ

شب خون

ترتیب و تہذیب: شمس الرحمن فاروقی

پوسٹ بکس ۱۳، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

سہ ماہی

جامعہ

ترتیب: شمیم حنفی، سہیل احمد فاروقی

ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

Scanned with CamScanner

سید محمد اشرف

نمبردار کا نیلا

۱

ہوا بالکل خاموش تھی اور ارہر کے اس لمبے چوڑے کھیت کو گھیرے میں لیے پچاس ساٹھ آدمیوں کی موجودگی کے باوجود غضب کا سناٹا تھا۔ پاگل نیلا اسی کھیت میں کسی جگہ موجود تھا۔ لاٹھیاں، ڈنڈے اور سانٹھیں تھامے وہ سارے آدمی پنجوں کے بل چل رہے تھے اور پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے۔ اگر کہیں فصل میں سے نمودار ہو کر اپنے نکیلے سینگ پر رکھ کر ریلتا ہو، پٹخنیاں دیتا ہوا، کھروں سے کھوندتا ہوا لہولہان کرتا ہوا وہ بھاگے تو کیا ہوگا ـــــ یہی سوچ ہر آدمی کے کانوں میں دھڑکن بن کر دھمک کر رہی تھی۔

اچانک ہوا چلی، ارہر کے پودوں کی شاخیں آپس میں ٹکرا کر بجیں اور ہر آدمی کو وہ آواز نیلے کی بھگدڑ کی طرح محسوس ہوئی، اور ہر آدمی کے منہ سے ڈری ڈری سی چیخ نکل پڑی۔ جب کسی کے پاس بھی پودوں کو چیرتا ہوا نیلا نہیں نکلا تو سب کی جان میں جان آئی۔ طے یہ ہوا تھا کہ سب کے سب گھیرابندی اس طرح کریں گے کہ ایک آدمی سے دوسرے آدمی کا فاصلہ ایک لاٹھی کی لمبائی سے زیادہ نہ ہو، تاکہ اگر نیلا اچانک اندر سے حملہ کرے تو ہر آدمی کے پاس ایک لاٹھی کے فاصلے پر کم از کم دو بچانے والے موجود ہوں۔ دائرے میں چلتے چلتے اگر ایک دوسرے کے درمیان فاصلہ زیادہ ہو جاتا تو دل دھڑکنے لگتا اور فوراً رفتار کچھ تیز کرکے یا دھیمی کرکے فاصلہ ایک لاٹھی کے برابر

کر لیتے، جیسے عید کی نماز میں کن انکھیوں سے تکبیریں درست کی جاتی ہیں۔ گرمی اور خوف کے مارے سب کے ہاتھ لاٹھیوں پر پسیجنے لگے تھے۔ نتھو چچا نے کھوج دیکھ کر بتایا تھا کہ کھیت میں جانے کے کھوج تو ہیں، باہر نکلنے کے نہیں۔ یعنی نیلا یقیناً کھیت کے اندر ہے۔ نیلا یا تو بیٹھا تھا یا ساکت کھڑا تھا۔ لیکن وہ اپنی دُم کو اتنی دیر تک بے حرکت نہیں رکھ سکتا۔ دُم ہلتی تو کسی ارہر کے پودے سے ضرور ٹکراتی۔ ٹکراتی تو آواز نہ ہوتی؟ لیکن کھیت کے اندر کوئی آواز نہیں تھی۔ اس کا مطلب، وہ کھیت کے اندر ایک ایسا محفوظ گوشہ تلاش کر کے بیٹھا ہے جہاں فصل ماری گئی ہے اور پودے برائے نام ہیں۔ کھیت میں فصل کہاں کہاں ماری گئی ہے، یہ بات نمبردار اودل سنگھ اور ان کے نوکروں کو معلوم تھی۔ لیکن وہ کسی بھی سوال کا صحیح، براہ راست اور فطری جواب نہیں دے رہے تھے۔ وہ صحیح جواب اس لیے بھی نہیں دے رہے تھے کہ وہ اس مہم میں براہ راست فریق بن کر سامنے آنا نہیں چاہ رہے تھے۔ بستی کی آبادی کے دباؤ میں وہ بمشکل اس بات پر راضی ہوئے تھے کہ ہانکا کر کے نیلا نکال کر اسے صرف اتنا مارا جائے کہ وہ باڑے میں بند کیا جا سکے۔ پچاس ساٹھ جوانوں کی تعداد کافی تھی اگر وہ فصل کے اندر داخل ہونے کی اجازت دے دیتے۔ طریقہ بھی یہی ہوتا ہے کہ جنگلی جانور اگر کسی فصل کے اندر چھپا ہو تو چاروں طرف سے گھیرا کر کے کچھ لوگوں کو فصل کے اندر داخل کر دیتے ہیں، شور مچا مچا کر جانور کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور جانور باہر نکلتے ہی داب لیا جاتا ہے۔ ٹھاکر اودل سنگھ کا خیال تھا کہ اس طرح فصل کے اندر داخل ہونے سے فصل برباد ہوگی اور ساتھ ہی ساتھ تلسی کے پودے بھی پیروں تلے روندے جائیں گے، جس سے ان کی بے حرمتی ہوگی۔ لوگوں نے پوچھا، ارہر کے کھیت میں تلسی کے پودے کہاں سے آئے؟ ٹھاکر نے جواب دیا کہ یہ دراصل تلسی کا ہی کھیت تھا، ارہر تو کسی مجبوری کی وجہ سے لگانی پڑی۔ لوگوں نے کہا کہ اتنے بڑے کھیت میں تلسی کی کاشت سے کیا معنی۔ تلسی تو گملوں میں بھی اگائی جا سکتی ہے کہ اس کا مصرف ہی کتنا ہے! کبھی کبھی نزلے زکام میں پتیاں اُبال کر پی لیں یا کبھی کبھی پوجا کر لی۔ ٹھاکر اودل سنگھ نے جواب دیا کہ تلسی کی فصل کا مصرف اتنا ہی کام نہیں ہے۔ جب تلسی بڑھتی ہے تو اس کی پتیوں میں سورج کی تیز چمک سے ایک خاص مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اس مادے میں ایک خوشبو ہوتی ہے۔ ہوا چلے تو وہ خوشبو دور دور تک جاتی ہے۔ جہاں جہاں تک وہ خوشبو پہنچتی ہے وہاں وہاں تک دیگر فصلوں کو نقصان پہنچانے والے کیڑوں کو مار دیتی

Scanned with CamScanner

ہے۔ لوگوں نے کہا، ہم نے تو ایسا نہیں سنا۔ نمبردار اودل سنگھ نے کہا کہ اس کے ذمے دار وہ نہیں ہیں۔ تب لوگوں نے کہا، مگر تلسی کے پودے نظر تو نہیں آ رہے۔ ٹھاکر اودل سنگھ نے جواب دیا، ممکن ہے اندر ہوں۔ اندر جا کر میرے علاوہ تو کسی نے دیکھا نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا، زیادہ تر تو ارہر کے پودے ہی ہیں، بلکہ ہماری نظر میں تو صرف ارہر کے ہی پودے ہیں۔ ٹھاکر اودل سنگھ نے گرج دار آواز میں کہا، نظر دھوکا بھی کھا سکتی ہے۔ اگر اسی دھوکے میں ارہر کی فصل کے ساتھ تلسی کے پودے بھی کچل گئے تو ذمے دار کون ہوگا؟ بولو، ذمے دار کون ہوگا؟ بولو، چپ کیوں ہو گئے؟ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور آہستہ آہستہ سب نے خود کو یقین دلایا کہ ارہر کے بڑے کھیت میں یقیناً زیادہ تر تلسی کے ہی پودے ہیں اور تلسی کے پودے کچل جائیں تو شراپ لگے گا۔ دراصل اندر جانے کا خطرہ بھی کوئی مول لینا نہیں چاہ رہا تھا۔ اندر جانے کا مطلب تھا نیلے سے پہلا براہ راست اور دو بدو مقابلہ، جہاں بھاگنے کی بھی جگہ کا امکان نہیں تھا۔ وہ لوگ دائرے میں چلتے رہے۔ پسی ہوئی لاٹھیاں تھامے، برابر کا فاصلہ رکھتے ہوئے، اپنی سانسوں کی آواز کو سنتے ہوئے، کھیت کی موہوم سے موہوم آواز پر کان رکھے ہوئے۔

ہوا چلی۔ شاخیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ پورے کھیت میں ہوا کے بہاؤ کے رخ پر آوازوں کا ریلا آگے بڑھا۔ ان آوازوں کو لوگوں نے پھر نیلے کی بھگدڑ سمجھا۔ پھر سب کے منہ سے ڈری ڈری چیخیں نکلیں۔ ایک دوسرے کو چیختے سن کر لوگوں کی چیخیں اور طویل ہو گئیں۔

ایک نسبتاً کم گھنے حصے میں ساکت منوں وزنی گوشت کا سیاہ تودا کنوتیاں ملائے کھڑا تھا۔ دُم تیزی سے بے آواز گردش کر رہی تھی۔ ہری خوراک کے پودوں کے ادھر چاروں طرف دیر سے ہلچل سنائی دے رہی تھی۔ مگر کھیت کے اندر کوئی آواز نہیں تھی۔ کھیت محفوظ تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے پودے بجتے تو وہ آواز اس کی مانوس آواز تھی۔ لیکن ان آوازوں کے بعد اچانک آدمی بھی چیخنے لگے، اور ایسا دوسری بار ہوا تھا۔ اس بار ابھی تک چیخیں تھمی نہیں تھیں۔ اسے لگا جیسے یہ چیخیں چاروں طرف سے بلند ہو رہی ہیں۔ اسے لگا گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ اسے لگا لوگ اس کے بالکل نزدیک ہو گئے ہیں۔ اس کی دُم نے تیزی سے گردش کاٹی۔ اس نے اگلے کھُر مٹی میں مارے۔

باہر لوگوں نے محسوس کیا ان کی سہمی سہمی چیخیں جیسے ہی بند ہوئیں، اندر کھیت میں زوردار آوازیں پیدا ہوئی ہیں۔ ززڑ... پھر ززڑ... ززڑ۔ پھر ززڑ... کرتا ہوا نیلا ارہر کے مضبوط پودوں

Scanned with CamScanner

سے ٹکراتا ہوا پوری رفتار سے ایک طرف برآمد ہوا۔ ڈری ڈری چیخیں بلند ہوئیں۔ کچھ لوگوں کے ہاتھوں سے لاٹھیاں چھوٹ گئیں۔ کچھ اندھادھند دوسری طرف بھاگے۔ کچھ نے ہمت کر کے لاٹھیاں بلند کر کے وار کیے۔ خون میں لہولہان سیاہ نیلا کھیتوں فصلوں کو پار کرتا ہوا سیدھا آبادی کی طرف دوڑا۔

۲

ٹھاکر اودل سنگھ نے نیلے کو اس کے بچپن سے پالا تھا۔ اس کے پالنے کی وجہ بھی عجیب وغریب تھی اور اس پر ابھی تک بھید کے پردے پڑے ہیں۔ اودل سنگھ بیک وقت دیہات، قصبے اور شہر کے باشندے تھے۔ تینوں جگہ ان کے مکانات تھے۔ گاؤں میں آبائی کھیت تھے اور حکومت، قصبے میں جیپ ایجنسی اور شہر میں تجارت۔ وہ حکومت، تجارت اور سیاست تینوں کو برابر کا وقت اور اہمیت دیتے تھے۔ گاؤں میں گڑھی تھی، قصبے میں حویلی اور شہر میں کوٹھی۔ ایک دن گاؤں کی گڑھی میں چوری ہو گئی۔ پچاس تولے سونا، تیس سیر چاندی کے برتن اور دس ہزار روپے کے علاوہ گروی گانٹھ کے تیس چالیس سونے کے عدد بھی گئے۔ وہ قصبے سے اپنی جیپ میں طوفانی رفتار سے گاؤں پہنچے اور گڑھی کے دیہاتی پہرے داروں کے سر پر اتنے جوتے بجوائے کہ ڈاکٹری معائنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ ان لوگوں نے روتے روتے اعتراف کیا کہ رات دوسرے گاؤں کی بارات میں کچھ لوگ آئے تھے، انھوں نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر بیڑیاں پییں اور ہمیں اپنی سگریٹیں پلائیں، سگریٹیں پی کر ہم بے ہوش ہو گئے۔ گڑھی کے پیچھے پہرے کے کتے مردہ پائے گئے؛ ان کے منھ سے نیلا نیلا پانی رس رہا تھا۔ انھیں گوشت کے پارچوں میں کچھ دیا گیا تھا۔ جس دیہات سے بارات آئی تھی وہاں دوڑ دی گئی تو بارات کے گھر والوں نے ان سگریٹ پلانے والوں سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ بتایا کہ ہم تو ان کو گھراتی سمجھے تھے۔ خیال کیا تھا کہ لڑکی والوں کے دور کے رشتے دار ہیں جو کسی اور بستی سے بیاہ کے نیوتے میں آئے ہیں۔ ٹھاکر اودل سنگھ دانت پیس کر رہ گئے۔ وہ رات کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ جب رات ہوئی ___ اور دیہات میں رات

شام کے بعد ہو جاتی ہے ___ تو انھوں نے گڑھی کے دروازے بند کرا کے تیسرے دالان کے پیچھے والے کوٹھے میں جا کر اوپر جانے والی سیڑھیوں میں سیڑھی نمبر تین کی پٹیاں ہٹا کر معائنہ کیا اور اطمینان کیا کہ ڈالڈا کے تینوں ڈبوں میں وہ سارے سونے کے زیور ویسے کے ویسے ہی موجود ہیں جو اُدھار لینے والوں نے ضمانت کے طور پر رکھوائے تھے اور جو سود ادا نہ کرنے کے تاوان میں ڈوب گئے تھے اور ٹھاکر اودل سنگھ کی دولت کے سمندر میں بھر آئے تھے۔ وہ لگ بھگ گیارہ سیر سونے کے زیور تھے۔ اس خزانے کو شہر کی کوٹھی میں رکھنے کا مطلب تھا انکم ٹیکس والوں کے خوف سے خود کو بے خواب رکھنا۔ قصبے کی حویلی میں جو خفیہ خلا بنوائی تھی، اور جسے بنانے والے راج مستری کے کپڑے تعمیر کے دوسرے دن نہر کنارے پائے گئے تھے، وہ اس نقدی کے لیے ہی کافی تھی جو ٹھاکر اودل سنگھ نے شہر کے کولڈ سٹور اور قصبے کی چینی مل سے پیدا کی تھی۔ کولڈ سٹور میں ۹۰ فیصد آلو ان کا خریدا ہوا تھا، لیکن حساب کی کتابوں میں اس کا اندراج دیہات کے کسانوں کے نام ہوتا تھا۔ ایک بار انکم ٹیکس افسر نے ان کسانوں کو نوٹس بھیج کر شہر کے آفس میں بلا کر جیسیج بھی کی تھی۔ کسانوں نے سارے اندراجات اپنے نام میں قبول کیے۔ یہ سارے کسان وہ تھے جو ٹھاکر اودل سنگھ کی گڑھی سے برسات اور سردیوں میں اپنے گھر کے زیور رکھ کر قرضہ لاتے تھے۔ جس دن کسانوں کے بیانات ہونے تھے اس سے دو دن پہلے ٹھاکر صاحب شہر کے وکیل کو لے کر گڑھی میں آئے تھے اور ان سارے کسانوں کو آنگن میں بٹھا کر سوال جواب کی تیاری کرا دی تھی اور لال اور نیلی رسیدوں والی کتابیں دکھا کر ان سے پوچھا تھا:

"کیا تم یہ رسیدیں پہچانتے ہو؟"

"نہیں،" سب نے ایک آواز ہو کر کہا تھا۔

شہر کا وکیل ٹھاکر صاحب کا چہرہ دیکھنے لگا اور جلدی جلدی سگریٹ پینے لگا۔ ٹھاکر صاحب نے ڈانٹ ڈپٹ کر سمجھایا کہ تم سب ان کتابوں کو پہچانتے ہو کیوں کہ ان پر تمھارے انگوٹھوں کے نشان ہیں۔ پھر انھوں نے سب کے انگوٹھوں کے نشان لگوائے۔

انکم ٹیکس دفتر میں کسانوں نے بیک آواز بتایا کہ اب ہم ان کتابوں کو پہچانتے ہیں اور کولڈ اسٹور میں سارا آلو ہمارا ہی ہے اور ان کتابوں کو ٹھیک کہتے ہیں۔ اور ان پر ہمارے انگوٹھوں کے نشان ہیں۔"

Scanned with CamScanner

انکم ٹیکس آفیسر یہ سن کر چونکا۔ اس نے اپنے انسپکٹر کو دوسرے کمرے سے بلایا۔ انسپکٹر نے اسے یہ سمجھایا کہ سر، میں خود کئی دنوں تک کسان کا بھیس بنا کر کولڈ اسٹور کے آس پاس گھوما ہوں۔ یہ سارا آلو کولڈ اسٹور کے مالک کا ہے۔ یہ کسان تیار کیے ہوئے ہیں۔

آفیسر نے اپنے چیمبر میں آ کر سب کا بیان کاغذ پر درج کیا۔ سب نے ایک ہی بات دہرائی کہ ہم کسان ہیں۔ آلو پیدا کرتے ہیں۔ فصل پر آلو سستا ہوتا ہے تو ہم اسے کولڈ اسٹور میں رکھ دیتے ہیں۔ کولڈ اسٹور سے فصل کے بعد والے زمانے میں نکال کر یہ آلو مہنگے داموں میں بیچ دیا جاتا ہے۔ صرف رسید کی پشت پر سارے ہی انگوٹھے کے نشان ہیں۔

ان کے چہروں پر کوئی زیادہ جھوٹ بھی نہیں برس رہا تھا۔ انھوں نے ایک ایک لفظ صحیح کہا تھا۔ صرف درمیان میں ایک جملہ اور بھی جوڑا جا سکتا تھا کہ صاحب فصل پر آلو پیدا ہوتے ہی ہم سے سستے پورے خرید لیتے ہیں کیوں کہ اس وقت ہمیں ان کا بیانہ ادا کرنا ہوتا ہے۔

افسر نے ان کے چہروں کو پڑھا اور کارروائی مکمل کر کے اطمینان کی سانس لی کہ کیس ختم کرنے سے پہلے ساری ضروری کارروائیاں مکمل ہو گئی تھیں — کیس پڑھنا، شک کرنا، شک دور کرنے کے لیے نوٹس بھیج کر گواہوں کو بلانا، ان کے بیانات کا اندراج کرنا اور پھر فیصلہ سنا دینا۔ ٹھاکر صاحب نے آفس سے نکلتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کمر سے جھکتے ہوئے صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اظہار افسوس کیا کہ آپ کو اس کیس میں خواہ مخواہ محنت کرنا پڑی اور اتنے لوگوں کے بیانات درج کرنا پڑے۔ صاحب نے خاکساری کے ساتھ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ "یہ تو ہمارا فرض تھا۔"

ٹھاکر صاحب چوری کے بعد کئی دن تک گاؤں میں آتے رہے۔ وہ روز شام کو گڑھی کی بیٹھک میں بیٹھ کر رات گئے تک بیٹھے رہتے اور ان لوگوں کو اس دن کی سناتے رہتے جنھوں نے چوروں کے ہاتھوں لٹنے کی سرگزشتیں سنی تھیں۔

ایک دن یونہی بیٹھے تھے کہ باہر شور ہوا۔ نکل کر دیکھا تو گڑھی کی چہار دیواری میں ایک مادہ نیل گائے دو بچوں کے ساتھ ہانپتی ہوئی ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر، وحشت کے عالم میں دوڑ رہی ہے اور دھول اڑا رہی ہے۔ گیہوں کے کھیت کٹنے کے بعد کھیت میدان ہو گئے تھے اور چھپنے کی جگہ نہیں بچی تھی۔ کتوں نے رگیدا ہوگا اور بے چاری بچوں کی کم رفتاری سے مجبور ہو کر گاؤں کی

Scanned with CamScanner

سمت بھاگ پڑی ہوگی۔ مادہ تو ٹوٹی ہوئی چاردیواری پھلانگ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ آگے جا کر رک کر مڑ کر بچوں کی طرف دیکھا، دم تیزی سے ہلائی، پھر چاردیواری کی طرف بھاگ کر واپس آئی کہ کتوں نے پھر رگید۔ مجبوراً اسے کھیتوں کی طرف بھاگنا پڑا۔ بچوں کو، بھورے بھورے، بڑی بڑی آنکھوں والے، بڑے کتے کی جسامت کے بچوں کو پکڑ کر نیم کے درخت سے باندھ دیا گیا۔ ان میں کا ایک نیم کے درخت سے بندھا بندھا تیزی سے درخت کا طواف کرتا اور جب رسی درخت سے لپٹ جاتی اور گردن میں بل پڑنے لگتے اور آنکھیں ابلنے لگتیں تو پھر مخالف سمت میں دائرے کاٹنے لگتا۔ اس نے درخت سے سر ٹکرا ٹکرا کر لہولہان کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب سورج غروب ہو رہا تھا تو وہ زمین پر گر کر تیز تیز سانس لینے لگا۔ خون کی الٹی ہوئی اور تھوڑی دیر بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ دوسرے بچے کی ٹانگیں باندھ دی گئی تھیں اور اسے نیم کے تنے سے سر ٹکرانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

اتنے میں گاؤں کے لوگ آ پہنچے۔ ایک بوڑھے نے تاسف کے ساتھ کہا ’ماسے رسے دیا گئوہتا کا بدھ ہو گیا۔‘ ٹھاکر کی آنکھیں یہ سن کر چمکنے لگیں۔ انھوں نے بوڑھے کو ڈانٹ کر چپ کرایا اور بتایا کہ اگر ان جانوروں کو پکڑا نہ جاتا تو یہ گاؤں کے غریب کسانوں کے گھروں میں گھس کر ڈھونڈ ڈھونڈ کر ننھے ننھے بچوں کو اپنے پیروں سے کچل ڈالتے۔ گاؤں والوں نے اوپر والے کا شکر ادا کیا کہ آج ٹھاکر ادل سنگھ کی وجہ سے ان کے معصوم بچوں کی جان بچ گئی۔

ٹھاکر ادل سنگھ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ مرنے والا جانور کا بچہ کتنا جری اور قوی تھا۔ نیم کے تنے پر بچے کے سر کی مار کے نشان دیکھ کر انھوں نے فیصلہ کیا جو بچہ بچ گیا ہے اسے وہ پالیں گے۔ کیوں کہ اول تو یہ گئوماتا ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ بڑا ہو کر اجنبیوں کو اپنے سینگوں سے لہولہان کر کے انھیں اپنے گھروں سے نکال سکتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اسے کھلانے پلانے کا کوئی خاص خرچ نہیں ہوگا! کبھی کبھی اپنے کھیتوں کا چارا بھی کھا لیا کرے گا۔ چوتھے یہ گوشت کے پارچے شوق سے نہیں کھاتا۔

ٹھاکر صاحب نے اسے اس انداز سے پالا کہ آدھا وقت وہ قصبے میں رہتا اور آدھا وقت گاؤں میں کاٹتا۔ گاؤں کی گڑھی اور قصبے کی حویلی میں پانچ میل کا ہی تو فاصلہ تھا۔ وہ اسے نیلا کہہ کر پکارتے تھے اور لوگ اسے ٹھاکر کا نیلا کہہ کر بلاتے تھے۔

Scanned with CamScanner

شروع شروع میں بہت دقتیں پیش آئیں۔ وہ تو یہ کہ وہ وحشی تھا، کسی طرح بندھنے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ پہلے اسے بھوکا رکھا گیا۔ بھوک نے اس کی وحشت کو کم کیا۔ پھر اسے خوب پیٹ بھر کر ضرورت سے زیادہ غذا دی گئی، تب خوش خوری نے اس کی وحشت کو بظاہر ختم کر دیا۔ گاؤں والے اسے تفریح کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ شاکر اور ان کے نوکر اسے ہمیشہ باندھ کر رکھتے تھے۔ وہ صرف چارہ ناشتے میں کھاتا تھا، موٹے اناج کی سانی لیتا اور ڈنر میں ثابت اناج اور گڑ۔ کبھی کبھی سوپ کے طور پر اس کے منہ میں کھوکھلے بانس کا ٹکڑا ڈال کر سرسوں کا خالص تیل پلایا جاتا۔ دو سال میں اس کا سینہ پر گوشت، بدن سڈول اور سینگ طاقتور ہو گئے۔ پٹھے پر سفید صندوری کے بال گھنے ہو گئے۔ ایک دن شاکر صاحب نے محسوس کیا کہ بیلاب اتنا بڑا اور طاقتور ہو گیا ہے کہ رسی کی بندش کو صرف عادت کے طور پر فرماں برداری میں قبول کرتا ہے، ورنہ چاہے تو ایک ہی جھٹکے میں رسی اور رسی کے دوسرے سرے پر کھونٹے سمیت دو کساں کو لے کر بھاگ جائے۔

اگر رسی سے آزاد کر دوں تو کیا بھاگ جائے گا؟ انھوں نے سوچا، اور کچھ یاد کر کے مسکرا دیے۔
رات میں گرمی کے آنگن میں بیٹھ کر انھوں نے پچھلے سال کا چیئرمینی کا الیکشن یاد کیا۔ اس کی موافقت کے لوگ ممبری کا چناؤ جیتے تھے اور مخالف امیدوار کی موافقت کے ۸ ممبران فتح یاب ہوئے تھے۔ ان ۱۵ ممبران کو چیئرمین کا انتخاب کرنا تھا۔ پچھلے بیس برس سے وہ بلا شرکت غیرے چیئرمینی کے تنہا امیدوار ہوتے آئے تھے۔ ممبروں کے ذریعے چناؤ محض رسمی خانہ پری ہوتا تھا۔ مگر اب زمانہ بدل رہا تھا۔ کچھ عجیب عجیب سے نعرے سننے میں آتے تھے کہ شاکر جی کیوں بارم بار؟ نہیں چلے گا اک پریوار! یا شاکر کو ہے جتانا، ہم کو بھی آزمانا...'

اس چیئرمینی کے چناؤ میں پانچ دن باقی تھے۔ مخالف کیمپ آٹھ امیدواروں کے ساتھ جیتا تھا۔ اس نے چناؤ سے پہلے ہی جشن منا رہا تھا۔ جشن کی آوازیں کانوں میں آتیں تو شاکر کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ وہ حویلی کی چھت پر کھڑی چارپائی پر لیٹے لیٹے رات گزار دیتے۔ چناؤ سے تین دن پہلے محسن چمار ممبر غائب ہو گیا۔ پولیس میں گمشدگی کی رپورٹ لکھا دی گئی۔ یہ رپورٹ شاکر صاحب نے لکھوائی تھی۔ ان کا بیان تھا کہ محسن اندر ہی اندر ان کا موافق تھا۔ مخالف امیدوار محمود صاحب اس بات کو بھانپ گئے تھے۔ انھوں نے اسے اغوا کر کے اسے مروا ڈالا ہے۔ محمود صاحب کی طرف سے بھی رپورٹ ہوئی۔ اس کا لب لباب بھی وہی تھا۔ پولیس نے تفتیش تیز کر دی، یعنی دونوں

امیدواروں کو ترقی کی دھمکی دے کر دونوں سے کہا گیا کہ چناؤ کے دن تک مقتول کو ہر حال میں حاضر کرنا پڑے گا۔ دونوں امیدواروں نے پولیس سے وعدہ کیا۔ دن میں ٹھاکر صاحب قصبے کی حویلی میں پولیس کے سب انسپکٹر انچارج کو کھانے کی میز پر تفتیش کراتے اور رات کو بارہ بجے کے بعد گاؤں پہنچ کر گڑھی کے تہ خانے میں جمّن کو ڈنڈے پر کپڑا لپیٹ کر پٹواتے۔ چناؤ سے ایک دن پہلے انھوں نے جمّن کو سمجھایا کہ "ہمارا ساتھ دینے میں تمہارا جو فائدہ ہے اسے تم سمجھ نہیں پا رہے ہو۔ ایک تو یہ کہ تمھیں چیئرمین بننے کے بعد صفائی کا ممبر انچارج بنا دوں گا۔ صفائی کے عملے کی آسامیاں تم اپنی مرضی سے بھرنا۔ قصبے میں نل لگوانے کا کام بھی تمہارے ہی سپرد ہو گا۔ ۱۰۰ نل منظور ہوتے ہیں، کم از کم ۱۵ ضرور لگوانا ہوں گے۔ روزانہ سڑک کی نالیوں پر چونا ڈلوانے کا ایک بجٹ ہوتا ہے۔ اس پیسے کو تم دھرم کے کام میں لا سکتے ہو جیسے اپنی بیٹی کی شادی کا کھانا اور کپڑے وغیرہ، کیوں کہ روزانہ چونا ڈلوانے سے نالیوں میں چونے کی تلذی جم جانے کی جس کی وجہ سے مزید گندگی کا خطرہ ہے۔"

انھوں نے اسے یہ بھی سمجھایا کہ شہر کے کچھ غنڈے اس کی لڑکی کو اغوا کر کے اپنے کام میں لانا چاہتے تھے جن کو ٹھاکر نے بڑی مشکل سے روکا ہے اور ان غنڈوں کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا ہے کہ جمّن ہمارا آدمی ہے۔ آدمی کیا ہمارا بھائی ہے، ہمارا موافق ہے، ہمیں ووٹ دینے جا رہا ہے۔

انھوں نے باتوں ہی باتوں میں یہ بھی سمجھایا کہ ان شہری غنڈوں نے یہ کام صرف ان کے کہنے کی وجہ سے نہیں کیا ورنہ وہ یہ دھمکی دے گئے ہیں کہ اگر جمّن ٹھیک سے راضی نہیں ہوتا تو اس کا گلا کاٹ کر اس کے کپڑے خون میں بھگو کر محمود صاحب کے گھر کے پچھواڑے کھنڈر میں ڈلوا دو۔ یہ سن کر جمّن نے اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ سلامت پایا تو ٹھاکر صاحب کا ہاتھ جوڑ کر شکریہ ادا کیا۔

گڑھی کے خنک آنگن میں لیٹے لیٹے ٹھاکر صاحب نے پچھلے موسم کی اس رات کو یاد کیا اور اس یاد میں مزہ محسوس کیا کہ کیسے انھوں نے اچانک ایک فیصلہ کیا تھا۔ وہ جمّن سے اچانک آواز بدل کر بولے تھے:

"جمّن، تو کیا سمجھتا ہے کہ میں تجھے اپنی چیئرمینی کے لیے اٹھا کر لایا ہوں؟ نہیں، نہیں،

Scanned with CamScanner

بالکل نہیں۔ یہ سادہ چہرہ کسی بس میں مت لانا نہیں، تو شاید سب کی جی سوچ رہا ہے جگمن چپ چاپ کھڑا ہوا سوچے سوچے کانپ رہا۔

شاکر کے چہرے پر ایک خاص طرح کا سادھو سنتوں والا تیج پیدا کیا اور بھاری مصنوعی آواز میں بولے!

چلو جگمن۔ تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آئیں۔ کل جسے دل چاہے ووٹ دینا۔

وہ حیران کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ شاکر نے اس کی ٹانگوں سے رسی کھولی، پھر ہاتھوں کی رسیاں کھولیں، اس کی آنکھوں پر انگوچھا باندھا اور اسی عالم میں گاؤں سے لاکر قصبے کی عیدگاہ کے پیچھے جاکر جیب سے اتارا اور انگوچھا کھول کر اس کی چھپکی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔ دیکھتے رہے یہاں تک کہ وہ بھی انہیں دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ اس نے آج تین دن اور تین راتوں کے بعد اپنے پیروں اور ہاتھوں کو آزاد پایا تھا۔ اس نے آنکھیں مل کر شاکر کا چہرہ دیکھا۔ اسے شاکر کے چہرے کے چاروں طرف ہلکا ہالا سا نظر آیا جیسے رام لیلا کی تصویروں میں ہوتا ہے۔ شاکر، جو ابھی تک اس کا ایک ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، سوچ رہے تھے کہ یہ ہاتھ چھوڑ دوں یا پکڑے رہوں، اس سے کچھ بولوں کہ کچھ نہ بولوں۔ جگمن نے اس ہاتھ کی پروا نہیں کی۔ اسے اپنی جان بچنے کی اتنی خوشی ہو رہی تھی کہ اسے خیال ہی نہیں تھا کہ اس کا ہاتھ ابھی تک شاکر کی گرفت میں ہے۔

پو پھٹنے والی تھی۔ پیڑ کے درختوں میں تیتر بولا۔ نیک شگون لے کر شاکر نے جگمن کی سوکھی کلائیوں میں قدرے اطمینان سے دوڑنے خون کی رفتار کو محسوس کیا اور ہاتھ کو آزاد ہونے کا جو واحد فائدہ جگمن کی سمجھ میں آیا وہ یہ کہ اب اطمینان سے جھک کر دونوں ہاتھ جوڑ سکتا تھا۔ اس نے یہی کیا۔

الیکشن میں شاکر کو ووٹ دینے کے بعد اس نے تھانے میں یہ بیان دیا کہ وہ دل کے اندر سے ہمیشہ سے شاکر صاحب کا موافق رہا ہے۔ محمود صاحب کے ڈر سے وہ دلی بھاگ گیا تھا اور وہیں نظام الدین اسٹیشن پر تین دن تین راتیں گزار کر آیا ہے۔ پولیس سب انسپکٹر نے فائل رپورٹ کی اور حاشیے میں شاکر صاحب کے تعاون کا جلی حروف میں ذکر کیا جواب چیمبر میں بھی تھے۔

صرف ایک سال پرانی یاد میں بھی اتنا مزہ آسکتا ہے، یہ سوچ کر شاکر کو اور لطف آیا۔ کھیتوں کی طرف سے سوئیں لوریاں دیتی ہوئی آتیں۔ پہرے کے نوکروں کو گالیاں دے کر

Scanned with CamScanner

انھوں سے ہوشیار کیا۔ بندھے ہوئے بیٹے کو ایک نظر پیار اور ایک نظر اختیار کے ساتھ دیکھا اور سو گئے۔ صبح اٹھ کر انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آسمان پر نگاہ پھینک کر دیکھا کہ پو پھٹنے میں کتنی دیر ہے۔ جب میلا میلا اجالا اتنا روشن ہو گیا جتنا پچھلے سال جمّن کا ہاتھ چھوڑتے وقت تھا تو انھوں نے کان لگا کر کوشش کی کہ کسی بیر کے باغ میں تیتر بول جائے۔ نہیں بولا۔ البتہ کوئی ٹیٹری زور سے چیخی۔ اسی کو تیتر کی آواز پر محمول کر کے انھوں نے آگے بڑھ کر نیم کے درخت سے بندھے نیلے کو رسی سے آزاد کر دیا۔ وہ رسّی کھُل جانے کے بعد بھی ویسے ہی کھڑا رہا، ہلا تک نہیں۔

ٹھاکر صاحب نے زور سے آواز دے کر اپنے چھوٹے بیٹے اونکار کو بلایا۔ اُس کی آنکھوں میں رات کی شراب کا خمار تھا۔ نیلے کو آزاد دیکھ کر اس کا خمار ٹوٹا۔ اس نے حیرت سے اپنے باپ کو دیکھا۔ باپ نے چہرے پر کسی غیر ضروری تاؤ کو لائے بغیر مضبوط آواز میں دھیمے دھیمے کہا:

"ایسے ہی جمّن کو رام کیا تھا پچھلے سال..."

۳

نیلے نے یکایک اپنی زندگی میں ایک خوش گوار تبدیلی محسوس کی۔ اسے محسوس ہوا کہ گردن میں جو موٹی سی چیز چبھتی رہتی تھی وہ دور ہو گئی ہے، اور اب چلنے میں کوئی رکاوٹ نہیں محسوس ہوتی۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ اگر کبھی تیز چلنے کا دل چاہے تو رسی پکڑنے والے کا بوجھ بھی گھسیٹنا پڑتا تھا۔ اب سب کچھ کتنا ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے جبلّی طور پر اسے ایک خدشہ لاحق ہوا کہ اور باتیں بھی تو تبدیل نہیں ہو گئیں۔ لیکن جب صبح ہرا چارا، دوپہر کو سانی اور رات کو ناج اور گڑ ملا تو اس نے طبیعت میں بہت چونچال محسوس کی۔ وہ گڑھی کے چاروں کونوں میں گھومتا پھرا۔ ایک بار دروازے سے نکل کر باہر بھی گیا۔ گاؤں والے اسے کھلا دیکھ کر چونکے۔ کچھ ڈرے، کچھ اس کی آزادی کے خیال سے خوش ہوئے۔ نیلا تھوڑی دیر بعد واپس گڑھی میں آ گیا اور نیم کے درخت کے نیچے آ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے اندر ہی اندر گردن پر تناؤ محسوس ہوا۔ دراصل

جب دھوپ اس قدر آ جاتی تھی تو وہ ٹھاکر اپنی اسی رسی کھینچتا ہوا درخت کے سامنے والے حصے میں چلا جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس پر دھوپ آ گئی تھی۔ روزانہ اسی کھونٹی سے ٹھاکر جی کی گرفت کے سہارے سائے میں جا کھڑا ہوتا تھا۔ اس بات سے دھوپ اور رسی کا ساتھ ساتھ محسوس ہو۔ لیکن جب دوسرے سائے حصے کی طرف گیا تو اس پر منکشف ہوا کہ آج رسی کا تناؤ گردن پر نہیں تھا۔ وہ اگلے دونوں پیر زمین پر مار کر اگلے دھڑ سے اٹھا اور ہوا کے تنے پر اپنے سر سے ایک ہلکی سی ٹکر ماری۔ یہ آزادی کے رقص کی پہلی تال تھی۔

ٹھاکر صاحب نے آہستہ آہستہ سے کچھ دن وقت گزار کر دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دیگر دو خوبصورت جوڑ سا غیر سمجھے گئے تھا۔ قصبے میں جس آج اسیں یہ خبر تھی کہ رات نیلے نے گڑھی کی دیوار پھلانگ کر شیشم کی سوکھٹ پھاڑ کر جا کے وہ لے شاہو کی تو ڑدی سے تو سارے خوشی کے خوشی میں ناچے پھر رہے۔ گاؤں کے بچے اور بیٹے سے سب ہیں کھٹکھٹا باس ڈال کر اپنے ہاتھ سے ایک سیر تیل پلایا۔ تیل پی کر وہ پھیلنے لگا۔ ٹھاکر نے بیٹھک میں آ کر گاؤں کے ہجوم کو دیکھا جو نیلے کی شکایت لے کر آیا تھا اور صرف ایک ہی بات کہی:

رات نے دو سکے شاہو گڑھی میں کیا پوجا کرنے گیا تھا؟ بولو۔ جواب دو۔ چپ کیوں ہو؟

ظاہر ہے کہ اس بات کا جواب کون دیتا، کہ رات کو دو سکے واقعی پوجا کا کوئی مناسب وقت نہیں ہوتا۔

یہ کسوتی کا اوتار ہے۔ وحشت لوگوں کا ٹھیک ٹھیک پر سدھار رکھے گا۔ ہجوم چھٹ کر چل دیا۔ کچھ بڈھوں نے گڑھی سے نکلتے وقت کن انکھیوں سے نیلے کو دیکھا جو اگلے پیر زمین پر مار مار کر دھول اڑا رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے ہاتھ جوڑ کر اوتار کو پرنام کیا۔

گڑھی میں رکھے زیورات کی حفاظت کے اس انوکھے انتظام سے ٹھاکر کا رواں رواں خوش ہو گیا۔ نیلا کبھی کبھی قصبے کی حویلی میں بھی رات گزارتا تھا۔ ٹھاکر نے یہ بھی سوچ سمجھ کر کیا تھا، تاکہ قصبے اور دیہات دونوں پر نیلے کی یکساں دہشت قائم رہے۔ نیلا ابھی پٹھا تھا، مکمل بالغ نہیں ہوا تھا، اس لیے مستی میں نہیں آتا تھا۔ اس لیے وہ ان کے ساتھ کتے کی طرح رہتا تھا۔ ساتھ ساتھ۔۔ وفادار۔۔ آگے پیچھے۔۔۔ دائیں بائیں

دیہات کی کھیتی باڑی، گڑھی گاشتہ کا کام، سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ نیلے کی وجہ سے

چوروں سے بھی خوب حفاظت تھی۔ اسی طرح قصبے کی حویلی میں کبھی کبھی رات گزارنے کی وجہ سے وہاں بھی چوروں کا خطرہ نہیں رہا۔ اب تو کبھی کبھی ایسا بھی ہونے لگا کہ چور، تو چور، جو لوگ حویلی یا گڑھی میں اپنا حق لینے آتے، جیسے گیہوں کاٹنے والے اپنی مزدوری کا گٹھا یا چھت پر مٹی ڈالنے والے مزدور اپنے حصے کا اناج، تو ان پر بھی نیلا دوڑ پڑتا تھا۔ وہ لوگ ٹھاکر سے منت سماجت کرتے، نیلے کی کارکردگی کی مبالغے کے ساتھ تعریف کرتے، تب ٹھاکر خوش ہو کر انھیں ان کا حق دیتے۔

دیہات اور قصبے کی طرف سے جب فراغت محسوس ہوئی تو ٹھاکر نے شہر کی تجارت میں توجہ بڑھائی۔ دیہات والی چودھری کے سامنے کے بعد اُدھر وقت نہیں دے پاتے تھے۔ شہر کی تجارت بھی زوروں پر چلنے لگی۔

ویسے تو نیلا زیادہ تر کام معمول کے مطابق کرتا تھا، یعنی دیہات میں رہتا، کسی بھی کھیت میں دو چار منھ مار دیتا، کہ جانور یہ تفریق نہیں کر سکتے کہ یہ تیرا ہے یہ میرا ہے۔ کبھی کبھی گڑھی سے تالاب کی طرف جاتے ہوئے اگر گلی تنگ ہے تو وہ راستے میں ملنے والے افراد کے درمیان سینگوں سے راستا بنا لیتا۔ یہ بات بھی ہر فرد بشر آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ سینگوں کے بجائے اگر کھروں سے راستا بناتا تو اس میں لوگوں کو زیادہ زخم آتے۔ کبھی کبھی یوں ہی دولتی بھی چلا دیتا جس سے ان لوگوں کے کپڑے اور کپڑوں کے نیچے ذرا کھال وغیرہ بھی پھٹ جاتی۔ معلوم نہیں کیوں لوگ بال بچ رہنے میں چھپا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔

اسی طرح جب وہ قصبے میں ہوتا تو کبھی کبھی پڑوس کے کسی بھی گھر میں گھس پڑتا اور مٹی کے برتن وغیرہ توڑ کر شاداں واپس آتا۔

ٹھاکر نے شکایت کے جواب میں ہمیشہ یہی کہا کہ نیلے نے آج تک کسی کے تانبے پیتل کے برتن نہیں توڑے، ہمیشہ مٹی کے توڑے۔ ٹھاکر چاہتے تھے کہ لوگ نیلے کی اس حسن تمیز کی داد دیں۔ رفتہ رفتہ لوگ اس سے بیزار ہونے لگے۔ خصوصاً دیہات میں لوگ اپنے کھروں کو باڑوں میں بھی بند رکھتے۔

قصبے میں بھی نیلے کو دور سے دیکھتے ہی اہم چیزیں چھپا لی جاتیں اور دروازے، اگر کھلے ہوں تو بند کر لیے جاتے۔ ٹھاکر نے لوگوں کی اس بیزاری کو بہت بُرا سمجھا۔ انھیں اکثر خیال آتا کہ وہ

Scanned with CamScanner

کیسے لوگوں کے درمیان زندگی گزار رہے ہیں، جن میں ذرا سی حس مزاح نہیں۔ ذرا سی چونچالی نہیں۔

ایک دن گلفام کنجڑا شام کو روتا ہوا قصبے کی حویلی پر آیا اور بیٹھک میں ٹھاکر کے پیر پکڑ لیے۔ اس نے احوال بیان کیا کہ وہ حوا نچہ لگا کر امرود بیچ رہا تھا کہ بغیر کسی اشتعال کے نیلے نے آکر پہلے تو اس کے پانچ عدد امرود کھائے۔ جب اس نے نیلے کو دھکا دیا تو نیلے نے باقی امرودوں کو کچل دیا۔ جب اسے اس حرکت سے روکا گیا تو اس نے گلفام کے اوپر دو پیروں سے حملہ کر دیا جس سے اس کا بازو زخمی ہو گیا اور قمیص پھٹ گئی۔ وہ اس کا ہرجانہ چاہتا ہے۔

ٹھاکر نے اس کی بات توجہ سے سنی۔ بلکہ کئی بار واقعات کو بیچ بیچ میں روک روک کر نئے سرے سے سنا۔ اس درمیان انھوں نے نوکر بھیج کر کچھ پاس پڑوس کے، کچھ بازار کے آدمی بلوا لیے۔ جب سب آکر گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور گلفام نے ساتویں دفعہ وقوعہ بیان کر لیا تو ٹھاکر نے اس سے ایک عجیب شانِ بے نیازی کے ساتھ پوچھا:

"آج کا تہ بازاری کا پیسہ بھر دیا تھا؟"

"نہیں سرکار۔ خوانچہ بڑھا کر ٹھیکے دار کو دیتا۔ شام کو دیتا۔"

"تہ بازاری کا مطلب ہوتا ہے بازار میں بیچنے کے عوض اس سرکاری جگہ کا روزانہ کا کرایہ۔ اتنا تو تم جانتے ہو گے؟"

"ہاں سرکار۔"

"اگر تم نے اس وقت تک تہ بازاری کا پیسہ نہیں بھرا تو اس کا مطلب صبح سے شام تک تم غیر قانونی انداز میں بیٹھے۔ بولو۔ جواب دو۔"

گلفام چپ رہا۔ یہ نکتہ اس کی سمجھ میں عام حالت میں بھی نہ آتا، نہ کہ اس زخمی حالت میں جب کہ اس نے امرودوں کا نقصان بھی سوچ رکھا تھا۔

"بولو۔ بھائی، کچھ تو بولو۔ میں تمہیں پورا موقع دیتا ہوں۔ میں ان لوگوں میں نہیں جو دولت اور کرسی کے نشے میں غریب کو بولنے بھی نہیں دیتے اور اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے بیٹھے ہوئے تمام افراد کے چہرے پر آنے والے ہر قسم کے تاثرات کا معائنہ کرنا ضروری خیال کیا۔ تاثرات کچھ کچھ حسب منشا تھے۔ تجربے نے انھیں بتایا تھا کہ کبھی کبھی کچھ دیر خاموش

Scanned with CamScanner

رہنا بولنے کے مقابلے میں زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ وہ چپ ہو گئے۔ بلکہ خاکساری کے انداز میں سر بھی نیچے جھکا لیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد انھوں نے دھیمے سے فیصلہ کن انداز میں کہا:

"آج تم نے تہہ بازاری کی چوری کی۔"

پھر کچھ دیر خاموش رہ کر انھوں نے اس سے بھی زیادہ دھیمی لیکن مضبوط آواز میں سوال کیا:

"تمھارے کتنے امرود کھائے؟ دس، آٹھ، چار یا پانچ؟ تم اس بات کو سات دفعہ دہرا چکے ہو۔ میں اپنے کانوں سے چھ بار سن چکا ہوں، جب سے یہ پندرہ لوگ یہاں بیٹھے ہیں تم کئی بار اپنے امرودوں کی تعداد بدل چکے ہو۔ بولو کتنے امرود کھائے؟ سات یا چھ؟ ان پندرہ لوگوں کے سامنے جواب دو۔ میں تمھیں نو مرتبہ موقع دے چکا ہوں۔ بولو۔ سچ کہ جھوٹ؟ جواب دو۔

گلفام بولا:

"نیلے نے میرے پندرہ امرود یا سات امرود یا شاید نو امرود یا میرے خیال میں دو امرود کھائے تھے۔"

سب ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگے۔ گلفام ان کی طرف بے بس نظروں سے دیکھتا رہا۔

"آپ لوگوں نے دیکھا یہ کتنی بار امرودوں کی گنتی بدل چکا ہے۔ اب اس کی کس بات کا یقین کریں۔ خاص طور سے اس حالت میں کہ آج اس نے تہہ بازاری ٹیکس کی چوری بھی کی۔

"سرکار! نیلے نے میرے ہاتھ پر لات چلائی اور خون خون کر دیا۔" گلفام سسکنے لگا۔

ٹھاکر نے تمام افراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"آپ دھرم ایمان سے بولنا، ہمارا نیلا جو ہاتھی کے برابر ہے اگر اس لونڈے کو لات مارتا تو کیا یہ زندہ بچ سکتا تھا؟ کیا اس کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ نیلے نے اس کو لات ماری؟ جب کہ خود یہ اس بات کا اقرار کر رہا ہے کہ اس نے بغیر کسی اشتعال کے نیلے کو دو مرتبہ دھکا دیا۔

"سرکار! جب اس نے میرے امرود کھائے تب دھکا دیا تھا۔"

"کون سے امرود، جن کی صحیح گنتی بھی تم ان پنچوں کے سامنے نہیں بتا پائے ہو؟"

کیوں کہ اب وہ پندرہ آدمی پنچ تھے، اس لیے ان کا منصف مزاج ہو کر سنجیدگی کے ساتھ فیصلہ کرنا ضروری تھا۔ ان میں سے چند ایک کے چہرے پر ججوں جیسی سنجیدگی اور کرختگی بھی آ گئی تھی۔

Scanned with CamScanner

غرض کہ دس پندرہ آدمیوں نے کلام سے مختلف نوعیت کے پندرہ پندرہ سوالات پوچھے۔ کلام نے ہر سوال کا جواب بہت صحیح دیا، یعنی ان پنچوں نے کچھ ایسا ہی محسوس کیا۔ اس دوران شاکر بالکل چپ رہے۔ ان کے بولنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ وہ جب گھر سے چلے تھے تو چاروں طرف سے سوالات کیے۔ رستے میں گرفتار کلام کی طرف داری میں بھی کوئی جملہ ادا کرتے۔ ان کی اس غیر جانب داری کے خود مختارانہ رویے نے پنچوں پر بہت اچھا اثر مرتب کیا۔ سب کلام کو ملامت کرنے لگے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو سبھوں کا فیصلہ یہ تھا کہ کلام باتوں سے ردو چرا کرتا ہے ورنہ اس پر یہ دعا مدلل تھی کہ وہ گزشتہ بار ری کا تیس دا نہیں کرتا۔ آخر اس نے ایک مزید سوء سرزوری کرنے کی کوشش کی۔ ایک معصوم کمسن پشو پر حملے کا الزام لگایا جو بیچارہ شام کے وقت نشے کے سبب بار بار کی سرشی پر ماتیں کنارے کی طرف دب کر زیلف کے اصول کے مطابق چل رہا تھا۔ بقیہ کلام نے رو بیچنے کے لیے، جیسا کہ اس طرح کے وبا ش لڑکے کرتے ہیں، اس نے زبان جانور پر دو یا پانچ یا سات یا لو وقعہ کچے سخت مودو مارے جس سے ممکن ہے جانور کو چوٹ آئی ہو۔ کلام سوءِ نیت شرمندگی کرے اور شاکر صاحب سے معافی مانگے۔

کلام نے سوءِ نیت شرمندگی کر، چاہی تو شاکر نے اٹھ کر آگے بڑھ کر اسے روک دیا، اور پنچوں کی طرف دیکھ کر کہا:

بس کیجیے۔ اتنی کافی ہے۔ میرا دل بہت نرم ہے

ان کے لہجے میں آنسو دیکھ کر لوگوں نے کلام کو روکا۔ جب کلام اپنا ٹوٹا ہوا جو تیچ اور باقی ماندہ اودوے کر آنکھوں میں آنسو بھرے حویلی سے باہر نکلا تو دروازے پر نیلا گھوڑا زمین پر پاؤں مار رہا تھا۔ پنچوں نے اسے للکار کر کہا:

رہنے دو بس اس بے زبان کو اور دو لوگ کھولو سے ہیرا سے

شیار سے نے جو بھی زمین پر رکھ کر آنسو خشک کیے اور مودو دونوں ہاتھوں میں لے کر بے زبان جانور کے سامنے پیش کیے۔

۳

جب دولت، سیاست اور اقتدار تینوں حاصل ہوں تو بگڑی بات بننے میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی ـــــ ایک دن ٹھاکر اسی فلسفے پر غور کر رہے تھے تو ان پر یک عجیب وغریب انکشاف ہوا کہ جب سے وہ دیہات اور قصبے کی دولت کی حفاظت سے بے فکر ہوئے ہیں، سیاست اور تجارت میں خوب وقت دینے لگے ہیں اور ان کی توجہ اور وقت دینے کی وجہ سے سیاست اور تجارت پہلے سے کئی گنا ترقی پر ہیں ـــــ یعنی ان سب ترقیوں کے پیچھے اس نیلے کا ہاتھ ہے۔ انھیں یہ بات مضحکہ خیز محسوس ہوئی۔ مگر وہ جتنا غور کرتے اسی نتیجے پر پہنچتے کہ ان کی حالیہ ترقی میں نیلے کا بہت عمل دخل ہے۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح تھی، دیہات اور قصبے دونوں میں لوگ ٹھاکر صاحب سے زیادہ نیلے سے خوف کھانے لگے تھے۔ لوگ جانتے تھے کہ ٹھاکر صاحب اگر براہ راست کسی کو کوئی گزند پہنچائیں گے تو اس کی تو داد فریاد ہے لیکن نیلے کی کسی حرکت کی داد فریاد اس لیے نہیں ہے کہ اس کی حمایت میں ٹھاکر صاحب کے علاوہ بہت سے غیر جانبدار لوگ بھی شامل ہو جاتے تھے۔ کوئی نیلے کو برا کہہ کر خواہ مخواہ شراپ بھی نہیں لینا چاہتا تھا کیوں کہ ٹھاکر صاحب نے مختلف لوگوں کا تعاون سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ نیلا بھی گنوتا کے بہت ہی قریبی عزیزوں میں ہوتا ہے، یعنی تقریباً کزن جیسا ـــــ انھوں نے کزن کا ہندوستانی ترجمہ کر کے بھی بتایا تھا۔

آہستہ آہستہ صورت حال کچھ یوں ہو گئی کہ جو لوگ نیلے سے مضروب ہوتے وہ بھی اس بات کا کھلم کھلا اعتراف نہ کرتے، مبادا انھیں کی کوئی غلطی سامنے آ جائے... صورت حال کو اس حد تک پہنچانے کے لیے کئی واقعات عالم ظہور میں پیش آئے، جن میں کچھ دیہات میں وقوع پذیر ہوئے اور کچھ واقعات کے لیے قدرت نے قصبے کا انتخاب کیا۔

۵

دہات میں گڑھی کے ٹھیک سامنے ننھو کمہار کی بیوہ اپنی دو جوان بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ننھو کمہار کا پچھلے دنوں عارضۂ دق میں انتقال ہو گیا تھا۔ صبح تین بجے اٹھ کر تینوں ماں بیٹیاں گدھوں کو لے کر نکل پڑتیں اور دور دور کے تالابوں کی مٹی کھود کر گدھوں پر لاد لاد کر صبح منھ اندھیرے واپس آجاتیں۔ پھر گارا تیار کرتیں۔ کمہار کی جوان بیٹیاں پنڈلیوں تک گارے میں کھڑی، لہنگا دراز اڑسے ہوئے، پھاوڑے سے گارے کو نرم کرتی رہتیں۔ ماں چاک پر بیٹھی برتن ڈھالتی رہتی۔ چار پانچ دن کی محنت کے نتیجے میں جب اتنے برتن بن جاتے کہ بھٹی سلگا کر پکائے جا سکیں تو اپلوں کی بنیاد بنا کر ٹوٹے پھوٹے، ہتھوں سے کچے برتنوں کو اس انداز سے سجایا جاتا کہ ان کے بیچ سانس کی جگہ باقی رہے، تاکہ آگ کی گرمی کی لہریں درمیان سے گزر کر تمام برتنوں تک پہنچ سکیں۔

ٹھاکر کے چھوٹے بیٹے اونکار کو کمہار کی بڑی بیٹی کے برتن بہت پسند تھے۔ مگر وہ اونکار کو بتلانا، تو ایک طرف، نظر بھر کر دیکھنے بھی نہیں دیتی تھی، پلو سے چھپائے رکھتی تھی۔ اونکار اکثر گڑھی کی چہار دیواری کے دروازے میں مونڈھا ڈال کر بیٹھ جاتا اور دس قدم دور گارے میں ابھرتے ڈوبتے کمہار کی لونڈیوں کے پیروں کو تکتا رہتا۔ سانولے پاؤں اور اجلے تلوے گارے میں ڈوبتے اور ابھرتے، اسی رفتار سے اونکار کا دل بھی ڈوبتا اور ابھرتا۔ وہ بیٹھا دیکھتا رہتا کہ لڑکیاں اس کی طرف سے منھ پھیر کر گارے کو اپنے پیروں سے دبا دبا کر نرم کر رہی ہیں۔ وہ وہیں بیٹھا بیٹھا گارے کی طرح نرم ہوتا جاتا اور اپنے اندر مختلف شکلوں کے برتنوں کو ڈھلتا ہوا محسوس کرتا رہتا۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ لڑکی نے گارے کی چھینٹوں سے بچنے کے لیے اپنے لہنگے کو تھوڑا سا اونچا کر کے نیفے میں اڑس لیا ہے۔ وہ پنڈلیوں سے ذرا اوپر تک کھل گئی تھی۔ اونکار اس کا بدن پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔ میلے میلے الجھے بالوں کے نیچے چمکتی ہوئی سانولی گردن، گردن کے نیچے دبلی پتلی سڈول کمان کی طرح لچکی ہوئی کمر، پشت کے نیچے گارے کو تھپکی دیتے پیروں کی دھمک سے ہلتے ہوئے کولھے، پیوند لگا لہنگا اور گھٹنوں کی پشت کا پنڈلی کا سب سے اوپر کا حصہ جو موٹی موٹی لچکی ہوئی رانوں کے بیچ ایک ابھار کی طرح واضح تھا اور جس میں اونکار کھڑے ہو کر اپنی شکل دیکھ

سکتا تھا...

اونکار کو معلوم تھا کہ اُس کی شادی پڑوس کے گاؤں میں طے ہو چکی ہے۔ لڑکا بھی ذات کا کمہار ہے اور انٹر کا امتحان دے رہا ہے۔ اونکار کسی بھی قیمت پر بڑکی کو شادی سے پہلے ایک رات کے لیے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پرتاپ نے اسے اشاروں اشاروں میں منع بھی کیا تھا کہ اس میں پنچایت کی عزت کا سوال ہے، لیکن اونکار پر روزانہ گارے کی تھپکی کا جادو چڑھ چکا تھا۔ آج اس نے پہلی بار بڑکی کی ٹانگوں کو ننگا کھلا ہوا دیکھا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل اٹھائی اور قصبے میں جا کر راکیش کو پوری بات بتائی۔ ٹھاکر اودے سنگھ آج شہر گئے ہوئے تھے۔ دونوں نے شام تک بیٹھ کر حویلی میں شراب پی اور رات گئے موٹر سائیکل پر ایک اور ہم مشرب رمیش کو بٹھا کر واپس آئے۔ موٹر سائیکل ایک ایکھ کے کھیت میں چھپا دی۔ جاڑا بہت تیز تھا اور کہرا بھی تھا۔ جگہ جگہ گاؤں کا دھواں کہرے میں مل کر گاڑھا ہو کر ہوا میں معلق کچھ کچھ ٹھوس ہو گیا تھا۔ گاؤں سو چکا تھا۔ لیکن گاؤں کے سونے کا مطلب خاموشی نہیں ہوتا۔ چھپر تلے بندھی بھینسیں ایک دوسرے سے بدن رگڑتی رہتی ہیں، ایستادہ گائیں سوتے سوتے آنکھ کھول کر ڈکرانے لگتی ہیں اور بے خواب کتے ایک دوسرے پر خواہ مخواہ بے ضرر جھپٹیں کرتے رہتے ہیں۔

پہلے تو یہ تینوں چپ چاپ گڑھی میں داخل ہوئے۔ چار دیواری کے پاس ہی بیٹھا نیلا جگالی کر رہا تھا۔ دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور سینگ آگے کر کے، سر نیچا کر کے پینترے بدلنے لگا۔ اونکار نے ڈھیر سے بھوسی بھر کر، پاس جا کر اسے تھپکی دی۔ دونوں کو اندر لایا۔ پرتاپ بھی شہر گیا ہوا تھا۔ اس کے کمرے میں اونکار کے دوستوں نے جھانکا۔ ہلکی چاندنی میں کھڑکی کے شیشے ایک جوان عورت کے بدن پر پڑ رہے تھے۔

"یہ کون مال ہے؟" رمیش نے اونکار سے پوچھا۔

"چپ سالے... بھابی ہے۔"

"ہو ہو ہو ہو۔" راکیش اور رمیش بے ڈھنگے پن سے شرمندہ شرمندہ ہنس رہے تھے۔

تینوں نے اونکار کے کمرے میں بیٹھ کر منصوبے کو آخری شکل دی۔ تھوڑی دیر بعد رمیش پیچھے سے بچتا ہوا گڑھی کے دروازے سے باہر نکلا اور کمہار کی بیوہ کے جھونپڑے کے پاس پہنچا۔ جھونپڑے میں کمہار کی بیوہ کے چند گدھے بندھے خاموش کھڑے تھے۔ جھونپڑے کے پاس آ کر

Scanned with CamScanner

رمیش نے آواز دی:

"تائی... او تائی...!"

"کون ہے؟" اندر سے آواز آئی اور چاندی کے ہلکے زیور بجنے لگے۔ لڑکیاں بھی اٹھ گئی تھیں۔ تینوں نے ایک ساتھ آکر بانس کا ٹٹر ہٹایا۔

"میں لکھن ہوں۔ کھیل پور سے آیا ہوں۔ تمھارے ہونے والے جمائی پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیو ہے۔ تمھیں بلایو ہے۔"

"ہے ری دیا!" کہہ کر تینوں رونے لگیں۔ بڑی بیٹی نے احتیاط کی کہ آواز زور سے نہ نکلے۔

لکھن نے مشورہ دیا کہ ماں اور چھوٹی بیٹی چلی چلیں۔ بڑی کی سگائی ہو چکی ہے، اس کا اس گاؤں میں، خاص طور پر اس گھر میں جانا ٹھیک نہ ہوگا۔

بڑی بیٹی کو اکیلے جھونپڑے میں چھوڑنا بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ لکھن نے مشورہ دیا کہ گڑھی میں بڑی بہو کے پاس چھوڑ دیا جائے۔

بڑی بہو نے اندر کا دروازہ کھول کر پہلے تو واقعے پر افسوس کا اظہار کیا، پھر بڑکی کو اپنے کمرے میں بلا کر زمین پر بچھونا دے کر لیٹنے کو کہا۔

کمہار کی بیوہ اور چھوٹی بیٹی لکھن کے ساتھ گاؤں کی حد سے نکل گئے۔

سیاست داں باپ کے بیٹے کا منصوبہ بڑا چست درست تھا۔ لکھن نے گاؤں سے باہر جا کر ان دونوں ماں بیٹی کو گھونسے مار مار کر قابو کیا، اور سرو درخت تلے آموں کے ایک باغ میں، جس کی نشاندہی اوتار نے کر دی تھی، ٹیوب ویل کے کمرے میں رسی سے باندھ کر منھ میں کپڑا ٹھونس کر ڈال دیا۔ چلتے چلتے اس کے دل میں رحم آیا اور بہت سا پیال اٹھا کر دونوں پر ڈال دیا۔

لکھن اب دوبارہ رمیش بن چکا تھا۔ اس نے گڑھی کے دروازے کے پاس آ کر آوازیں دیں۔

اوتار اپنے کمرے سے زور سے چلاتا ہوا نکلا: "آتا ہوں... کون؟"

میلے کی بہترین کارکردگی کی وجہ سے پہرے کے نوکر اپنی مڑھیا میں پیال اوڑھے سو رہے تھے۔

بھابی نے گھبرا کر کھڑکی پر آ کر پوچھا، "کون ہے اوتار؟"

"دیکھتا ہوں بھابی۔"

دروازے پر آ کر اس نے دھیمی آواز میں رمیش کی پوری کارکردگی کا احوال سنا اور بھابی کے کمرے کی کھڑکی کے پاس آ کر بولا:

"برابر کے گاؤں سے ایک آدمی آیا ہے۔ وہاں پتا جی کے دوست یادو صاحب پر کسی نے حملہ کر دیا ہے۔ مجھے بلایا ہے۔"

"جاؤ۔ بندوق لے جانا۔"

تینوں گاؤں سے باہر آ کر کچھ دیر تک ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے رہے۔ بوتل کھول کر ایک ایک گلاس شراب اور پی، اور آخری مرحلے کی طرف بڑھے۔ ان کا رخ گڑھی کی طرف تھا۔

صدر دروازے کے بجائے ٹوٹی ہوئی دیوار سے داخل ہوئے۔ اوتار چھپا رہا۔ دونوں نے آگے بڑھ کر آواز دی:

"اوتار! او اوتار بھائی۔" بھابی گھبرائی آنکھیں ملتی ہوئی ساڑھی برابر کرتی ہوئی اٹھی۔ کھڑکی پر آ کر پوچھا، "کون ہو؟"

"یادو صاحب پر حملہ ہوا ہے۔ اوتار بھائی کو بلایا ہے۔"

"بھی ابھی تو وہ وہیں گئے ہیں۔ گاؤں سے نکلے ہی ہوں گے۔"

"اچھا تو ہم چلتے ہیں۔ آپ کے گھر میں ٹارچ ہوگی؟ بیٹری؟ ہماری ٹارچ راستے میں گر پڑی۔ راستے پر بہت پانی ہے۔ موٹر سائیکل پھنس جائے گی۔"

"ہوں.... ابھی لاتی ہوں...."

اندر بڑکی جو سب سن رہی تھی بھابی سے لپٹ گئی۔ "مو سے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈر مت... کبھی کبھی اچانک چاروں طرف سے مصیبت آ جاتی ہے..." بھابی نے اسے دلاسا دیا۔ اس نے دروازہ کھول کر ہاتھ بڑھا کر ٹارچ دینا چاہی۔ رمیش نے بھابی کے ہاتھ کے بجائے کندھے کو پکڑ کر جھٹکے سے کھینچا اور اس سے پہلے کہ وہ چیخ سکے، منہ پر دوسرا ہاتھ رکھ کر اندر داخل ہو کر پلنگ پر گرا کر قابو کر لیا۔ بھابی پلنگ پر ٹانگیں مارتی رہی۔ بڑکی منہ پھاڑے اس منظر کو دیکھ رہی تھی کہ راکیش نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ارہر کے جوان پودوں کے گٹھے کی طرح باندھ کر ڈال دیا۔ بھابی مضبوط بدن والی نئی عمر کی عورت تھی۔ ابھی پچھلے ہی سال

Scanned with CamScanner

شادی ہوئی تھی۔ اسے قابو میں کرنے میں زیادہ وقت لگا کیونکہ ایک ہاتھ سے منہ دبائے رکھنا بھی ضروری تھا۔ اس درمیان اوتار اندھیرے میں کھڑے بیٹے کو تھپکیاں دیتا رہا۔ رمیش نے بھابی کو باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ رمیش کی سانس بھی پھول گئی تھی۔ کچھ تو طاقت آزمانے کی وجہ سے اور کچھ بھابی کے گرم گداز بدن کو دیر تک جکڑے رہنے کی وجہ سے۔ راکیش نے بڑکی کو کندھے پر اناج کی بوری کی طرح ڈالا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ بھابی بھی آنکھیں پھاڑے سارا منظر دیکھتی رہی۔

لالٹین بجھ گئی تھی۔ چاندنی جالی دار کھڑکی سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ بھابی نے دیکھ کر اسے بے قابو کرنے والا ابھی تک کھڑا اسے غور سے دیکھ رہا ہے اور ہولے ہولے ہانپ رہا ہے۔ وہ پیش آنے والے واقعے سے بے بس ہو کر بندھے بندھے تڑپنے لگی۔ اس کی ساڑی گھٹنوں سے اوپر سرک آئی تھی اور مدھم چاندنی میں اس کی پنڈلیاں دیوالی کی موٹی موٹی موم بتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہانپنے کی وجہ سے سینہ تیزی سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ رمیش نے کھڑے کھڑے کچھ سوچا۔ کھڑکی سے جھانک کر راکیش سرگوشی میں باہر سے چلایا، "سبھے جلدی کر۔ کیا کر رہا ہے؟"

"آ رہا ہوں بے!" یہ کہہ کر اس نے یاد کیا کہ وہ تین گھنٹے پہلے ہی اس نے اس بندھی ہوئی عورت کو ماں کہا تھا۔ وہ اس پر جھکا اور اسے چھٹپٹاتا دیکھتا رہا۔ کھڑکی سے ہوا کا ایک جھونکا آیا جس نے نشے کو کچھ ہلکا کیا۔

وہ واپسی کے لیے مڑا۔ پھر کچھ سوچ کر پلٹا اور یہ سوچ کر کہ یہ عورت اس کی بدمعاشیوں کے یار اوتار کی بھابی ہے، اس نے ہاتھ بڑھا کر ساڑی پیروں تک سرکا دی اور نشے کے عالم میں بھی اس بات کا پورا خیال رکھا کہ ساڑی نیچے سرکاتے وقت اس کا ہاتھ گھٹنوں سے پیروں تک مسلسل عورت کے بدن سے رگڑتا ہوا نیچے تک آ سکے۔ اسی انداز سے اس نے اوپر کا پلو بھی سینے پر برابر کیا۔ دروازے سے نکل کر وہ مسکرایا کہ پورا مال نہ سہی کچھ چٹکیاں چونٹیاں تو بین ہی لیں۔

رات بہت اندھیری تھی۔ باہر نکل کر تینوں کمہار کے گھر تک آئے اور اوتار بڑکی کو لے کر اس کے جھونپڑے میں گھس گیا اور دونوں یار اندھیرے میں چھپ کر پہرہ دیتے رہے۔ رمیش دھیمی دھیمی آواز میں راکیش کو بھابی تازہ فتوحات کا واقعہ سناتا رہا جسے سن کر راکیش وحشت وحشت کرتا رہا۔ لیکن جیسے ہی رمیش خاموش ہوتا، راکیش اس کا چہرہ دیکھنے لگتا۔ پھر کیا ہوا؟

اونکار نے زمین پر پڑے پیال پر لڑکی کو ڈال دیا اور اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور اپنے سر سے مڑاسا کھول لیا۔ اندر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے ماچس جلا کر لونڈیا کا بدن غور سے دیکھا۔ اسے کچھ مایوسی سی ہوئی۔ دور سے یہ جتنی جاندار نظر آتی تھی اتنی نگھی نہیں تھی۔ اس نے ماچس دوبارہ جلائی اور اس کے سانولے پیروں اور اُجلے تلووں کو دیکھا۔ پاؤں سانولے تھے اور تلوے اُجلے تھے، لیکن ایڑیوں میں مٹی اور پانی کے مسلسل برتاؤ کی وجہ سے درازیں سی پڑ گئی تھیں۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر اندھیرے میں رانیں ٹٹولیں۔ وہ اتنی سخت نہیں تھیں جتنی وہ سمجھ رہا تھا۔ لڑکی رانوں پر ہاتھ لگنے کی وجہ سے پھڑکنے لگی۔ آنکھوں پر پٹی اور منہ میں کپڑا ہونے کی وجہ سے چہرے کی ہیئت عجیب سی ہو گئی تھی، لیکن اتنی بدہیئت نہیں کہ اونکار کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے۔ وہ بدن پر ہاتھ پڑتے ہی مچھلی کی طرح تڑپتی تھی۔ اونکار نے معائنے کے آخری مرحلے کے طور پر لونڈیا کی گردن کی جڑ سے نیچے کی طرف ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ سینے کے ابھار معمولی تھے۔۔ اس کے ہاتھ پیٹ ہوتے اوپر چڑھ کر پسلیوں کے ڈھانچے پر آ کر رک گئے۔ وہ ایک ایک پسلی کو انگلی سے چھو چھو کر محسوس کرتا اور لونڈیا کے دبلے پن پر افسوس کرتا رہا۔ لڑکی کا بدن گرم تھا اور سانسیں تیز تھیں۔ اس بار اونکار بالکل بیزار نہیں ہو پایا لیکن اتنی محنت، منصوبوں اور جوکھم کے بعد ملنے والے انعام کو اس نے اپنے حق سے کچھ نہیں بلکہ خاص کم محسوس کیا۔ وہ لڑکی سے اس کا بدلہ لینے لگا اور بہت دیر تک اپنے حساب نت نئے طریقوں سے اسے برتتا رہا۔

چھپر کا ٹٹر لگا کر وہ دونوں کھیتوں تک آئے جہاں ایکھ میں موٹرسائیکل چھپا کر رکھی تھی۔ اونکار نے راکیش اور رجیش کو رخصت کیا اور اندازہ کرنے لگا کہ اپنے گاؤں سے ماصاب کے گاؤں جانے اور وہاں سے آنے میں زیادہ سے زیادہ کتنی دیر لگ سکتی ہے۔ اتنا ہی وقت گزار کر وہ گڑھی پہنچنا چاہتا تھا جہاں بھابی بندھی ہوئی اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔

گڑھی میں آ کر بھابی کے کمرے میں پہنچ کر بھابی کو اس حالت میں دیکھ کر اس نے وہ ساری حرکات کیں جو ایسے موقع پر اسے کرنا چاہیے تھیں۔

بھابی منہ کا کپڑا نکلتے ہی رونے لگی۔ جب اس نے پوری بات بتا کر بھی رونا جاری رکھا تو اونکار کو شک ہوا کہ رجیش نے بھابی کے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی ہے۔ بھابی کی گردن کے نیچے اسے نیل کا نشان نظر آیا۔ اس کا سارا نشہ اتر گیا۔ پھر اس نے کرید کرید کر ڈاکوؤں کی حرکتوں

کے بارے میں پوچھا۔ ساجی اسے بڑی مشکل سے یقین دلا پائی کہ اس کی عزت پر آنچ نہیں آ پائی۔

اوتار نے ساجی کو بتایا کہ یہ سب منصوبہ بند سازش تھی۔ یادو ماصاب پر کوئی حملہ نہیں ہوا تھا۔ ان کے گاؤں پہنچنے سے پہلے ہی وہ آدمی راستے میں کسی کام کا بہانہ کر کے دوسرے راستے پر ہو لیا تھا۔ میں بھی ان کے گاؤں تک نہیں گیا تھا، گاؤں کے باہر ہی ماصاب کی خیریت مل گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی اور چکر ہے۔ وہیں سے بھاگا بھاگا آ رہا ہوں۔

اوتار نے محسوس کیا کہ وہ گرچہ سے تو جو سوال بھیاں کو شک ہے۔ لیکن بھابی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

وہ لوگ بڑکی کو بھی اٹھا لے گئے۔ سامنے والی لڑکی کو۔

آخر وہ کون لوگ تھے اور انھوں نے ایسی حرکت کیوں کی؟ گھر میں چوری بھی نہیں ہوئی... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اوتار نے سر پر ہاتھ رکھ کر بھابی کے سامنے نوٹنکی کی۔

صبح سب سے پہلے کمہار کی بیوہ اور چھوٹی بیٹی گاؤں میں داخل ہوئی جنھیں رگھوبیر یادو والے کے ٹیوب ویل کے کمرے سے آزاد کیا تھا۔ ان دونوں نے آ کر بڑکی کو جھونپڑے میں پا کر اوپر والے کا شکر ادا کیا۔

بھابی نے تینوں کو بلا کر پوچھا، یہ سب کیا چکر تھا؟ تینوں آنکھیں پھاڑے بھابی کو دیکھتی رہیں۔

سورج تک پولیس رپورٹ کر دی گئی۔ رپورٹ اوتار نے کی تھی کہ بڑکی کے ہونے والے پتی کے کچھ دوستوں نے یہ سب حرکت کی ہے تاکہ اس کا پتی شادی سے پہلے ہی اس کا استعمال کر سکے۔ واقعات کے تانے بانے اس طرح بٹھائے گئے کہ کیس خاصا جاندار لگنے لگا۔ کم از کم چوکی کے دیوان کا تو یہی خیال تھا۔ اوتار نے موٹر سائیکل کی چوری کی رپورٹ بھی لکھا دی۔ موٹر سائیکل رمیش اور گنیش کی مدد سے پھر ایک گنے کے کھیت میں چھپا دی گئی جو تیسرے دن سویرے برآمد ہو گئی۔ بڑکی کا میڈیکل ہوا جس میں طرح طرح کی ایذا رسانی کے بعد عصمت دری ثابت ہوئی۔ کمہار کی چھوٹی بیٹی کا بھی میڈیکل ہوا، لیکن اس کی رپورٹ ٹھیک آئی جس پر گاؤں والوں نے ڈاکٹروں کی ملی بھگت کا الزام لگایا...

بڑکی کا موسے والا بستی کالج سے آتے وقت گرفتار ہو۔ حوالات سے ہی اس نے اعلان کر دیا کہ اس کی سگائی اب ٹوٹی سمجھی جائے۔ وہ میڈیکل رپورٹ کے بارے میں سن چکا تھا۔ البتہ وہ چھوٹی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے۔ اس نے اپنے ماں باپ کو یہی کہہ کر ڈھارس دی۔ اس کے ماں باپ نے اس کا پیغام کمہار کی بیوہ تک پہنچایا۔

کمہار کی بیوہ کے چھپر کے اندر بڑکی بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ برابر میں اس کی بہن چھٹکی مٹر پاس دولہ کے خیال میں گم، سامنے کھڑے گدھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ماں کچے برتنوں کو احتیاط سے اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے پر جما رہی تھی۔ سامنے گڑھی کے دروازے سے گڑھی کا صحن نظر آ رہا تھا جہاں نیلا کھڑا ہوا اپنے کانوں کی نوکوں کو سورج کی سمت میں ٹیون کر رہا تھا۔ بڑکی اچانک سوچتے سوچتے ہنسنے لگی۔ اس کی بہن نے اسے چونک کے دیکھا۔ 'کیوں ہنسی بڑکی؟'

"بس ایسے ہی۔"

"بتاؤ۔"

"میں سوچ رہی تھی میری سہاگ رات اپنے ہی گھر میں ہو گئی۔"

بڑکی یہ کہہ کر پھر ہنسی۔ چھٹکی یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ سامنے جیپ آ کر رکی اور ممبردار اودل سنگھ اترے۔ تیر کی طرح سیدھے اندر گئے۔ کمرے کے باہر کھڑے ہو کر کھڑکی کے راستے بہو سے تسلی کے کچھ جملے کہے، اونکار کو بلا کر حالات کا درست علم حاصل کیا اور پہرے کے نوکروں کو بلا کر جوتے لگوائے۔ جوتے کھا کر انھوں نے اقرار کیا کہ وہ اس رات اس لیے سو رہے تھے کہ جب سے نیلا بڑا ہوا ہے وہ گڑھی میں چور تو چور پڑوسیوں تک کو نہیں آنے دیتا۔ اسی لیے انھیں کوئی ڈر نہیں تھا کہ نیلے کے ہوتے ہوئے کوئی ایسی ہمت کر سکے گا۔

شہر سے قصبے اور قصبے سے دیہات تک آنے میں اودل سنگھ نے صرف اسی بات پر غور کیا تھا کہ علاقے میں کس کی اتنی مجال ہوئی کہ اس کی گڑھی میں داخل ہو کر ان کی بہو کو باندھ کر پناہ لینے والی لڑکی کو اٹھا لے جائے۔ اس بات پر انھوں نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ نیلے کے ہوتے ہوئے یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی انھوں نے خود کو اندر سے بہت کمزور محسوس کیا۔ کیا نیلا چوکی داری کے کام میں نکما ہو گیا؟ کیا واقعی یہ نکما ہو گیا؟ انھوں نے باہر آ کر نیلے کے پاس کھڑے ہو کر اسے بغور دیکھا۔ وہ ان کا ہاتھ چاٹنے لگا۔ آج اودل سنگھ کو اس پر پیار نہیں آیا۔ اس کی زبان

Scanned with CamScanner

کے کانٹے ان کے ہاتھ میں چبھے۔ انھوں نے اس کا منہ پکڑ کر ایک طرف کر دیا اور اندر آ کر دالان میں خاموش لیٹ گئے۔

اس کا مطلب، اب کوئی بھی گڑھی یا حویلی میں داخل ہو کر کچھ بھی کر سکتا ہے؟ اس کا مطلب، میں اب پہرہ گڑھی اور حویلی کی حفاظت کی پابندی میں پھنس جاؤں گا؟ اس کا مطلب، اس پٹھے کو پالنا بے کار گیا؟

اوتار باپ کو خاموش دیکھ کر ان کے پاس آ گیا اور مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

"یہ کام کمہار کے ملازم کا نہیں ہو سکتا۔" انھوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اوتار سمجھ گیا باپ سوال کر رہا ہے۔ اس نے سمجھتے ہوئے کہا، "پتا جی، مونڈھا ہوا اس کے کسی جاننے والے کا کام ہے۔ وہاں اسی رات کو کمہار کے گھر آ کر کوئی بہت قد کا آدمی ایسی ہمت نہیں کر سکتا۔"

"تم نے رپورٹ کیوں لکھائی؟ میرے آنے کی راہ تو دیکھتے۔"

اوتار چپ رہا۔

"رپورٹ سے بدنامی بھی تو ہوئی۔"

"بدنامی تو نہیں ہوئی۔ کسی کو کسی نے کچھ — مطلب غنڈوں نے کچھ نہیں کیا۔" حالاں کہ وہ اس کی گردن کے نیچے ایک موٹا سا نیل کا نشان دیکھ چکا تھا۔

"بدنامی کی بات نہیں، گدھے! اصل بات یہ ہے کہ لوگ اب گڑھی میں گھسنے سے ڈریں گے نہیں۔ میں ہوتا تو نہ رپورٹ ہوتی، نہ بڑکی کا رشتہ ٹوٹتا۔"

"پھر غنڈوں کا پتا کیسے چلتا؟"

"اب چل گیا پتا؟" انھوں نے غصے سے گھور کر پوچھا۔ تھوڑی دیر بعد اوتار اٹھ گیا۔ اودل سنگھ بے چینی سے کروٹیں بدلتے رہے۔ اچھی خاصی ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ بہو نے رضائی لا کر پائنتی رکھ دی تھی مگر انھوں نے اوڑھی نہیں۔

باہر آ کر دیکھا تو بیلا زمین پر بیٹھا، بھوسے کا ایک چھوٹا سا ڈھیر لگ رہا تھا۔ انھیں بیلے سے اچانک بیزاری سی محسوس ہوئی۔

گڑھی کے دروازے میں بڑکی داخل ہوئی اور سیدھی بہو کے پاس چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد بھو گھونگھٹ کاڑھ کر بڑکی کا ہاتھ پکڑ کر ان کے پاس آئی۔ "یہ کہتی ہے کہ جس آدمی نے اس کی ماں کو جھوٹے حادثے کی خبر دی تھی وہی آدمی گڑھی میں بھی آیا تھا۔ یہ اس کو آواز سے پہچانتی ہے اور جب وہ مجھے باندھ رہا تھا تو اس نے اس کی صورت بھی دیکھی تھی۔"

"کیا اسی نے اس کی عزت لوٹی؟"

"نہیں۔ وہ کوئی اور تھا۔" بھو نے دھیرے سے جواب دیا۔

"اس کا قد کاٹھ؟"

بڑکی نے نظر نیچے کر کے اس آدمی کا حلیہ بتایا اور بتایا کہ اس کے ماتھے پر گھاؤ کے دو نشان تھے۔ بھو نے بھی سر ہلا کر اس کی تصدیق کی۔

"تو نے اس آدمی کو بھی دیکھا جس نے تیرے ساتھ چھیڑ خانی کی تھی؟" اودل سنگھ نے گاؤں کی لڑکی سے ذرا نرم الفاظ استعمال کیے۔

"نہیں بابوجی۔۔ میری آنکھوں پر پٹی تھی۔۔۔" وہ آہستہ آہستہ سسکنے لگی۔ بھو اسے لے کر اپنے کوٹھے میں چلی گئی۔

ٹھاکر اودل سنگھ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ انہیں رہ رہ کر بیلے کے نکمے پن پر تاؤ آ رہا تھا۔

شام کو سورج ڈوبنے کے بعد وہ قصبے کی طرف چلے گئے۔ حویلی میں بھی انہیں ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ صبح ہوتے ہی انھوں نے تھانے دار صاحب کو ناشتے پر بلایا۔ اسے آنے میں دیر ہوئی تو ان سے صبر نہیں ہو سکا۔ املی کے درخت کے نیچے ایک میز اور تین کرسیاں پڑی تھیں۔ تھانے دار نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور پھر ان رجسٹروں کو غور سے پڑھنے لگا جن میں پڑھنے کے لیے کوئی سی چیز نہیں تھی کیوں کہ سارے اندراجات اس نے اپنے ہاتھ سے کیے تھے۔ تھوڑی دیر مصروف رہنے کے بعد اس نے بڑی لگاوٹ سے پوچھا:

"نمبردار جی، کیا پیئیں گے؟ چائے یا کافی؟"

"ہاں چھوڑیے چائے کافی۔۔ آپ ناشتے پر نہیں آئے۔"

تھانے دار نے علاقے کے چوروں، ڈاکوؤں اور غنڈوں کو ماں کی ایک ہی گالی میں باندھتے ہوئے انہیں بتایا کہ پولیس کو کچھ قاعدے کا کام بھی کرنا پڑتا ہے۔

انھوں نے رازداری کے انداز میں تھانے دار کو بتایا کہ جو غنڈے گڑھی میں داخل ہوئے

Scanned with CamScanner

تھے ان میں ایک سے ایک بڑھ کر رحموں کے دو شاہدت تھے۔ وہ کل ملا کر تین تھے لیکن گڑھی میں صرف دو آئے تھے۔ ان کا اصل کام تیسرے نے کیا تھا۔

تھانے دار نے کچھ پرچے درست کرائے۔ بڑے منشی جی کو بلا کر سرگوشیاں کیں۔ ایک دو سپاہیوں کو ہم راز بنایا۔۔۔

آپ شام کو تکلیف کرو تو میں ایسے تین چار لوگوں کو حاضر کر سکتا ہوں۔

شام کو جب وہ دوبارہ تھانے میں آئے تو اس وقت بجلی چلی گئی تھی۔ رکھی بڑی دو لالٹینیں جل رہی تھیں اور ان لالٹینوں کی روشنی میں تین لونڈے ڈنڈے کے سہارے کھڑے تھے۔ تھانے دار نے انھیں بتایا کہ یہ کلام گڑھے والے تاشے والی کے بھائی ہے، یہ رام چندر ستی کا داماد ہے لالو، اور یہ ہے کلو پہلوان کا لونڈا ولو۔ اب آپ پہچانیے۔

مسرور دولہ سنگھ شش و پنج میں پڑ گئے تھے۔ تھانے کے پھاٹک پر لونڈوں کے عزیز رشتہ دار آ کر جمع ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ لوگ قصبے کے مقامی وکیلوں کو لے کر آئے تھے۔ تھانے دار صاحب نے وکیل صاحبان کو کرسیاں پیش کیں۔

اتنے میں حویلی سے نوکر نے آ کر دولہ سنگھ سے کہا کہ انھیں فوراً حویلی میں بلایا گیا ہے۔

وہ فوراً جیپ میں بیٹھ کر حویلی پہنچے۔ وہاں بھی بجلی نہیں تھی۔ بڑے پھاٹک میں داخل ہو کر جیسے ہی صحن میں آئے ایک آدمی نے اندھیرے سے نکل کر ان کے پیر پکڑ لیے۔ وہ اس کی شکل نہیں دیکھ سکے۔

کون ہے؟ ارے کون ہے؟ کیا بات ہے، کیا بیمار ہے کوئی؟

بیٹے کی سمجھو بابا جی۔ صبح سے پولیس دو دفعہ دھونس دے چکی ہے۔

وہ ان کا پیر پکڑے پکڑے وہاں تک آیا جہاں لالٹین جل رہی تھی۔ دولہ سنگھ بھی ڈیڑھ دو قدم سے چلتے ہوئے آئے اور لالٹین کی روشنی میں دیکھا کہ جو آدمی ان کے پیر پکڑے ہوئے تھا اس کے ماتھے پر گھاؤ کے دو نشان واضح تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ تھانے میں پہنچے اور رحموں کے کلام کے بڑے بھائی جمعراتی کی نشان دہی کی کیوں کہ وہ ہم دونوں والے واقعے کے بعد دولہ سنگھ کے پورے خاندان کا دشمن ہو گیا تھا۔ باقی

Scanned with CamScanner

دونوں کو چھوڑ دیا گیا۔ جمعراتی کے وکیل محمد عمر نے جمعراتی کو کونے میں لے جا کر سمجھایا کہ وہ جرم قبول کر لے تاکہ حوالات کی مار سے بچ سکے۔ ضمانت ہو جائے گی۔ پورا معاملہ دو ہزار میں طے ہوا۔

ٹھاکر اودل سنگھ قصبے میں نہیں رکے۔ ان کے چہرے پر سرخی چھلک آئی تھی جیسے کسی گلاس بھر کے تازی پی لی ہو۔ وہ دگڑے پر تیزی سے جیپ چلاتے ہوئے گاؤں پہنچے۔ رات ہو چکی تھی۔ گڑھی کا دروازہ نوکروں نے کھولا۔ سامنے سے نوکر ہٹے تو ان کے پیچھے نیلا کھڑا تھا۔ اودل سنگھ نوکروں کو گالیاں دیتے ہوئے نیلے سے لپٹ گئے۔ وہ ان کی گردن کو پتی کانٹوں والی زبان سے چاٹتا رہا جو اس وقت اودل سنگھ کو پھولوں کی پنکھڑی کی طرح نرم لگ رہی تھی۔

اونکار کو جگایا۔ اسے کوٹھے میں بلایا۔ جب اونکار آدھے گھنٹے بعد باہر نکلا تو پہرے کے نوکروں نے اسے قریب سے دیکھا۔ اس کے گال پر انگلیوں کے پانچ نشان بہت واضح تھے۔ مگر وہ چہرے سے خوش اور مطمئن لگ رہا تھا۔ بلکہ ایک نوکر نے تو آہستہ آہستہ ہنستے ہوئے بھی سنا۔ اونکار کے سینے پر ایک ہلکا سا بوجھ تھا تو گال کے ایک چانٹے میں اتر گیا تھا۔

صبح اٹھ کر اودل سنگھ نے آدھ سیر کھوئے کے چھوٹے پیڑے بنا بنا کر نیلے منہ میں ڈالے اور آدھا سیر سرسوں کا خالص تیل پلایا۔ پیڑے کھا کر اور تیل پی کر وہ اچھلنے لگا اور پھر چلا تو ایسے چلا کہ عام طور پر نیلے اس طرح نہیں چلتے۔

گاؤں کے پرائمری پاٹھ شالا کے بوڑھے ہیڈ ماسٹر نے، جو باقی تین ماسٹروں کا کام بھی خود دیکھتے تھے، اس بات پر حیرت کی کہ نیلا کھویا کھاتا ہے اور سرسوں کا تیل پیتا ہے۔

"اس پرکار کی کھاد سے جنگل کا جانور اندر سے بگڑ جاتا ہے۔"

ٹھاکر اودل سنگھ نے ان کی بات سنی ان سنی کر کے جیپ اسٹارٹ کی اور ڈیزل کا دھواں ہیڈ ماسٹر کے چہرے پر دیر تک ناچتا رہا۔

Scanned with CamScanner

۶

نیلا اب اور زیادہ نکھر گیا تھا۔ اس کا رنگ سیاہ ہو چکا تھا اور سینگ موٹے ہو گئے تھے۔ اب وہ آزادی کے ساتھ بستی کی حدود سے قصبے اور قصبے سے گاؤں تک آپ ہی آپ چلا جاتا تھا۔ راستے میں فصل سے گزرتے ہوئے آتے جاتے منہ مار لیتا تھا۔ فصل بڑی ہو تو زیادہ نقصان نہیں ہوتا تھا لیکن اگر چھوٹے پودے ہوتے تو کھیتوں کی پوری پگ ڈنڈی بن جاتی اور ان حصوں کی فصل بری طرح ماری جاتی۔

کسانوں نے ایک آدھ بار دبی زبان سے شکایت کی۔ اودل سنگھ نے ان کی تالیف قلب کے لیے کہہ دیا کہ میں اسے سمجھا دوں گا۔ جس وقت وہ یہ کہتے انہیں احساس نہ ہوتا کہ وہ ایک جانور کے بارے میں ایسا کہہ رہے ہیں۔ دوسری بات تو یہ تھی کہ جو لوگ یہ سنتے انہیں بھی احساس نہ ہوتا کہ یہ بات ایک جانور کے بارے میں کہی جا رہی ہے۔

دیوالی انہوں نے اپنے خاندان کے ساتھ شہر میں منائی۔ دیوالی کے دوسرے دن رات کو وہ سب اپنی کوٹھی میں بیٹھے تھے۔ اماوس کی رات بالکل اندھیری تھی۔ آسمان پر چھوٹے چھوٹے ستارے چمک رہے تھے۔ کوٹھی کے گیٹ پر کچھ آہٹ ہوئی۔ نوکر نے پاس جا کر دیکھا اور پوچھا:

"کون؟ ... کون ہے؟"

جواب میں بس آواز آئی جیسے کوئی تیز تیز سانسیں لے رہا ہو۔ نوکر ڈر گیا۔ بھاگ کر اندر آیا۔ ہانپتے ہوئے بولا، "باہر کوئی ہے۔ آواز کا جواب نہیں دے رہا ہے۔"

سب کے چہروں پر ملا جلا ڈر پھیل گیا۔ اودل سنگھ اپنے دونوں بیٹوں، بندوقوں اور ٹارچوں کے ساتھ گیٹ پر آئے۔ بندوق کندھے پر رکھ کر گیٹ کھلوایا۔ اندھیرے میں کوئی تیز تیز سانسیں لے رہا تھا۔ ٹارچ جلائی۔ گھپ اندھیرے میں ٹارچ کی مدھم روشنی کا دائرہ اس پر پڑا، جس کا رنگ سیاہ تھا اور جس کے سینگ موٹے تھے۔

"ارے!" سب کو بے حد حیرت ہوئی۔

ٹھاکر اودل سنگھ سوچ میں پڑ گئے۔ نیلے کو شہر کا رستہ تو بتایا ہی نہیں گیا تھا۔ یہ

اپنے آپ کیسے آ گیا؟ پھر بھی انہیں دل ہی دل میں بہت خوشی محسوس ہوئی جیسے بیلے کا یہ کارنامہ ان کی ذاتی کارکردگی ہو۔

"اس کا اس طرح آنا ٹھیک نہیں ہے،" پرتاپ بولا۔ "شہر میں نقصان کرے گا تو مشکل ہو جائے گی..."

"کوئی بات نہیں، اسے سمجھا دیں گے،" اودل سنگھ خوشی سے بولے۔

اونکار نے بھی بیلے کی پیٹھ تھپتھپائی۔

رات بھر نیلا لان کے پھولوں کو کھوندتا رہا اور منی پلانٹ کی بیلوں کو چکھتا رہا۔

صبح سب سے پہلے مالی نے یہ نقشہ دیکھا اور زور زور سے نیلے کو گالیاں دینے لگا۔ اودل سنگھ آنکھیں ملتے باہر آئے اور پھولوں اور بیلوں کا حشر اور مالی کو غصے میں دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اونکار بھی ان کے پیچھے کھڑا ہنس رہا تھا۔ بڑکی کے واقعے کے بعد وہ باپ کی زیادہ ہیرا پھیری کرنے لگا تھا۔ بڑی مشکل سے نیلا قصبے لایا گیا اور پھر قصبے سے دیہات پہنچایا گیا۔

بیڈ ماسٹر صاحب نے جب یہ واقعہ سنا تو انھوں نے بتایا کہ جب پرکرتی کے خلاف کہاں پالن ہوتا ہے تو بچے کی آکرتی بگڑ جاتی ہے اور کچھ ایسی شکتیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو جانوروں میں پیدائشی طور نہیں ہوتیں۔

معلوم نہیں یہ بات کہاں تک صحیح تھی، لیکن اتنا ضرور تھا کہ نیلے سے اب مویشی بھی ڈرنے لگے تھے۔ سانی کھاتے بیل اسے دیکھ کر رسیاں تڑانے لگتے اور تھان پر بندھے گھوڑے اسے پاس آتا دیکھ کر بجائے اس کے کہ اگلے پیر اٹھا کر حملہ کریں، پچھلے پیر اٹھا اٹھا کر کودنے لگتے تھے۔ گاڑی کے سامنے بندھے کمہار کے گدھے تو اسے دیکھتے ہی ایک دوسرے کے پیٹ کے نیچے گھسنے لگتے تھے۔ وہ ان سب سے بے نیاز، اینٹھتا اکڑتا، اپنے راستے چلتا رہتا۔ اپنے راستے چلنے سے مراد یہ کہ پڑوس کے گھروں میں گھس کر برتن بھانڈے توڑتا، پاٹھ شالا میں جا کر بیڈ ماسٹر صاحب کی کرسی الٹ دیتا اور ننھے ننھے بچوں کو سینگوں سے ریت دھکیلتا رہتا... وہ اب تک آٹھ بچوں کو زخمی کر چکا تھا۔ ٹھاکر نے ان بچوں کے والدین کو بھری پنچایت میں سمجھایا کہ یہی آٹھ بچے نیلے کو پتھر مار مار کر پریشان کرتے ہیں، ورنہ ڈیڑھ سو بچوں میں صرف انہیں آٹھ کو کیوں پسند کرتا؟ باقی بچوں کے والدین نے اپنے اپنے نیک بچوں کا خیال کر کے اطمینان کا سانس لیا اور ان آٹھ بچوں کے والدین کو دیر تک

Scanned with CamScanner

سمجھاتے رہے کہ بے زبان پشو کو چھیڑنا کتنی بری بات ہے۔

نیلے نے ایک دن صبح ہی صبح ہرا چارا کھا کر سرسوں کا تیل پیا۔ ٹھاکر نے آج اسے مونگ پھلی کے دانے بھی دو مٹھی بھر کے کھلائے۔ نیلا چھٹا ہوا گڑھی کے دروازے کے باہر گیا۔ تھوڑی دیر میں شور مچا کہ نیلے نے کھیتوں میں گھاس کی کٹائی کرتی بھیکو کی جوان بہو کی آنتیں ایک ہی ٹکر میں باہر نکال دی ہیں۔ ٹھاکر جیپ میں بھیکو کی بہو کو ڈال کر فوراً شہر کے اسپتال پہنچے۔ آپریشن کر کے دو ہفتے بعد جب گاؤں لائے تو گاؤں والوں نے تیسرے دن پنچایت کا نیوتا دیا۔

اودل سنگھ بھی پنچایت میں موجود تھے۔ پچھلے دو دنوں سے وہ گاؤں کے واحد مندر کے پجاری کے پاس رات کو دیر تک بیٹھے رہے تھے۔

پنچایت میں پنچوں کے پاس ٹھاکر بھی کرسی پر جمے بیٹھے رہے، لیکن انھوں نے سر جھکا رکھا تھا۔ بھیکو کے لونڈے نے بڑی تیز آواز میں نیلے کی شکایت کی تھی اور پنچوں سے کہا تھا کہ اسے جنگل میں چھوڑنے کا درست پربندھ کیا جائے۔

اودل سنگھ کچھ دنوں سے محسوس کر رہے تھے کہ کچھ برادریاں ان سے خاص طور پر بہت جلنے لگی ہیں۔ بھیکو کی برادری بھی ان میں سے ہی تھی۔ لیکن اس وقت وہ چپ رہے۔ مندر کے پجاری بھی آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ انھیں دیکھ کر پنچوں نے اور کئی لوگوں نے کھڑے ہو کر ڈنڈوت کی۔ وہ پجاری جی کو برگد کے کھمبے سے ہی بڑے مونڈھے پر بٹھایا۔

سرپنچ ادھیکاری لال کو اودل سنگھ نے ہی سرپنچ بنوایا تھا۔ وہ اس وقت بڑے شش و پنج میں تھا۔ فیصلہ کرنے سے پہلے اس نے پنچوں سے کچھ مشورہ کیا۔ پھر تھوڑی شرمندگی اور کھسیاہٹ کے ساتھ اس نے اودل سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "سردار، آپ تو جانتے ہی ہیں ہم سب لوگ آپ کے جانور سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ پر اب اس کا کچھ پربندھ کرنا آپ بھی ضروری سمجھتے ہوں گے، کیوں کہ پچھلے مہینے اس نے اسکول کے آٹھ بچے زخمی کیے اور بھیکو کی بہو کا پیٹ پھاڑ دیا... آپ اس بارے میں کیا وچار رکھتے ہیں؟"

وہ گرمی کا آسمان تھا اور گرمی کا آسمان نیلا ہوتا ہے۔ وہ ایسا موسم تھا کہ جاڑا تیز ہونا شروع ہوتا ہے، اس لیے اس موسم میں جاڑا تیز ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ سب بڑے برگد کے نیچے بیٹھے تھے کیوں کہ اتنی بڑی پنچایت کے لیے گھر چھوٹا پڑتا تھا۔ برگد پر بہت سے پرندے بیٹھے تھے اور

بہت شور مچا رہے تھے کیوں کہ پرندے برگد پر بہت شور مچاتے ہیں۔ ٹھاکر خاموش تھے، کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ کبھی کبھی خاموش رہنا بولنے سے زیادہ چیختا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ سر جھکائے بیٹھے تھے، کیوں کہ اس پوز کے بھی کچھ خاص فائدے ہیں۔ اس وقت اچانک پنچوں نے بولنا بند کر دیا... سارے میں سناٹا چھا گیا...

جب اودل سنگھ نے محسوس کر لیا کہ اب سناٹا اتنا گہرا ہو گیا ہے کہ ایک دھیما سا بول بھی اسے کتر کے پھونک دے تو انھوں نے مضبوط اور دکھی لہجے میں فیصلہ کن انداز میں کہا:

"میں تو صرف پشو کی سیوا کرنا اپنا دھرم سمجھتا تھا۔ پر آپ لوگ اگر آدیش دو تو میں اسے ابھی ابھی گولی مار دوں" وہ رک کر بڑی زور سے چلائے، "رام دین! بندوق اٹھا کر لا۔ ایل جی کے چار کارتوس بھی۔" پوری پنچایت کانپ اٹھی۔ پنچوں کے سر اپنی اپنی گود میں چلے گئے۔ اس سے پہلے کہ سناٹا پھر چھا جائے، ایک کڑک دار آواز ابھری:

"کیا بکتا ہے مورکھ! گئو بدھ کا شراپ گاؤں پر ڈالے گا؟"

یہ پجاری کی آواز تھی جو مونڈھے سے کھڑے ہو کر غصے سے کانپ رہے تھے۔ انھوں نے سرتیوں سے ثابت کیا کہ نیلا بھی دراصل گئوماتا کے خاندان کا جانور ہے۔ اس کی ٹانگیں، اس کے کھر، اس کے سینگ، سب ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے گائے کے۔ انھوں نے بتایا کہ اگر گئو بدھ ہوا تو گاؤں میں پہلے تو ہیضے کی وبا آئے گی جو خاص طور سے گود کے بچوں کو چن چن کر لے جائے گی۔ (ماؤں نے ننھے ننھے بچوں کو سینے سے لپٹا لیا۔) پھر تیز موسلا دھار بارش ہوگی اور کھیتوں کے پودے جڑ سمیت نکل کر اس سیلاب میں بہہ جائیں گے۔ (مردوں نے اچک اچک کر اپنے کھیتوں کی اور دیکھا۔) پھر آندھیاں آئیں گی اور درخت یعنی برگد جیسے بڑے درخت بھی اپنی جٹاؤں کو سمیٹ کر دھرتی سے نکل کر زمین پر بچھ جائیں گے۔ (پوری پنچایت نے سہمے سہمے انداز سے برگد کے درخت کی طرف دیکھا۔) پھر رات کو بے تال آئیں گے اور گئو بدھ کرنے والوں کے گلے میں دانت گاڑ کر سارا رکت پی جائیں گے۔ (پوری پنچایت نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیر کر ہاتھوں کو دیکھا۔ خون کا نشان نہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔) اب بول... کون کرے گا گئو بدھ؟ اودل سنگھ! آخر تو سارے گاؤں پر یہ آفت کیوں ڈالنا چاہتا ہے؟ بول!"

نمبردار اودل سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر بنتی کی۔ "مہاراج! میں پنچوں کے آدیش کا سیوک ہوں۔

Scanned with CamScanner

میں گاؤں بھر کی بات سے الگ نہیں جا سکتا۔

مہاراج، جو تب تک گمچھ کو پڑھ چکے تھے، چیخ کر بولے:

گاؤں میں کون ہے جو نیلے کو مارنے کی بات کہہ رہا ہے؟

سناٹا چھا گیا۔

مارنے کی بات نہیں، مہاراج جی۔ ہم کہتے ہیں کہ اسے جنگل میں چھوڑ دیا جائے... بھیکو کا لونڈا کھڑا ہو کر کسمسایا۔

جنگل میں چھوڑ دیا جائے؟ یہاں جنگل کہاں ہیں؟ میدان ہی میدان ہیں۔ اگر کسی غصیلے نے پہلے پہلائے نیلے کو گولی مار دی تو ہتھیا کی ذمے داری گاؤں پر سے ہٹ جائے گی کیا؟ بولو.. جواب دو!"

ٹھاکر اودل سنگھ سر جھکائے حساب لگاتے رہے کہ پجاری جی نہ صرف یہ کہ مشورے کے مطابق خیالات دہرا رہے ہیں بلکہ تقریباً انھیں لفظوں میں جن کی ریہرسل پچھلی دو راتوں سے ہو رہی تھی۔

میدان میں کتنے جنگلی نیلے بھاگتے رہتے ہیں، کبھی اس کھیت میں کبھی اس کھیت میں۔ کبھی اس کا گیہوں چکھا کبھی اس کی ارہر پر منھ مارا۔ ان میں سے کسی کو تم نے مارا؟ جواب دو؟"

للکار تو دیتے ہیں، بھگا تو دیتے ہیں.. بھیکو کا لونڈا آسانی سے ہار نہیں مان رہا تھا، حالاں کہ زور ٹوٹ رہا تھا۔

تو اسے بھی للکار دیا کرو۔ یہ تو انسانوں میں پلا ہے۔ للکار فوراً سمجھ لے گا...

نیلا گڑھی کے دروازے سے منھ نکالے پنچایت کا منظر دیکھ رہا تھا۔ پجاری نے اسے ایک نظر دیکھ کر رام لیلا والے انداز میں کہا:

بے زبان پشو نے دور سے منش کو دیکھا اور اپنے بارے میں ان کی زبان سے مدد کی بات سن کر ڈر سے کہہ رہا ہے بھگوان! میں کہاں آ پھنسا ہوں؟ ہے بھگوان! میں کہاں آ پھنسا ہوں؟ ہے بھگوان! میں کہاں آ پھنسا ہوں؟"

پوری پنچایت نے کھڑے ہو کر گڑھی کے دروازے سے سر نکالے نیلے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس بات کا پورا یقین کیا کہ نیلے نے ابھی ابھی آسمان کی طرف دیکھ کر ایشور سے ہی

Scanned with CamScanner

بات کہی ہے۔ سب کے من بھاری ہو گئے اور سر لٹک کر سینے پر آ گئے۔

اودل سنگھ نے دل ہی دل میں پجاری کو داد دی کہ یہ آخری ٹکڑا مشورے کے مطابق نہ ہونے کے باوجود بڑا اثردار تھا۔

پنچوں نے تھوڑی دیر بعد اپنا فیصلہ سنایا۔

"سبھی لوگوں سے بنتی ہے کہ نیلے گاے کو کچھ نہ کچھ کھلاتے رہنا چاہیے۔ جب بھی وہ ان کے پاس سے گزرے تو اسے کچھ کھانے کو دے دیں۔ اگر وہ سینگ سامنے کر کے آئے تو اسے للکار کر ایک طرف ہٹ جائیں۔ گئوبدھ کے بارے میں کوئی بات دھیان میں نہ لائیں۔ اس سے شراپ لگتا ہے..."

پنچایت جب اٹھی تو سبھی لوگ اودل سنگھ کے شکرگزار تھے جنھوں نے آج نیلے کو گئو شمار کر سارے گاؤں کو مختلف آفتوں سے بچا لیا تھا۔ ٹھاکر سر جھکائے سب کا دھنیہ واد خاکساری کے انداز میں قبول کرتے رہے۔ بھیکو کا لونڈا جب پنچایت سے اٹھا تو اس کا دل مطمئن نہیں تھا، مگر وہ بے بس تھا۔ اسے لگا جیسے اندر ہی اندر کوئی نم لکیر دماغ سے آنکھوں تک کھنچ گئی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر اپنے گھر کی طرف چلا جہاں اس کی بیوی پیٹ پر پٹیاں باندھے چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر گردن موڑ کر اسے دیکھنا چاہا تو پیٹ کے ٹانکوں میں کھلی سی دوڑ گئی۔ اس کا سر دھم سے چارپائی پر آ رہا اور وہ ہولے ہولے سسک سسک کر کانپنے لگی۔ مگر اس حالت میں بھی اس نے محسوس کیا کہ اس کے پتی کی چال سے یہ لگ رہا ہے جیسے پنچایت سے واپسی پر شیفو حجام نے اس کے پتی کو کسی چھپر تلے گرا کر بدھیا کر دیا ہو۔

۷

نیلے کی قصبے والی واردات زیادہ گمبھیر تھی۔

اس واردات کا تعلق بھی دیہات سے ہی تھا، بلکہ شاید جنگل سے تھا... یا ممکن ہے دونوں سے ہو۔ ایک دن جب سورج کچھ اوپر چڑھ آیا تھا اور ہوا میں گرمی آ چکی تھی تو نیلے نے گڑھی سے

Scanned with CamScanner

نکل کر کھیتوں کا رخ کیا۔ کھیت ویران پڑے تھے۔ گیہوں کاٹ کر دئیں جلا کر اور تھریشر کی مدد سے بوروں میں بند ہو کر کھلیانوں میں آ چکا تھا۔ کھیتوں کے پاس پہنچ کر نیلے نے زمین پر منہ مارا۔ گیہوں کے سوکھے پودے، جو ادھر اُدھر پڑے رہ گئے تھے، بہت بے مزہ محسوس ہوئے۔ اس نے بیزاری کے ساتھ سامنے میدان کی طرف دیکھا۔ سامنے اس کے ہم جنس کھڑے تھے۔ اس نے انہیں پہلی بار نہیں دیکھا تھا۔ ایک دفعہ، دو موسم پہلے، وہ دو تین گھنٹوں کے لیے ان میں رہ بھی آیا تھا، لیکن ان کی وحشت کا ساتھ نہیں دے پایا تھا۔ داڑھی والے سیاہ نیلے نے اسے دیکھ کر سینگ آگے کر کے چنوتی بھی دی تھی، مگر وہ اس سے محفوظ فاصلے پر کھڑا رہا تھا۔ بھوری ماداؤں نے اسے پہلے حیرت، پھر خوشی، پھر شوق کی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس نے بھی ان میں کشش محسوس کی تھی۔ اچانک پیچھے سے کھیت والوں نے چلاچلا کر روندنا شروع کر دیا تھا۔ داڑھی والا سیاہ نیلا زمین پر اچھلا تھا اور ماداؤں کے پیچھے تیزی سے دوڑنے لگا تھا جو اس سے بھی پہلے کان ہلا ہلا کر اور دُم گھما گھما کر خطرے کا اعلان کرتے بھاگ چکی تھیں۔ نیلا اضطراری طور پر ان کے پیچھے بھاگا تھا۔ وہ پوری طاقت سے دوڑ رہا تھا مگر ان کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ اسے اتنا دوڑنے کی عادت بھی نہیں تھی۔ در اصل اسے دوڑنے کی ہی عادت نہیں رہ گئی تھی۔ دوڑنے کی عادت ختم ہو جائے تو بدن کی چربی گھٹتی نہیں، گانٹھ بن کر رگ پٹھوں میں سما جاتی ہے، اور بھاگنا تو ایک طرف چلنے میں بھی رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اتنی باریکیاں وہ شاید نہیں سمجھ پایا تھا لیکن اتنا وہ یقیناً سمجھ گیا تھا کہ ان بھوری، دبلی اور چلبلی ماداؤں اور سیاہ داڑھی والے کے ساتھ ساتھ دوڑنا اس کے بس کی بات نہیں۔ وہ ایک کھیت میں اچانک رک گیا۔ دوڑتے ہوئے ہانپتے اس کے پاس جا کر اسے پچکار کر اپنے ساتھ گڑھی میں لے آئے جہاں اودل سنگھ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اودل سنگھ نے اسے گڑ کھلایا اور سرسوں کا تیل پلایا، تب گانٹھوں کا درد کم ہوا۔ اس دن کے بعد سے اس نے متعدد بار اپنے ہم جنسوں کو دیکھا لیکن کبھی یہ خواہش نہیں ہوئی کہ ان کے پیچھے بھاگے۔ بس دل چاہتا تھا کہ دو تین بھوری مادائیں اس کے ساتھ بھی گڑھی اور حویلی میں ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔

آج وہ ایک ٹک ان کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ داڑھی والا کالا اور مادائیں اس کی طرف منہ کر کے ساکت کھڑے تھے۔ وہ گڑھی اور دیہات سے بہت دور، کھیتوں کو پار کر کے میدانوں میں آ گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ غیر ارادی طور پر ان کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ان سے تین چار کھیت دور تھا کہ

Scanned with CamScanner

اچانک رک گیا۔ ان ہم جنسوں کے پیچھے کوئی آدمی ہاتھ میں ایک لمبی چیز اٹھائے چپکے چپکے ٹیوب ویل کی اوٹ میں چھپتا چھپتا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ نیلا چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمیوں کے درمیان پلا تھا، اسے آدمیوں سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مادائیں ایک ایک قدم کر کے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ کالا داڑھی والا سب سے پیچھے رہ گیا تھا۔ اچانک وہ آدمی سیدھا کھڑا ہوا اور لمبی سی چیز کالے داڑھی والے کی طرف کر کے زوردار دھماکا کیا۔ کالا داڑھی والا، بھوری مادائیں اور خود وہ، سب کے سب زمین سے ایک ایک ہاتھ اوپر اچھلے۔ کالا داڑھی والا وہیں گر پڑا اور اگلی ٹانگوں سے اٹھنے کی کوشش کی کہ ایک اور دھماکا ہوا اور وہ زمین پر گر کر ڈل کر ڈکرانے لگا۔ بھوری مادائیں کنوتیاں بدل کر دم گھماتی ہوئی تیزی سے بھاگیں اور حدِ نظر تک دوڑتی چلی گئیں، گم ہو گئیں۔۔۔ اس نے دیکھا کہ کالے داڑھی والے کے بدن سے لال لال خون نکل کر زمین میں جذب ہو رہا ہے۔ وہ یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہیں اضطراری طور پر زمین پر پیر مارنے لگا۔ دو چار آدمی اس پہلے والے آدمی کے پاس بھاگتے ہوئے آئے اور جیپ لا کر داڑھی والے کو اس میں ڈال کر ڈھول اٹھانے چلے گئے۔ جس وقت وہ اسے جیپ میں ڈال رہے تھے تو اس کی تھوتھنی اور پچھلی ٹانگیں زمین سے ٹکرا ٹکرا کر گھسٹ رہی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ ڈکرا ڈکرا کر ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اس کی بے بسی کا یہ منظر دیکھ کر نیلا گھبرا کر پیچھے مڑ کر کے جو بھاگا تو گڑھی میں آ کر رکا اور پھر ٹھاکر اودل سنگھ کی چارپائی کے پاس کھڑے ہو کر خود کو دوبارہ محفوظ خیال کر کے اینڈنے لگا۔

دوسرے دن اودل سنگھ نے ونکار کو بتایا کہ پینٹن کمپنی والے گورے نے کل میدان میں سے ایک نیلا مارا جس پر فیکٹری کے لوگوں نے بہت لے دے کی۔ بڑی مشکل سے پولیس کو دے دلا کر معاملہ ٹالا گیا۔ اس دن کے بعد سے اس نے کبھی جنگل میں ماداؤں کے پاس جانے کی خواہش تک نہیں کی۔ کسی کسی وقت وہ کھوئی خواہش اس کے سر سے شروع ہو کر ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی اس کی ٹانگوں کے درمیان پہنچتی تھی تو اسے کالے داڑھی والے کی گھسٹتی ہوئی ٹانگیں اور تھرتھراتی ہوئی تھوتھنی یاد آ جاتی۔۔۔ وہ سنسناہٹ ٹانگوں کے بیچ سے ریڑھ کی ہڈی سے گزرتی ہوئی واپس سر میں چلی جاتی۔

ٹھاکر اودل سنگھ، قصے کی واردات والے دن، محمود صاحب کی بیٹی کی شادی کے نیوتے میں گئے ہوئے تھے۔ نیلا بھی ان کے ساتھ ہو لیا تھا۔ محمود صاحب کی حویلی کے پاس میدان میں بڑا سا

Scanned with CamScanner

رنگین شامیانہ لگا تھا اور چاروں طرف موٹریں اور تانگے کھڑے تھے۔ شاید بڑے قصبے کی دعوت تھی۔ نمبردار جیپ پر تھے اور آہستہ آہستہ چلا رہے تھے کیوں کہ نیلا بھی ان کے ساتھ ساتھ ڈلکی میں چل رہا تھا۔ شامیانے کے باہر محمود صاحب نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نمبردار نے ہاتھ جوڑ کر مبارک باد دی۔ تھوڑی دیر بعد بڑے قاضی صاحب نے خطبہ پڑھا کر ایجاب و قبول کرایا۔ دولہا نے اٹھ کر سہرے سے منھ نکال کر سب کو سلام کیا۔ مبارک بادیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ٹھاکر صاحب نے مرغ کا سالن اور دوسروں کی نظر بچا کر بڑے کے کباب کھائے۔ انھیں باراتیوں کے ساتھ ہی بٹھا دیا گیا تھا حالاں کہ وہ منع کرتے رہے کہ میں تو لڑکی والا ہوں۔ رخصت ہوتے وقت انھوں نے بٹوے سے ۵۰۱ روپے نکال کر محمود صاحب کو مخاطب کر کے پیش کیے اور ہاتھ جوڑ دیے۔ محمود صاحب نے اس کی کیا ضرورت تھی! کہہ کر لفافہ شیروانی کی جیب میں رکھا۔ ایک نوجوان باراتی سہرا پڑھ رہا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے دیکھا کہ محمود صاحب کا بڑا لڑکا شامیانے کے باہر کھڑے نیلے کو گڑ کھلا رہا تھا۔ وہ اس تواضع سے خوش ہوئے۔ واپسی کی اجازت لے کر وہ رخصت ہوئے۔ نیلا ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ بارات کے بہت سے لوگ بھی نیلے کو دیکھنے کی چاہ میں شامیانے سے باہر آگئے تھے۔ ٹھاکر صاحب نمبردار کے ساتھ جیپ میں بیٹھے۔ نیلا ڈلکی چلنے لگا۔ راستے میں ایک موڑ کاٹ کر انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نیلا رک گیا تھا اور کالی داس کے پاس طویلے میں ایک گائے کو گری ہوتا دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور تیزی سے بھاگتا ہوا جیپ سے بھی آگے نکل گیا اور راستے میں ملنے والے ہر خوانچے کو کھدیڑتا، ہر آدمی کو ریلتا، ہر دکان کو سینگوں سے دھکیلتا، حویلی کی طرف بھاگا۔ راستے میں اس نے اڈے کی مسجد سے نکلتے ہوئے بڈھے ملاجی پر کاری وار کیا۔ وہ جا کر سامنے کی پکی دوکان کے چبوترے سے ٹکرائے اور سر کی چوٹ کھا کر وہیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہونے لگے۔ ٹھاکر تیزی سے حویلی میں آئے اور جیپ کھڑی کر کے دوبارہ وہاں واپس آئے جہاں سیکڑوں آدمیوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ کیوں کہ اس دن محمود صاحب کی لڑکی کی شادی تھی اور محمود صاحب ٹھاکر ہودن سنگھ کے پرانے مخالف تھے، اور کیوں کہ نیلے کے شکار ہونے والے مذہبی تھے، اور کیوں کہ قصبے میں بہت دن سے کچھ ہوا بھی نہیں تھا، اس لیے معاملہ اسی جلدی مذہبی رنگ میں رنگا کہ ہودن سنگھ نمبردار کو کسی تیاری کا موقع ہی نہیں ملا۔

محمود صاحب کے باراتی بھی بازار میں آگئے تھے۔ ان کے سامنے محمود صاحب نے سبکی

محسوس کی کہ قصبے میں ان کے ہوتے ہوئے وہاں سنگھ کا بیلا ایک مسلمان، وہ بھی مسجد کے موذن، کو یوں مار جائے۔ تھوڑی دیر بعد نعرے لگنا شروع ہو گئے: "جان کا بدلہ جان سے۔ خون کا بدلہ خون سے۔" وغیرہ۔ اب ادھر بھی بھیڑ کی تیاری ہوئی۔ اونکار سے راکیش اور رمیش کو ساتوں محلوں میں دوڑایا۔ بھیڑ چیرتا ہوا، ڈنڈا ہلاتا ہوا تھانے کا انچارج وردی پہنے آیا اور ملاجی کو جیپ میں لدوا کر شہر کے ہسپتال بھیج دیا گیا۔ بھیڑ جذبات میں بے قابو ہو رہی تھی۔ تھانے دار نے مشورہ دیا کہ تھانے چلے چلیے۔ آپ کے لیے اور میرے لیے وہی زیادہ محفوظ جگہ ہے۔ ٹھاکر دوال سنگھ جب تھانے تک بہ حفاظت آ گئے اور تھانے دار کے داہنی طرف والی کرسی پر محمود صاحب کے مقابل بیٹھ گئے تو ان کے ذہن کی بیٹری نے دوبارہ کام کرنا شروع کیا۔ محمود صاحب کا اصرار تھا کہ فوراً دفعہ ۳۰۲ کی رپورٹ لکھی جائے۔ ٹھاکر خاموش بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔ کبھی کبھی منہ اٹھا کر تھانے کے پھاٹک کے باہر کھڑی بھیڑ کو بھی دیکھ لیتے۔ آہستہ آہستہ ان کے آدمی بھی بھیڑ کا حصہ بنتے جا رہے تھے... پھر انھوں نے پرتاپ اور اونکار کو دیکھا جو اپنے ہم عمر لونڈوں کے ساتھ ایک الگ گوشے میں کھڑے تھے۔ پھر انھوں نے تھانہ انچارج کو دیکھا جو ابھی ابھی تبدیل ہو کر آیا تھا اور وائرلیس پر ایس پی سے کہہ رہا تھا کہ پولیس ہیڈکوارٹر سے کچھ کمک بھیج دی جائے، حالات بے قابو ہو سکتے ہیں... پھر انھوں نے محمود صاحب کو دیکھا جن کی جیب میں ان کے ۵۰۰۱ روپے ابھی بھی پڑے ہوں گے۔ پھر انھوں نے سوچا کہ رام دین تو تھوڑی دیر میں نیلے کو دیہات کی گڑھی میں جا کر چھوڑ آیا ہو گا۔ پھر انھوں نے بہ آوازِ بلند محمود صاحب سے کہا:

"محمود میاں، میرے دونوں لڑکے بھی یہیں ہیں۔ آپ بھی ذرا اپنے صاحب زادے کو بلا لیجیے تاکہ آپ کو یہ شکایت نہ رہے کہ میرے بیٹوں کو تو میرے ساتھ تھانے میں آنے دیا گیا اور آپ کو محروم رکھا گیا..."

محمود صاحب اس سخاوت کا مطلب نہیں سمجھے، لیکن انھوں نے جلدی جلدی آوازیں دے کر بیٹے کو تھانے میں بھیجنے کے لیے کچھ لوگوں کو ہدایتیں دیں۔ ان کا بڑا بیٹا بھیڑ میں ہی موجود تھا، آ کر ان کے پاس خاموش کھڑا ہو گیا۔

ٹھاکر صاحب نے انچارج کے کان کے پاس جا کر کچھ سرگوشی کی۔ انچارج کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ٹھاکر صاحب نے اس کے منہ کو دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ اب ان کے

Scanned with CamScanner

چہرے پر ان کا پرانا اعتماد لوٹ آیا تھا، کیوں کہ تھانہ انچارج کا منہ ابھی بھی اتنا کھلا ہوا تھا کہ اندر سے پان میں رنگی داڑھیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

"محمود میاں!" ٹھاکر صاحب نرمی سے بولے۔ "آج آپ کی بیٹی کی شادی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کی تقریب میں کوئی بدمزگی ہو...

محمود میاں اور ان کا بیٹا دونوں اس جملے کا مطلب نہیں سمجھے۔ ٹھاکر نے ان کی اس نافہمی کا لطف لیا اور ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولے، "آج آپ نے شادی میں بلا کر مجھ سے اپنا سیاسی بدلہ لینے کے لیے، مجھے بدنام کرنے کے لیے، میرے بیٹے کو دھتورا کھلوایا۔ آپ کے بیٹے نے اپنے ہاتھ سے دھتورا کھلایا... سیکڑوں آدمی اس بات کے گواہ ہیں۔ کیوں میاں، تم نے نیلے کو کچھ کھلایا تھا کہ نہیں؟"

محمود صاحب کا بیٹا حیران رہ گیا۔

"میں نے تو گڑ کھلایا تھا...

"کون یقین کرے گا کہ آپ میرے جانور سے اتنی محبت کر سکتے ہیں؟ آپ تو اس وقت میری عزت کے دشمن ہو رہے ہیں۔"

بازی پلٹتی دیکھ کر محمود میاں کا رنگ فق ہو گیا۔ لیکن انھوں نے پڑھے لکھوں والا ایک پینترا اچھالا۔

"نیلے کا میڈیکل چیک اپ کروا کر دیکھیں گے۔"

ٹھاکر صاحب ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک کونے میں لے گئے۔ بھیڑ مدہوش کھڑی دیکھتی رہی۔ انچارج دارنیس پر ملاجی کی خیریت معلوم کرتا رہا..

ٹھاکر صاحب نے محمود صاحب سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا، "نیلا گڑھی پہنچ چکا ہے اور اب تک اسے برائے نام ہی سہی لیکن اتنا دھتورا کھلایا جا چکا ہو گا کہ میڈیکل رپورٹ میں آ جائے۔ کوئی اس بات کا یقین نہیں کرے گا کہ میں نے اسے دھتورا کھلایا ہے، کیوں کہ قصبے کی آدھی آبادی اور آپ کی پوری بارات نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آپ کے صاحب زادے نے اسے گڑ میں ملا ملا کر خوب دھتورا کھلایا۔ اب جب آپ بہتر سمجھیں، میں تو بہرحال آپ کا شبھ چنتک ہوں۔ میں نہیں چاہوں گا کہ جس بہن کی آج رخصتی ہو رہی ہے اس کے بھائی کو حوالات

Scanned with CamScanner

میں بٹھا کر سوالات کیے جائیں...."

محمود میاں کی سمجھ کام نہیں کر رہی تھی۔ آج بہت عمدہ موقع ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ بیٹے کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس کم بخت نیلے کو گڑ کھلانے، اور وہ بھی سب کے سامنے کھلائے!

ٹھاکر صاحب کرسی کی پشت سے پوری پیٹھ لگائے اطمینان کے ساتھ تنے بیٹھے تھے۔ اس طرح بیٹھ کر جو بات کہی جائے اس میں بڑا وزن پیدا ہو جاتا ہے۔

انچارج نے موقعے کو بڑی جلدی پڑھا اور محمود صاحب سے کہا۔ "۳۰۲ کی رپورٹ تب تک نہیں لکھی جا سکتی جب تک موت واقع نہ ہو جائے۔ ۳۰۷ کی رپورٹ لکھی جا سکتی ہے لیکن کون لکھوائے گا؟ میں اپنی طرف سے کیس کو تبھی درج کروں گا جب مجھے یہ علم ہو جائے کہ مارنے والا کون تھا اور اس کی ولدیت کیا تھی۔ ٹھاکر صاحب تو کہتے ہیں کہ اس نیلے سے ان کا اتنا ہی سمبندھ ہے کہ وہ ان کی گڑھی میں حویلی میں آجاتا ہے تو وہ اسے کھانا دے دیتے ہیں۔ وہ اسے اپنا پالتو ماننے کو تیار نہیں ہیں...."

"یہ سچ بھی ہے،" ٹھاکر اودل سنگھ مضبوط لہجے میں بولے۔ "نہ تو اس کی گردن میں میرا پٹا ہے نہ اسے پالنے کا کوئی نمبری لائسنس میرے پاس ہے!"

"تو اسے گولی سے اڑا دیجیے!" محمود صاحب کا بیٹا جوش میں چلایا۔

"ضرور اڑا دیجیے۔ لیکن قصبے کی آدھی آبادی آپ کی دشمن ہو جائے گی کہ یہ گئو ہتیا ہو گی۔ میری طرف سے کوئی انکار نہیں ہے، لیکن آپ کو بتا سمجھا کر کہہ رہا ہوں" ٹھاکر صاحب اب ماہر شہسوار کی طرح دلکی چل رہے تھے۔

اب انچارج نے اپنی باری سنبھالی۔

"اہم بات یہ ہے کہ ملاجی کی اصل چوٹ سر کی چوٹ ہے جو دکان کے چبوترے سے ٹکرانے کی وجہ سے لگی۔ پیٹھ پر تو نیلے کا معمولی دھکا لگا تھا.."

"کیا وہ جان بوجھ کر دکان کے چبوترے سے ٹکرائے تھے؟" محمود صاحب کا لڑکا بولا۔

"نہیں.." انچارج رسان سے گویا ہوا۔ "لیکن فوجداری عدالت میں اس قسم کی باریکیاں بہت اہم رول ادا کرتی ہیں... پھر نیلے پر مقدمہ کیسے چلایا جا سکتا ہے جب کہ ٹھاکر صاحب اسے اپنا پالتو ماننے پر راضی ہی نہیں ہیں.."

والا! لڑکی اور حویلی کی حفاظت کرے تو پالتو اور کہیں غلط حرکت کر جائے تو غیر
محمود صاحب کا لڑکا بہت طیش میں تھا۔

شاکر صاحب مسکرا دیے [illegible] ان دونوں پہ بیٹوں اور ان کے ساتھیوں کی مدد سے وہ محلے میں یہ شوشہ چھوڑ چکے ہیں کہ یہ سب محمود صاحب کا کھلا روایتی طور پر پاگل کرنے والا کوئی اور نہیں ان کے قریبی مخالف محمود صاحب کا بیٹا ہے جو اپنے جرم کا اقرار تھانہ انچارج کے سامنے کر چکا ہے۔ گاؤں کے لوگ بھی مدتے مارے تھے۔ جوش و خروش اچانک کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔

پھر ایک اہم بات اور [illegible] انچارج نے قانون کی کتاب کا ایک سبق یاد کر کے بتایا۔ "اگر شاکر صاحب آپ کے ہوتے ہوئے کوئی کسی دن تو آپ ان کو مار نہیں سکتے۔ ایک تو عام طور سے آپ سے خلاف ہوگی [illegible] کا ہاتھ ہے۔ لیکن میں اس سلسلے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا کیوں کہ میں تو سرکاری ملازم ہوں، صرف قانون کی بات سمجھ سکتا ہوں اور سمجھا سکتا ہوں۔ ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ آپ ایسے ہی نہیں مار سکتے۔ مقتول کو دفعہ ۳۰۲ کے مطابق سے مارنا جرم قابل دست اندازی پولیس ہے اور [illegible] وہ چپ ہو گئے ان سے زیادہ بولنا ضروری بھی نہیں تھا۔ محمود صاحب [illegible] دوری سے کہہ میں شاکر صاحب سے مشورہ کر رہے ہیں کہ اگر ہو گئی جائیں تو شاکر صاحب کو اپنی مدد کرنا چاہیے اور مدد ہو سکتا کام آجائیں تو ان کی مدد کو آنا چاہیے۔

تھانہ انچارج نے پہلے سب کو یہ بتایا کہ "ایسے موقعوں پر بدلے اور انتقام سے زیادہ اس بات کی پروا کرنی چاہیے کہ مضروب کو جلد از جلد اسپتال لے جایا جائے۔ آپ میں سے کسی نے یہ کام کیا؟ ان کو اسپتال تک لے جانا تو بڑی بات، شاکر پانی ہی پلا دیا ہو۔ مجھے افسوس ہو گیا۔

دوسرا نکتہ دینے سے پہلے بھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ اس کا انجام فساد بھی ہو سکتا ہے جس میں دسیوں بے گناہ مارے جا سکتے ہیں۔ مجھے تو دوسرا اسباب ہو گیا۔

پھر ان سے دونوں قاتلوں اور مقتول کے اصل لوگوں کی مدد سے مجھے کو بتایا کہ مجھے کا سر آدمی کم از کم دو میں دعوت کی زد میں ہے۔ جب وہ سارے سب سمجھا چکا تو آرام سے کرسی پر یوں اکڑ کر بیٹھ گیا جیسے تھانہ انچارج کو بیٹھنا چاہیے۔

جب وائرلیس پر ملاجی کی موت کی اطلاع ملی تب ہی سے پولیس نے قدرے فرق لانا مناسب سمجھا۔

اس درمیان مجمع چھٹ چکا تھا۔ وہ رات ٹھاکر صاحب نے حویلی میں نہیں گزاری۔ ملاجی کے خاندان کو ٹھاکر اودل سنگھ نے خاطر خواہ تاوان دیا اور محمود صاحب نے مشورہ دیا کہ اس روپے کو خاموشی سے لے کر کام میں لے آؤ ورنہ مسلمانوں کو معلوم ہو گیا تو تمھاری عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔

انھوں نے سمجھایا:

اور ویسے بھی اس واردات میں ٹھاکر اودل سنگھ کا کیا قصور ہے؟ دراصل نیلا ان کا پالتو جانور تو ہے نہیں۔ اس کا مطلب وہ وحشی ہے۔ وہ وحشی اس لیے ہے کہ ٹھاکر صاحب نے اس کے گلے میں ایسا پٹا تو ڈالا نہیں ہے۔ تو اگر وہ وحشی ہے تو وحشت کبھی بھی بھڑک سکتی ہے اور کیوں کہ وحشت کبھی بھی بھڑک سکتی ہے تو اس میں جانور کا کیا قصور؟ کیوں کہ ایک اعتبار سے جانور ایک الگ چیز ہے اور اس کی وحشت ایک الگ چیز، اس لیے کہ جانور پر وحشت ہمیشہ طاری رہتی نہیں، کبھی کبھی آتی ہے۔ تو جو چیز کبھی کبھی آتی ہے اس کے لیے جانور بھی مستقل مجرم نہیں گردانا جا سکتا۔ تو جانور اگر وحشت سے الگ ایک چیز ہے تو اسے جانور پہلے سمجھنا چاہیے اور وحشی بعد میں۔ تو اگر وہ پہلے ایک جانور ہے اور وحشی بعد میں، تو اس صورت میں فیصلہ اس کی جانور والی حیثیت سے کرنا چاہیے نہ کہ وحشت والی حیثیت سے۔ اگر وحشت والی حیثیت سے فیصلہ کرنا ہے تو صرف حالت وحشت کے وقت ہی وہ فیصلہ مناسب جانا جائے گا نہ کہ ہر حالت میں۔ اور کیوں کہ وہ اس وقت وحشت والی حالت میں تو ہے نہیں، صرف جانور والی حالت میں ہے، تو اس صورت میں۔

ملاجی کے خاندان والے راضی ہو گئے۔

محمود صاحب نے خود پر اندر ہی اندر ناز کیا کہ وہ بھی اگر کوشش کریں تو ٹھاکر اودل سنگھ کے انداز میں خاصی دیر تک گفتگو کر سکتے ہیں، یعنی ایسی گفتگو جس میں جھوٹ کہیں بھی نہیں ہوتا، یعنی ہر لفظ سچا ہوتا ہے، لفظ کے معنی بھی سچے ہوتے ہیں اور ان لفظوں میں جو لفظ ملا کر بولے جاتے ہیں وہ بھی سچے ہوتے ہیں، اور ان لفظوں کے اور ان کے علاوہ جو دوسرے الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان الفاظ کے معنی بھی سچے ہوتے ہیں۔ بلکہ ان معنی میں جس خیال کی آمیزش اور آمیزش

Scanned with CamScanner

میں جو ایک قسم کی معنوی حقیقت ہوتی ہے اور حقیقت میں جو صیت۔

۸

ایک عرصے سے شہر کی معاشی کا درن بدل رہا تھا۔ اس درن کا اثر قصبے اور دیہات پر پڑ رہی رہی تھا۔ آہستہ آہستہ لیکن محسوس ہو جانے پر تبدیلی آ رہی تھی۔ لیکن حالیہ دنوں میں کچھ تبدیلیاں اچانک اور واضح طور سے سامنے آنے لگی تھیں۔

شاذ ہوا یوں کہ تبدیلی کو سب سے پہلے قبول کرتے تھے۔ دیہات میں سب سے پہلے آئی آر 21 اور آئی آر 68 گیہوں بیج کے طور پر انھوں نے ہی استعمال کیا تھا۔ یوریا کھاد سب سے پہلے انھوں نے ہی اپنے کھیتوں میں استعمال کی۔ ٹیوب ویل اور ٹریکٹر تو قصبے میں سب سے پہلے ان کے یہاں آیا تھا۔ کس چیز پر کتنی رعایت ملتی ہے، انھیں اندازہ رہتا تھا۔ کس شہر میں کیا کیا نئی چیزیں استعمال ہو رہی ہیں، انھیں سب سے پہلے معلوم ہوتا تھا۔ وہ ترقی کرنے اور پیسہ کمانے کے ہر ہنر سے واقف تھے۔ اس پیسے کا صحیح استعمال ایک ایسا باب تھا جس میں وہ زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ وہ اقتدار اور پیسے کو ایک دوسرے کا حامی و مددگار سمجھتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ ان میں کوئی بھی چیز ایک دوسرے کے بغیر نہیں حاصل کی جا سکتی۔ اقتدار کیوں کہ چھو کر محسوس کی جانے والی چیز نہیں (اور اس بات کا انھیں بہت افسوس تھا) اس لیے وہ اس کے بدل یعنی پیسے کو بہت حفاظت سے جمع کرتے تھے۔ اور اسی لیے نفسیاتی طور پر وہ پیسے کی ضرورت کے محتاج تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی وجہ سے بدنامی بھی بہت ہوئی لیکن وہ ساری بدنامیاں پیسے سے دھولی جا سکتی تھیں — اور دھولی جاتی رہی تھیں — اور پیسے کی حفاظت میں بیٹے کا بڑا حصہ تھا۔ کبھی تو وہ بہت سنجیدگی سے یہ بات سوچتے کہ اس جیسے دولت مند اور صاحب اقتدار کے پاس اس قسم کا ایک ہتھیار ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں، کہ کچھ لوگ اسی لیے پالے جاتے ہیں کہ وہ برے وقت میں ساتھ دیں یا اچھے وقت کو اور بہتر بنائیں۔

مال اور اقتدار کی اس حد کو سنگ آنکھ مچولی میں وہ کچھ معمولی چیزیں نظر انداز بھی کر گئے تھے

— جیسے اپنی خانگی زندگی، ذہنی سکون اور ضمیر وغیرہ۔

جب سے منڈی کے مزاج میں چابک تبدیلیاں آئی تھیں، وہ دن رات اپنی دیہاتی اراضی کی معیشت اور قصبے کی کاروباری زندگی کو شہر کی سی تبدیلیوں سے ہم آہنگ کرنے میں لگے رہتے تھے۔ انھیں اتنا اطمینان ہر حال میں رہتا تھا کہ اگر ان کی آنکھیں بند ہو جائیں تو ان کے وارث موجود ہیں جو ان کے اقتدار اور تمول دونوں کو بہت سبک دستی کے ساتھ خود تک منتقل کر لیں گے۔ جہاں تک اپنی زندگی کا معاملہ تھا وہ مطمئن تھے کہ جب سے نیلا پالا ہے ان کی گڑھی اور حویلی کے علاقے میں دہشت پھیل گئی ہے اور کوئی ان کی دولت و اقتدار کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔

ٹھاکر اودن سنگھ شہر کی منڈی کی تبدیلیوں سے اپنی معیشت کو ہم آہنگ کرنے اور قصبے کی سیاست میں خود کو مستحکم کرنے اور دیہات کی اراضی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش میں مستقل لگے رہتے۔ ان کے بیٹے بھی ان کے مددگار تھے، حالاں کہ یہ اور بات ہے کہ ان کا مزاج اور عادتیں ٹھاکر کے مزاج اور عادتوں سے قدرے مختلف تھیں۔ خود دونوں بیٹوں کا مزاج ایک دوسرے سے بہت مختلف تھا۔ بڑا پرتاپ اپنی بیوی کے ساتھ گم، دیہات کے لوگوں سے زیادہ مصروف رہتا۔ اسے اندازہ تھا کہ ان کے خاندان کی ساکھ کی اصلی بنیاد دیہات کی اراضی ہے۔

چھوٹا اونکار دیہات، قصبے اور شہر تینوں میں دل چسپی لیتا تھا اور نتیجتاً کسی بھی ایک جگہ ٹک کر کام نہیں کر پاتا تھا۔ باپ کا زیادہ منظورِ نظر وہی تھا۔ زندگی کے دوسرے مظاہر میں بھی اس کی دل چسپی زیادہ تھی۔ حالاں کہ پچھلے سال اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی اور بیوی بھی بڑی خوب صورت اور چلبلی ملی تھی، لیکن وہ قدرت کی دیگر نعمتوں کا منکر نہیں بننا چاہتا تھا۔

۹

دھر کچھ دنوں سے گاؤں کے ایک حصے نے محسوس کیا کہ ان کو ان کا پورا حق بھی نہیں ملتا۔ ہر کا بمباسب کی مشترکہ ملکیت تھا، لیکن اس کی زیادہ تر نالیاں ٹھاکر کے اپنے کھیتوں میں پڑی تھیں

کی موافقت والوں کے گھٹنوں میں تکلیف رہتی۔ پرانی پیڑھی کے لوگ ان نالیوں کو قصبے کی تعمیر کا ایک جز سمجھتی تھی لیکن جب سے لونڈے جوان ہوئے تھے، کہنے لگے تھے کہ قصبے میں نئی نالیاں بھی بنائی جا سکتی ہیں اور کچھ پرانی نالیوں کو بند بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان کی وجہ سے کبھی کبھی پانی بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ وہ لونڈے اس قسم کی شکایت لے کر ٹھاکر کے پاس آتے تو گڑھی کے دروازے پر کھڑا نیلا سونٹا آگے کر کے انھیں روک دیتا۔ وہ الٹے قدموں واپس تو چلے جاتے لیکن دل ہی دل میں آئندہ کے منصوبے بناتے ہوئے واپس جاتے۔

مسئلہ پریشانی کا یوں تھا کہ گاؤں سے ملے ہوئے گھر ہوتے تو ان کا فائدہ بھی انھیں گھروں کو ملتا جو ٹھاکر کے زیادہ قریب تھے۔ ٹھاکر نے سیاست کے طور پر اپنے گھر سے دور گاؤں کی سرحد پر سے دو ایک گھر والوں کو بھی مراعات کا حصہ دار بنا رکھا تھا تاکہ گرام پنچایت میں کوئی یہ شکایت نہ کر سکے کہ ٹھاکر صرف ان گھروں کو فائدہ پہنچاتا ہے جن کی دیواریں ان کی گڑھی سے ملی ہوئی ہیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ سرحدی گھر والے بھی ان کی حمایت کا دم بھرتے رہتے اور گاؤں میں ایک طرح کا توازن قائم رہتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ توازن اکثر ٹھاکر کے ہی حق میں جاتا تھا۔ گاؤں کی حد تک ٹھاکر کی کوشش بھی یہی رہتی کہ توازن اس کے اور اس کی حمایت والوں کے ہی حق میں رہے۔ متاثرہ افراد کا سامنا ٹھاکر سے ہو ہی نہیں پاتا تھا کہ گڑھی کے دروازے پر نیلا انھیں روک دیتا تھا۔ غیر فطری مداخلت کا راستہ لی جنت میں بھی کچھ حیرت انگیز تبدیلیاں ایسی آ گئی تھیں کہ وہ کبھی کبھی خود بخود گڑھی سے نکل کر ان متاثرہ افراد کے گوشے میں پہنچ کر ان کے گھروں میں گھس کر توڑ پھوڑ مچاتا، اور بچوں اور عورتوں کو کچلتا ہوا، ادھیڑتا ہوا واپس آ جاتا۔ ٹھاکر کی شہ، پجاری کی موافقت اور قوتوں کے ڈر کی وجہ سے کوئی اسے براہ راست گزند نہیں پہنچا پاتا تھا۔

قصبے میں، جو ٹھاکر کی سیاست کا مرکز تھا، کچھ ویسی ہی حالت تھی۔ البتہ شہر کے حکام کبھی کبھی ٹھاکر کو تنبیہ کر دیتے تھے۔ شہر کے حکام بھی صرف اسی حد تک تنبیہ کرتے تھے جس حد تک وہ ضروری سمجھتے تھے تاکہ دوسرے قصبے والے زیادہ دلیر نہ ہو جائیں۔

زندگی بہت قاعدے قانون کے ساتھ چل رہی تھی۔ گڑھی میں پرتاپ کی بیوی نے بچوں کی سالگرہ منائی۔ محلے پڑوس کے لوگوں کو بھی بلایا۔ کمہار کی بیوہ پچھلے موسم میں اپنے پتی کے پاس جا چکی تھی۔ چمپئی پانچ برس کی رشی اس کے منگیتر کے گھر جا چکی تھی۔ لڑکی اب اپنے خاندان میں اکیلی

تھی۔ برتن بنانے کا کام سیکھنے اس کے بس کا نہیں رہ گیا تھا۔ میڈیکل رپورٹ کے بعد جب اپنا منگیتر ہی انکاری ہو گیا تو اس سے اور کون شادی کرتا۔ وہ راضی بہ رضا زندگی گزار رہی تھی۔ گدھے بیچ کر اس کا پیسہ برجی سو کے پاس جمع کرا کے وہ گڑھی میں ہی چھوٹا موٹا کام کر کے وقت گزار لیتی تھی اور کبھی جھونپڑے میں اور کبھی سو کے پائنتی سو جاتی تھی۔ اس کا منگیتر، یعنی بہنوئی، مقدمے سے بری ہو گیا تھا، کیوں کہ ٹھاکر صاحب نے پولیس کے کیس داخل کرنے سے پہلے ذاتی استغاثہ دائر کر دیا تھا اور پھر عدم پیروی میں اپنا کیس خارج کرا لیا تھا۔ ٹھاکر صاحب جانتے تھے کہ اس قسم کے فضول مقدموں کو جیت کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔

نئی بہو زیادہ چھوا چھوت نہیں مانتی تھی۔ بڑکی کو خوب اچھی طرح نہا کر آنے کی ہدایت کی تھی اور جب وہ آئی تو اسے پوریاں بیلنے کو بٹھا دیا۔ بڑکی عزت افزائی پر خوش ہو کر جھوم جھوم کر پوریاں بیلنے لگی۔ اونکار بھی سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ پرتاپ کے بچے وہیں رسوئی میں بیٹھے ہنڈکلیا پکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اونکار کو محسوس ہوا کہ بڑکی اس رات کے مقابلے میں اب کچھ نکھری ہوئی سی ہے۔ وہ اونکار کے اس احساس سے بے خبر جھوم جھوم کر پوریاں بیلتی رہی۔ ظاہر ہے جب وہ جھوم جھوم کر پوریاں بیلے گی تو پورا بدن جھولے گا۔ جب پورا بدن جھولے گا تو وہ حصے بھی جھولیں گے جن کے بارے میں اونکار زیادہ متفکر تھا۔ بھائی کے بیٹے کو پیار کرنے کے بہانے اونکار نے جھک کر اس کی کرتی پر نظر جمائی اور اگلی پوری بیلنے کا انتظار کرنے لگا۔ بڑکی کو ہلکا سا احساس ہوا کہ اونکار بابو بہت قریب آ گئے ہیں، مگر وہ چپ رہی۔ جیسے ہی وہ بیلتے بیلتے آگے جھکی، اونکار نے بچے کو چومنے کے بہانے اپنا سر آگے کر دیا اور اس دفعہ کامیاب رہا کہ اس نے اپنی فکر کو دو بڑے بڑے میدے کے پیڑوں کی شکل میں مجسم دیکھ لیا تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم ایک اور بات ہوئی جس کا اونکار کو وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

جس کا بدن رگڑتے وقت اس نے آنکھ پر پٹی باندھ دی تھی اگر ناک پر بھی باندھ دی ہوتی تو بڑکی اونکار کی سانس کی مہک محسوس کر کے آج چونکنا نہ ہوئی ہوتی۔ اس نے زندگی میں صرف ایک مرد کی سانس کی مہک سونگھی تھی، اس لیے اپنا مجرم پہچاننے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اب اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنے آپ کو اور آگے جھکا دیا اور اونکار کا چہرہ دیکھے بغیر اسے اندازہ ہو گیا کہ اس وقت اونکار کے دل کی کیا حالت ہوگی۔ اس طرح

Scanned with CamScanner

اس نے اونکار کی سانسوں کی مہک کی دوبارہ تصدیق کی۔ اس نے اس رات جھونپڑے کی لذتوں کو یاد کیا تو اسے متلی سی آ گئی۔ وہ تیزی سے پوریاں بیلتی رہی۔ کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی تو اونکار بچے کو لیے لیے رسوئی کے دوسرے کونے میں جا کر بچوں جیسی باتیں کرنے لگا۔ آنے والی بڑی بھابھی تھی۔ وہ پوریاں بیلتی رہی اور بڑی بھابھی کے چہرے کو دیکھتی رہی۔

رات کو اس نے بڑی بھابھی کے سر میں خوب طبیعت سے تیل لگایا، اس کی پیٹھ پر مالش کی، پھر اس کی ٹانگوں کو گود میں رکھ کر دیر تک اس کی پنڈلیاں دباتی رہی۔ جب بھابھی بدن دبواتے دبواتے تھک گئی تو بولی، "اب سو جا بڑکی۔"

بڑکی آہستہ آہستہ رونے لگی۔

"کیا ہوا؟" بھابھی نے اچنبھے سے پوچھا۔

بڑکی نے اس کے دونوں پیر ہاتھوں میں تھامے اور ان پر اپنا سر رکھ کر بولی، "میرو یووَن اونکار بابو نے لوٹوا ہے۔"

وہ زمین پر اور بڑی بھابھی چارپائی پر لیٹی پچھلے موسموں کی وہ خوشحال رات یاد کرتی رہیں۔ اونکار کے دوست نے جہاں جہاں نیل ڈالے تھے وہاں ہاتھ پھیر کر بڑی بھابھی نے دانت پیستے ہوئے رات کاٹی۔

دوسرے دن بڑکی اپنی بہن سے ملنے اس کے گاؤں چلی گئی اور دو تین دن بعد واپس آ کر اپنے کام میں لگ گئی۔ وہ اندر سے آتے جاتے نیلے کو کچھ نہ کچھ کھلا دیتی۔ نیلا بھی اسے دیکھ کر، گر بیٹھا ہوتا تو اٹھ کر اس کے پاس آ کر اس کا ہاتھ چاٹنے لگتا تھا۔

ایک رات جب کہرا بہت شدید تھا اور گاؤں کے دھوئیں میں مل کر بہت گاڑھا اور ٹھوس ہو گیا تھا اور ہوائیں تیز تھیں اور جاڑا شدید تھا تو گڑھی کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے دو سائے بغیر آواز کے اندر کودے اور سیدھے اونکار کے کوٹھے میں پہنچے۔ اونکار کے پلنگ کے پاس پہنچ کر اس نے، جو زیادہ تگڑا تھا، اونکار کے منھ پر ہاتھ رکھ کر گردن دبائی اور گٹھری کی طرح باندھ لیا۔ دوسرے نے اونکار کی سوتی ہوئی بیوی کو، جو چونکی تک نہیں تھی، اس انداز سے قابو کیا کہ اس کا ایک ہاتھ تکیے کے ذریعے اس کا منھ دبائے ہوئے تھا اور دوسرا ہاتھ چاقو تھامے تھا جس کی چمک اونکار کی بیوی کو اندھیرے کے باوجود نظر آ رہی تھی۔ وہ کسمسانے سی لگی مگر آواز تکیے کی دبازت میں گھٹ

کر رہ گئی- پھر اس نے اطمینان سے اسے اچھی طرح باندھا اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا- تگڑا آدمی بڑی گٹھڑی کو لے کر گڑھی کے دروازے سے نکل گیا- دوسرا آدمی چھوٹی گٹھڑی کو لے کر سامنے کمہار کے جھونپڑے میں گیا اور اونکار کی بیوی کو پیال پر ڈال کر، آنکھوں پر پٹی باندھ کر، اپنے چہرے کا ڈھاٹا کھول کر پورا سبق یاد کیا جو اس کی سابقہ منگیتر اور حالیہ سالی نے اس کے گھر آ کر اسے پورا ماجرا بتا کر یاد کرایا تھا...

رُکی اس درمیان نیلے کو کھونٹے سے چپکے چپکے پیڑے کھلاتی رہی اور سرسوں کا خالص تیل پلاتی رہی- اور دریچوں سے اندازہ کرتی رہی کہ اب کیا ہو رہا ہوگا...

اگلی صبح بہت سی تازہ خبروں کے ساتھ طلوع ہوئی- پہلی خبر تو یہ تھی کہ اونکار گھر سے غائب تھا اور اس کے کپڑے نہر کے کنارے پائے گئے تھے۔

دوسری خبر یہ تھی کہ اونکار کی بیوی کو کوئی زبردستی اٹھا کر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ جان بچا کر بھاگ آئی- یہ خبر تو بالکل سچ تھی، کیوں کہ کسی نے اسے اٹھا کر لے جانے کی کوشش تو کی تھی — یہ اور بات ہے کہ وہ کامیاب بھی ہوا تھا- خبر کا دوسرا حصہ بھی سچ تھا کہ وہ اپنی جان بچا کر بھاگ آئی، کہ بہرحال اس کی جان تو بچ ہی گئی تھی...

تیسری خبر یہ تھی کہ جب ٹھاکر نے اپنے پہرے کے نوکروں پر جوتے پڑوائے تو اس دفعہ انھوں نے کوئی اعتراف نہیں بلکہ صرف یہ واقعہ بیان کیا کہ بڑکی کے ہاتھ سے رات کو کھانا اور گڑ لے کر، کھانا اور گڑ کھا کر، وہ لوگ لیٹ گئے تھے اور معمول سے زیادہ دیر تک جاگتے رہے تھے کہ گڑ میں بہت کڑواہٹ تھی جیسی کہ پرانے گڑ میں پیدا ہو جاتی ہے، اور پھر بے خبر سو گئے تھے، جیسا کہ روز سوتے تھے، کیوں کہ اب نیلے کی موجودگی میں انھیں چوکیداری کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں تھی-

چوتھی خبر یہ تھی کہ چھمکی کا بیٹا گڑھی کے پیچھے مُردہ پایا گیا- اس کے سینے پر چاقوؤں کے کئی گھاؤ تھے- بعد میں میڈیکل رپورٹ نے بتایا کہ موت چاقو کے زخموں اور زیادہ خون نکل جانے کی وجہ سے ہوئی- ساتھ ہی ساتھ معدے میں دھتورے کے بیج بھی پائے گئے۔

پانچویں خبر یہ تھی کہ رُکی اپنے جھونپڑے میں مُردہ پائی گئی- بعد میں میڈیکل رپورٹ سے پتا چلا کہ اس کے معدے میں دھتورے کے بیج پائے گئے- اس کے بدن پر چوٹ کا کوئی نشان

Scanned with CamScanner

نہیں تھا۔

ایک معمولی خبر یہ بھی تھی کہ بھیکو کا لونڈا اچانک پاگل ہو گیا ہے اور بار بار ڈوبتے ہوئے آدمی کی نقلیں کرتا ہے اور ہنستا ہے۔۔۔

ایک ضمنی خبر یہ بھی تھی کہ لڑکی ہونے پر باپ نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ یا تو وہ اسے میکے بھیج دے یا پھر اس کے ساتھ آ کر گڑھی میں رہے۔ اس ضمنی خبر میں ایک ضمنی ٹکڑا یہ بھی تھا کہ بڑی بہو کو اب نیلے سے بہت ڈر لگنے لگا ہے۔

علاقے کی پولیس نے اس معمولی قتل کیس میں بہت جی جان سے محنت کر کے تفتیش کی اور ایک ہفتے کے اندر اندر ایک ایک واقعے کی چُوں سے چُوں شہ دی۔

کمہار کی چھوٹی لڑکی، چھنکی، کے خلاف چارج شیٹ داخل ہوئی جس کا لب لباب یہ تھا کہ چھنکی بھیکو کے بیٹے کی آشنا تھی۔ ان دونوں کو نامناسب حالت میں دیکھ کر چھنکی کے شوہر پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے انتقاماً گڑھی میں جا کر کسی بہانے سے بڑکی کو بلایا اور کسی نہ کسی طرح راضی کر کے پہرے داروں کو اور پھر بڑکی کو دھتورا کھلا کر، خود بھی دھتورا کھا کر، بری نیت سے بڑکی کو اس کے جھونپڑے میں لے گیا۔ لیکن اس درمیان ونکار کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے باہر آ کر جھونپڑے کے پاس جا کر چھنکی کے شوہر کو للکارا۔ چھنکی کے شوہر نے ونکار پر قابو پا لیا اور راز کھلنے کے ڈر سے اس کی گٹھری بنا کر نہر میں ڈبو دیا۔ نہر کی پٹری پر بھیکو کے بیٹے نے یہ ڈوبنے والا منظر دیکھا اور ہوش و حواس کھو بیٹھا اور دوسرے گاؤں جا کر چھنکی کو بلا لایا۔ چھنکی نے جب یہ سنا کہ اس کا شوہر بڑکی کی عزت لوٹنا چاہتا تھا تو وہ غصے میں گاؤں آئی اور اس نے اپنے دھتورے کے نشے میں مدہوش شوہر کو ونکار کی بیوی کو شکار کرتے اور پھر اسے جان بچا کر بھاگتے دیکھا تو یہ سوچ کر طیش میں آ گئی اور سوچا کہ تھوڑی دیر پہلے اس نے میری بہن کی عزت لوٹنا چاہی اور اب ایک معصوم انسان کا قتل کر کے اس کی بیوی کی عزت لوٹنا چاہتا ہے۔ یہ سوچ کر غصے میں آ کر اس نے دھتورے کے نشے میں مدہوش شوہر کو چاقو سے مار مار کر ختم کر دیا اور اور بھاگ کر اپنے گاؤں پہنچ گئی۔ بھیکو کا بیٹا یہ دو قتل دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ شہادت کے طور پر چھنکی کے گاؤں کے کچھ لوگوں کا نام دیا گیا جو اس بات کے چشم دید گواہ تھے کہ پچھلے دو روز سے بھیکو کا بیٹا چھنکی اور اس کے شوہر سے ملنے آ رہا تھا۔۔

چھٹکی نے زنانہ حوالات کی سلاخوں سے سر نکال کر سوچا کہ وہ تو کہیں گئی نہ تھی، اس نے اپنے پتی کا خون کیوں اور کیسے کر دیا؟ میں نے تو بھیکو کو بڑکی کے ساتھ تین دن پہلے اپنے گاؤں آتے دیکھا تھا تو پوچھنے پر بڑکی نے بتایا کہ بھیکو اپنی پتنی کو چھوڑ کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اسی لیے دونوں چھٹکی کے پتی کے پاس روز مشورہ کرنے آتے ہیں۔ میں چوکے میں بیٹھی ان تینوں کے لیے کچوریاں بناتی رہتی اور یہ تینوں باہری کوٹھے میں سر جوڑے بیٹھے بیاہ کی بات کرتے رہتے۔ جاتے وقت بڑکی میرے پتی کو بلا گئی تھی کہ وہ آ کر اس کے گاؤں میں بھیکو کے بھائیوں سے بیاہ کی بات کر لے... وہ برابر سوچتی دماغ لڑاتی رہی۔

بھیکو کے گھر جانے کے بجائے میرا پتی بڑکی کے جھونپڑے پر پہنچا ہو گا۔ وہاں اسے اکیلا دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی ہو گی پہلے تو سگائی اسی سے ہوئی تھی نا۔ بڑکی بھی اب تک میرے پتی کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتی تھی۔ میرا پتی بھی اکثر لڑائی میں 'لاسنا دیتا تھا کہ اس سے اچھا تو میرا بڑکی سے بیاہ ہوا ہوتا۔

بھیکو کے گھر بیاہ کی بات کرنے جب دونوں نہیں پہنچے ہوں گے تو بھیکو کا بیٹا ان کی تلاش میں جھونپڑے پر آیا ہو گا۔ جھونپڑے میں دونوں کو ایک ساتھ بیٹھا دیکھ کر وہ اوتار بابو کو بلا لایا ہو گا۔ بڑکی کا گرم گرم بچھونا چھوڑنے کے غصے میں میرے پتی نے اوتار کو مار کر نہر میں ڈبو دیا ہو گا۔ بھیکو کا بیٹا یہ دیکھ کر پورا پاگل ہو گیا ہو گا۔ واپسی میں میرا پتی پھر بڑکی کے جھونپڑے پر گیا ہو گا۔ اتنے میں گڑھی سے اوتار کی بیوی نے آ کر میرے پتی کو چاقو سے گود دیا ہو گا۔ بڑکی یہ سب دیکھ کر دستوراکھ کر دی گئی۔ اگر وہ بڑکی کے ساتھ سونے کا ایسا ہی شوقین تھا تو اس کا جو انجام ہوا وہ اچھا ہی ہوا۔ یہ سوچ کر اسے کچھ اطمینان سا ہوا، کہ اچانک اسے پتا اور بڑکی کا بچپن اور لڑکپن اور شروع جوانی کا ساتھ یاد آیا۔ پھر اپنے مرے ہوئے پتی کا گٹھا ہوا مضبوط شریر یاد آیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کا پتی شہر سے اس کے لیے ہمیشہ پیڑے لاتا تھا اور پیڑے کھا کر گرم گرم دودھ پی کر وہ دونوں چھت پر سونے چلے جاتے تھے۔ اچانک اسے اپنے شوہر کے قاتل اوتار کی بیوی سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ سلاخوں کے باہر آہٹ ہوئی۔ پولیس کی زنانی نے آ کر اس سے پانی کے لیے پوچھا۔ اس نے پتی آنکھوں سے بہتا گدلا گدلا پانی پونچھا اور ہاتھ کے اشارے سے پانی کو منع کیا۔

Scanned with CamScanner

۱۰

باہر سسر جی نے پہرے کے نوکروں کو بھی اسی پہ بٹھایا ہے۔ جٹھانی صبح سے روتے روتے ابھی چپ ہو کر جیٹھ جی کے ساتھ اپنے کمرے میں گئی ہیں۔ نیلا سسر جی کے پاس کھڑا دم کو چکر دے رہا ہے۔

وہ کون تھا جو مجھے باندھ کر جھونپڑے میں لے گیا تھا؟ اور پھر میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر کس بری طرح میرے بدن کی درگت بنائی تھی۔ پھر رک رک کر سوچ سوچ کر کیسے اس نے میرے شریر کی بے عزتی کی تھی۔ پھر کیسے میرے جسم کو بنا ڈھکے وہ جھونپڑے سے نکل کر بھاگا تھا۔ میں کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد رسی کھول کر آنکھوں کی پٹی ہٹا کر خود کو گڑھی کے اندر لے گئی تھی، جہاں دروازے پر نیلا چپ چاپ کھڑے مجھے اپنے کمرے میں جاتے دیکھتا رہا تھا۔ کسی کو خبر نہیں ہو پائی کہ اس رات میری عزت لٹی تھی۔

وہ کون تھا؟ چھٹکی کا پتی یا بھیکو کا لڑکا؟ وہ بھیکو کا لڑکا ہی ہوگا، کیوں کہ اس کی پتنی کو نیلے نے زخمی کیا تھا اور سسر جی نے آخر تک غلطی نہیں مانی تھی۔ اس نے اس طرح اپنا انتقام لیا۔ پھر آخر اونکار کو چھٹکی کے پتی نے کیوں نہر میں ڈبویا؟ اس نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ پھر بڑکی دھتورا کھا کر کیوں مر گئی؟ وہ تو جٹھانی کے کمرے میں سوئی سوئی تھی۔ وہاں سے کب نکل کر آ گئی تھی؟ جٹھانی کو خبر بھی نہیں ہو سکی۔ کیا بڑکی نے جٹھانی کو بھی سونے سے پہلے تھوڑا سا دھتورا کھلا دیا تھا؟ یہ چھٹکی کا میاں اور بڑکی اس واقعے میں کہاں سے آ گئے؟ اور یہ دونوں مر کیوں گئے؟ ان دونوں کو کس نے مارا؟

اچانک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ یقیناً ایسا ہوا ہوگا کہ چھٹکی نے رات کو آ کر گڑھی کے پیچھے اپنے پتی اور بڑکی کو بری حالت میں دیکھا ہوگا۔ دھتورے کے نشے میں چور اپنے پتی کو چاقو سے مارنے میں اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی ہوگی۔ البتہ بڑکی کو بڑی بہن سمجھ کر معاف کر دیا ہوگا۔ مگر بڑکی شرمندگی سے بچنے کے لیے دھتورا کھا کر جھونپڑے میں آ کر سو گئی ہوگی۔ مگر اونکار کو چھٹکی کے پتی نے نہر میں کیوں ڈبویا؟

باہر کچھ شور سنائی دیا۔ اس نے کھڑکی کے باہر جھانکا۔ گڑھی کے دروازے کے باہر بھیکو کا

بیٹا زمین پر پڑا ڈوبتے ہوئے آدمی کی نقل کر کے گھٹی گھٹی آواز میں چلا رہا تھا۔ اس نے کھڑکی زور سے بند کی اور پلنگ پر اوندھی لیٹ کر سسکنے لگی۔

۱۱

بڑی بہو نے بیٹھے بیٹھے کروٹ بدلی۔ اب رات ہو گئی تھی۔ پرتاپ چت لیٹا چھت کی کڑیاں گن رہا تھا۔ اس نے ظاہر کیا جیسے وہ سو رہی ہے۔ ویسے بھی پچھلے کئی دنوں سے سونے اور جاگنے میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا تھا۔ کھڑکی کے باہر آنگن میں سسر جی ابھی تک ٹہل رہے تھے۔ بڑی بہو کی سمجھ میں جہاں کچھ اور باتیں نہیں آئی تھیں وہیں یہ بات بھی دھندلکے میں تھی کہ کیا واقعی چھوٹی بہو بیچ رستے سے عزت بچا کر بھاگ آئی تھی۔ کیا اس کے شریر پر نیل نہیں پڑے؟ کیا اس کا پنڈا کورا ہی ہے؟ اس احساس سے ہی اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ جب جب وہ یہ سوچتی اسے سانس سینے میں گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگتا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی لاج بچانے کے لیے جھوٹ بول رہی ہو۔ چھوٹا سی بات ہے، ورنہ ویسے ٹانگیں پھونک پھونک کر کیوں چل رہی تھی۔ اس نے پھر کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ کھڑکی کے بالکل نزدیک ایک سایہ کھڑا تھا۔ وہ چیخنے ہی والی تھیں کہ اسے نیلے کی سانسیں سنائی دیں۔ نیلا کھڑکی کے پاس تھوتھنی کیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اٹھیے... اٹھیے..." وہ تیز سرگوشیوں میں پرتاپ سے مخاطب ہوئی۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟" پرتاپ پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"کچھ نہیں... مجھے نیلے سے ڈر لگتا ہے۔ کھڑکی کے پاس کھڑا ہے..." وہ بیٹھی تھر تھر کانپتی رہی۔

۱۴

ٹھاکر اودل سنگھ نے ٹھہر ٹھہر کر بچی سانسیں درست کیں۔ آنگن میں پڑی چارپائی پر بیٹھ کر انھوں نے یاد کیا کہ ونکار بچپن ہی سے کتنا ضدی تھا۔ میلے میں جاتا تو ہر اچھی چیز کے لیے پسر جاتا۔ مٹی کی ڈھیر ساری گڑیاں، شیر، بھالو، غبارے، رنگین کاغذ کی پتنگیں، وہ جانے کیا کیا مانگ کر گود میں اٹھائے لے آتا اور پھر تھوڑی دیر میں ہر چیز توڑ پھوڑ کر بیکار کر دیتا۔ چیز حاصل ہونے کے بعد اس کے لیے بے قیمت اور بے وقعت ہو جاتی تھی۔ آج وہ سیکڑوں من پانی کے نیچے دبا ہوا ہوگا۔ مچھلیوں نے بدن پر گوشت کا ریشہ بھی نہ چھوڑا ہوگا۔ کرنی کا پھل تو ملتا ہی ہے مگر اسی جنم میں اسے کیوں مل گیا، اس کا انھیں افسوس تھا۔ انھوں نے آسمان کی طرف دکھی نظروں سے دیکھا، کیوں کہ اس جنم میں تو وہ اس کے باپ تھے۔ انھوں نے سر اٹھا کر پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک طرف سے ساون کی بدلیاں بڑھی چلی آ رہی تھیں اور تارے ان بدلیوں میں آہستہ آہستہ کھوتے جا رہے تھے۔ بادلوں کی وجہ سے سردی کچھ کم لگ رہی تھی۔ پہرے والے نوکر ڈیوڑھی کے دروازے پر ان کی طرف پیٹھ کیے بیڑی پی رہے تھے۔ نیلا بڑے بیٹے کے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑکی میں جھانک رہا تھا۔ چھوٹی بہو بچوں کے ساتھ اپنے کمرے میں لیٹ چکی تھی اور اس کے کمرے کی روشنی دھیمی ہو چکی تھی۔

ونکار ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اونکار ان سے پیسے مانگ رہا تھا۔ وہ اونکار کو پیسے دے رہے تھے۔ ونکار نے ان سے شہر جا کر سینما دیکھنے کی آگیا چاہی، انھوں نے اجازت دے دی۔ اونکار چلا گیا۔ اونکار پھر آ گیا۔ اسی مدت میں کچھ بڑا ہو گیا تھا۔ انھوں نے ونکار سے کہا کہ چیئرمینی کا الیکشن جیتنا آسان کام نہیں ہوتا۔ کچھ ٹکڑے پھینکنے بھی ساتھ میں ہونا چاہیے، کبھی کبھی دو ٹوں والا کھیل بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ اونکار مسکرا سا ٹیل پر گیا اور ٹریکٹر کی ٹرالی میں ٹکڑے ٹکڑے پتھروں کو اٹھا کر لے آیا۔ یہ ریش ہے، یہ سلطان ہے، یہ رمیش ہے (اور اس کے چہرے پر تناؤ کے دو نشان تھے)، یہ بلا ہے، یہ بہاری ہے۔ پھر وہ الیکشن جیت گئے تھے۔

اوتار۔ بیٹا اسکول کے پاس والے پلاٹ پر اگر کل امبیڈکر جینتی کا سماروہ ہو گیا تو یہ پلاٹ ہمیشہ کے لیے ہمارے ہاتھ سے چلا جائے گا۔ ہم کسی کو وہاں سماروہ منانے سے روک بھی نہیں سکتے... بس آج کی رات ہمارے پاس ہے۔ یہ بات انھوں نے قصبے کی حویلی میں بیٹھ کر کہی تھی۔

اوتار نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر دیہات جا کر ٹریکٹر لایا.. اپنے ساتھ چار پٹھے لیے... رنج مستریوں کے محلے میں جا کر بندو معمار کے چاروں نوجوان لونڈوں کو بٹھایا.. ٹریکٹر پر گاؤں سے بیس کسان پکڑ کر بٹھا لایا تھا.. بھٹے کے مالک لالہ ویریندر کو جگا کر ان کے بھٹے پر لے گیا... ٹریکٹر کی ٹرالی میں بھٹے کی اینٹوں کے چار چکر لگوائے.. اتنی دیر میں نیویں کھودی جا چکی تھیں.. مٹی کا گارا بن چکا تھا.. پو پھٹتے پھٹتے دیواریں اتنی اونچی اٹھ گئیں کہ گاؤں کے کسان ایک دوسرے کو گھوڑا بنا کر ان پر چڑھ کر دیوار پر بیٹھے معماروں کو گاروں کے پرات اور اینٹیں پکڑا رہے تھے۔ حویلی سے رات ہی رات کچھ پرانے کواڑ قبضوں سمیت نکلوا کر نئے پلاٹ کی بے چھت کی عمارت میں نصب کر دیے... جب اڈے کی مسجد کا بڈھا اذان دے رہا تھا تو اس وقت نئی عمارت کے اندر فرش چورس کر کے اینٹیں بچھائی جا چکی تھیں۔ جب صبح ہوئی تو امبیڈکر جینتی والوں نے منہ پھاڑ پھاڑ کر سر پر ہاتھ رکھ کر اس عمارت کو دیکھا تھا۔ اوتار نے بھور بھئے جگا کر کسانوں کی شراب اور معماروں کے جوڑے کے پیسے لیے تھے...

تو نے بڑکی کو کیوں بگاڑا سور کہ؟ اپنا ہی گاؤں ملا تھا تجھے؟ یہ کہہ کر نمبردار نے ایک کرارا طمانچہ اوتار کے منہ پر مارا اور دیکھا کہ ان کی موٹی موٹی انگلیاں اس کے سرخ گالوں پر واضح طور سے ابھر آئی ہیں.. وہ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔

دور ہو جا میرے سامنے سے.. وہ چلا گیا تھا۔ انھوں نے سنا تھا وہ دروازے سے نکلتے وقت کھسیایا ہوا تھا، مگر اس کے منہ سے دھیمی دھیمی ہنسی کی آواز نکل رہی تھی۔ اس کے اس طرح شرمندہ ہونے اور بڑے جرم کی چھوٹی سزا ملنے کی خوشی اور ہنسی پر انھیں روٹھا روٹھا پیار آیا تھا۔

انھوں نے آسمان کی طرف پھر دیکھا اور واپس آتے ہوئے سوچا کہ اوتار اب کہاں ہے۔ وہ تو ان بادلوں کے پرے جا چکا ہے، یا ہو سکتا ہے، ابھی تک اس کی آتما نہر کے کنارے جھاڑیوں میں بھٹک رہی ہو۔ انھیں اپنے سینے میں ایک بھاری دھمک محسوس ہوئی۔ انھوں نے اس

Scanned with CamScanner

بے چینی کے عالم میں آنکھیں بند کر کے سوچا کہ یہ سیاست، دولت، تشدد، پرتاپ سنگھ کے بس کی بات نہیں۔ وہ تو میری زندگی میں ہی ان چہروں کی حفاظت مشکل سے کر پائے گا۔ اس سوچ نے ان کی بے چینی کو اور گہرا کر دیا۔

باہر میں کچھ آہٹ سی ہوئی۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سامنے اونکار کھڑا تھا — وہ سیاہ رنگ کا تھا، اس کی لمبی سی تھوتھنی تھی اور موٹے موٹے آدھے چندرما کے آکار کے سینگ تھے۔ وہ اٹھے اور اس کی گردن سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے...

ان کے رونے کی آوازیں سن کر پہرے کے نوکر بھاگے ہوئے ان کے پاس آئے جنھیں گالیاں دے کر پھر ان کی جگہ بھیج دیا گیا۔ ٹھاکر اودل سنگھ کی عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ اونکار کا قتل کس نے کیا۔ اس کا قتل جھنکی کے پتی نے کیا تو جھنکی کے پتی کو کس نے مارا؟ پھر لڑکی کو دھتورا کھلا کر کس نے ختم کیا؟ لڑکی کو تو معلوم بھی نہیں تھا کہ اس کی عزت کس نے لوٹی تھی۔ میکو کے لونڈے کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟ انھوں نے تھانہ انچارج سے بھی گھنٹوں ان معاملات پر گفتگو کی تھی۔ تھانہ انچارج یہی کہتا تھا کہ اونکار کا قتل انھیں مقتولین میں سے کسی نے کیا ہوگا، لیکن اب ملزم کی پکڑ نہ ہونے کی وجہ سے جھنکی کو ہی چارج شیٹ کرنا مناسب ہے، کیوں کہ کیس چاروں طرف سے چوکس بیٹھ رہا ہے۔ وہ دیر تک تانے بانے سلجھاتے رہے مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا۔ نیلا زمین پر بیٹھا بیٹھا اونگھنے لگا تھا۔

۱۳

جب دھرتی پر ہل چلتا ہے تو اس کے سینے پر ایک گہری مانگ پڑ جاتی ہے لیکن ہل کے دوسرے ہی پھیرے میں اس مانگ میں مٹی بھر جاتی ہے۔ زندگی کے زخموں کو وقت بھی اسی طرح بھرتا رہتا ہے۔ شب و روز کا ہل چلتا رہتا ہے اور دکھوں کی گہری لکیریں معاملات کی مٹی سے بھرتی رہتی ہیں۔ یہ انتظام نہ ہو تو زندگی کے کھیت میں فصلیں اگنا ہی بند ہو جائیں... چیئرمینی کے اگلے الیکشن کی تیاری میں ٹھاکر اودل سنگھ کا دکھ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ عدالت نے عینی شاہد نہ

ہونے کی وجہ سے چمڑی کو رپ کر دیا تھا۔ اب وہ چھوٹ کر پہ پر سے نے جو نپڑے میں لیپ پوت کر رہنے لگی تھی۔ بھیکو کا بیٹا تیں سال پاگل خانے میں رہ کر آ گیا تھا۔ ں نے کھیتی کا کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کھیتوں کے پار میدانوں میں نہر کے پاس چدری چدری بیلوں کے سائے میں نے کی سبز اور کانٹے دار جھاڑیوں میں بیٹھا ایک ٹک آسمان کو دیکھتا رہتا تھا۔ اس کی بیوی نے اس کی بہت خدمت کی مگر اب وہ مایوس ہو گئی تھی۔ وہ جب بھی بھیکو کے بیٹے سے کوئی سوال کرتی، بھیکو کے بیٹے پر دورہ پڑ جاتا اور وہ ڈوبتے ہوئے آدمی کی نقلیں کرتے کرتے بے حال ہو جاتا۔ بیوی وقت بے وقت کھیتوں کی طرف نکل جاتی اور اندھیرا ہونے کے بعد واپس آتی، تب بھی اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

ٹھاکر اودل سنگھ ایک بار پھر الیکشن جیت گئے۔ جیت والی رات حویلی میں جشن منایا گیا۔ نمبردار اودل سنگھ نے مٹھی بھر بادام نیلے کے منہ میں ڈالے جنھیں وہ مزے لے لے کر چباتا رہا۔ اچانک انھیں اوتار یاد آیا۔ انھوں نے ایک مٹھی بادام اس کے منہ میں اور ڈالے۔ دو مٹھی باداموں کا اثر تیسرے دن ظاہر ہوا۔ رات کو وہ حویلی کے پھاٹک سے نکلا۔ سیدھا اس جگہ پہنچا جہاں اس نے کچھ سال پہلے گائے مری ہونے کا سہانا منظر دیکھا تھا۔ طویلے میں خاک اڑ رہی تھی۔ وہ کھڑا اپنے پاؤں پٹختا رہا۔ برابر میں کانجی ہاؤس تھا۔ کانجی ہاؤس کے بوسیدہ ٹین کے دروازے کی جھری سے اس نے دیکھا کہ اندر کچھ مریل اور دو چار گائیں، بیل اور بچھڑے ہیں۔ سینگوں کی ایک ہی ٹکر سے اس نے ٹین کا دروازہ توڑ دیا۔ سارے مویشی کانجی ہاؤس سے نکل کر جہاں سینگ سمایا بھاگ لیے۔ تھوڑی دور پر بھینسوں کا طویلہ تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے بھینسوں کو اپنے سینگوں سے ریلنا شروع کر دیا۔ بھینسیں رسیاں تڑا تڑا کر بھاگیں اور قصبے کی سرحد کے پاس کھیتوں میں گھس گئیں۔ نیلا ادھر سے فارغ ہوا، تو پینٹھ جانے والے راستے پر جو گھر ملے ان کے اندر گھس کر سوتے ہوئے آدمیوں کو چارپائیوں پر ہی کھوند ڈالا۔ پکار مچی تو محلے کے لوگ دوڑتے ہوئے آئے۔ کچھ زخمیوں کی مرہم پٹی کرانے اسپتال لے گئے۔ باقی لاٹھیاں لے کر اس کی تلاش میں نکل پڑے جس نے یہ سب کیا تھا... نیلے نے آدمیوں کی پکار سنی تو اندھیرے میں ہی اس نے راستہ کاٹا اور جھاڑیوں میں ہوتا ہوا کھیتوں میں اترا اور کھیتوں کھیتوں ہوتا ہوا کہیں گم ہو گیا۔

ٹھاکر صاحب کی حویلی پر بہت ہجوم تھا۔ ٹھاکر صاحب نے محسوس کیا کہ اس ہجوم میں

Scanned with CamScanner

سارے لوگ ان کے مخالف نہیں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ قصبے کے اکثر لوگ شاکر صاحب کو پسند کرتے تھے، کہ شاکر صاحب ہر معاملے میں اکثر ان کا ساتھ ہی دیتے تھے۔ لیکن پچھلے سالہا سال سے مکانوں اور بربادیوں سے تنگ آ کر وہ کم لوگ بھی شاکر صاحب سے تو نہیں لیکن بیلے سے ضرور نفرت کرنے لگے تھے۔ شاکر صاحب نے مجھے تو یقین دلایا کہ وہ آج ہی اس کا انتظام کریں گے اور اس سلسلے میں میونسپل بورڈ کے آفس میں ایک ہنگامی میٹنگ طلب کی گئی۔

مسئلہ کچھ پیچیدہ تھا۔ سارے ممبران حاضر تھے۔ محمود صاحب پرانی چوٹیں بھولے نہیں تھے۔ آج پھر ایک موقع تھا۔ ان دنوں انھوں نے بھی تیاری کی۔ رات ہی رات خفیہ طور پر وہ ضلع کلکٹر سے بھی بات کر آئے تھے۔

میٹنگ بہت شور شرابے میں شروع ہوئی تھی۔ مخالف ممبران بیل کو بچانے میں پیش پیش تھے۔

محمود صاحب نے سارے ممبران کے چہروں کا جائزہ لیا اور اندازہ کیا کہ شاکر صاحب کے موافق ممبران بھی آج بیلے کے معاملے میں تقریباً کم ہو ہیں۔ اس احساس نے ان کے اندر ایک نئی طاقت بھر دی۔

"صاحبو! میں پہلے بھی شاکر صاحب کو کئی بار اس وحشی جانور کے سلسلے میں آگاہ کر چکا ہوں بلکہ میں نے تو اسی وقت منع کیا تھا جب انھوں نے اسے پالنا شروع کیا تھا۔ مگر یہ میری بات نہیں مانے۔ انھوں نے اسے بادام کھلا کھلا کر بالکل سانڈ بنا دیا ہے۔ شہری انسانوں کا اس طرح کے جانور پالنے کا شوق غیر فطری ہے۔ اس بیلے نے فصلیں برباد کی ہیں، غریبوں کے گھروں کے برتن اور چولہے توڑے ہیں، بچے بچیوں کو کچلا ہے، بوڑھے آدمی کا خون کیا ہے، طویلے کی بھینسوں کو مار مار کر بھگایا ہے، کاریگروں کے مویشیوں کو آوارہ کر دیا ہے۔ ہماری بھینسوں کی (انھوں نے لیکشن کی تحریر پڑھ لی تھی دن میں بحث کبھی اور ایک مناسب جملہ ڈھونڈا۔) ہماری بھینسوں کی راتوں کی نیند حرام کر دی ہے۔ کون ہے جو آج اس قصبے میں چین کی نیند سو سکتا ہے؟ بولیے، کون ہے؟"

"کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔" ممبران نے جوش و خروش کے ساتھ جواب دیا۔ "نہیں، ایک شخص ہے جو آرام سے سوتا ہے اور چین سے آرام کرتا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے اس کے

کا تاثر جاننے کے لیے سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔ سب کی آنکھیں سوال تھیں۔

وہ شخص ہے ٹھاکر دول سنگھ۔ جو ہمارے چیئرمین ہیں۔

"ٹھاکر دول سنگھ، مردہ باد!" ممبران چلائے۔

"نہیں اس بات کی پروا نہیں کہ اس نیلے نے کتنے نقصانات کیے ــــ مالی اور جسمانی اور جانی۔۔" محمود صاحب خاطر خواہ اثر دیکھ کر آگے بڑھے۔

ٹھاکر دول سنگھ دل ہی دل میں تاؤ کھاتے رہے۔ آخر میں انھوں نے کڑے دل سے یک فیصلہ کیا اور پوچھا:

میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟

محمود صاحب نے جواب دیا، "ہم چاہتے ہیں کہ قصبے کو اس آفت سے نجات دلائی جائے۔"

"مگر کیسے؟" ٹھاکر صاحب انھیں اپنی راہ پر لانا چاہتے تھے۔

"جان سے ختم کر کے، اور کیسے؟" محمود صاحب گرجے۔

ٹھاکر صاحب یہی سننا چاہتے تھے۔

"ٹھیک ہے،" ٹھاکر صاحب نے نرمی لیکن مضبوطی سے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ یہ گئوہتیا ہو گی۔"

محمود صاحب نے اندازہ کیا کہ کچھ ممبران یہ بات سن کر ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔

"دوسری بات یہ کہ قانون مجریہ ۱۹۷۳ کے تحت اسے مارا نہیں جا سکتا۔ اس کی سخت سزا ہے،" ٹھاکر صاحب نے تھانا انچارج کی گفتگو یاد کر کے یہ جملہ بولا۔

جب انھوں نے اندازہ کر لیا کہ اب ممبران راہ راست پر آ گئے ہیں تو انھوں نے کہا، "کیا آپ لوگ قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ پچھلی رات کو جو کچھ ہوا وہ سب نیلے نے ہی کیا ہے اور کانجی ہاؤس کے بیلوں، طویلے کی بھینسوں نے کچھ نہیں کیا؟ نیلا بدنام ہو گیا تو کیا سارے الزامات اسی کے سر جائیں گے؟ بد بھلا بدنام برا۔۔" انھوں نے محاورے کا سہارا لیا

"لیکن وہ بیل اور بھینس بھی تو نیلے کی وجہ سے ہی مشتعل ہوئے۔" محمود صاحب نے دور کی کوڑی لی۔

"تو کیا مشتعل کرنے والا ہی سارا مجرم ہے؟ اشتعال میں آنے والا بالکل معصوم ہے؟" ٹھاکر

Scanned with CamScanner

صاحب گر ہے۔ پھر انھوں نے ایک وکیل ممبر سے کہا:

"وکیل صاحب آپ بتایئے، مشتعل ہونے والے اور مشتعل کرنے والے کی سزا میں کیا مختلف ہیں؟"

ممبر وکیل صاحب گو کہ نثار صاحب کی پارٹی کے آدمی تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ وکیل بھی تھے اور پیشے کی لاج رکھنا بھی ضروری تھی، اس لیے ان کا جواب بہت مدلل اور ٹھوس تھا۔

"دراصل مشتعل میں آنا ایک ایسا فعل ہے جس کی جڑیں انسانی لاشعور میں دور تک پیوست ہوتی ہیں۔ اگر لاشعور کا وہ حصہ ذرہ برابر بھی جارحانہ مادہ رکھتا ہے تو مشتعل میں آنے کے لیے ایک ہلکی سی تحریک بھی کافی ہوتی ہے۔ لیکن مشتعل کرنے والے کو بھی بے قصور نہیں کہہ سکتے، اور سچ پوچھیے تو قصوروار بھی اس وقت تک نہیں کہہ سکتے جب تک کہ اس امر کی تحقیق نہ ہو جائے کہ مشتعل کرنے والے نے مشتعل ہونے والے کے سامنے وہ کون سا فعل کیا جس کی وجہ سے مشتعل ہونے والا مشتعل ہو۔ معاملہ ہذا میں بیلے نے صرف یہ کیا کہ کانجی ہاؤس کے دروازے سے اپنی پیٹھ رگڑنی شروع کی کیوں کہ جانوروں کو پیٹھ رگڑنے کی عادت ہوتی ہے۔ تو اس دھکے سے پرانا دروازہ ٹوٹ گیا اور دوسرے جانور جو موقعے کا انتظار کرتے رہتے ہیں، آزاد ہو گئے، اور پھر انھوں نے من مانی کی۔ کیوں کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ بیلے نے ان کو ترغیب دے کر فصلیں برباد کرائیں لہٰذا یہ امر تحقیق و تفتیش طلب ہے کہ بیلے کا بھی اس کی بربادی میں ذاتی طور سے کتنا حصہ ہے اور حصہ ہے بھی یا نہیں۔"

اس مدلل تقریر کو ابھی ممبران اس کو ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ نثار صاحب نے ایک حسب منشا فیصلہ سنا دیا۔

"ساتھیو! بیلے کو تلاش کرنے کی مہم ابھی سے شروع کی جاتی ہے۔ میں معاملے میں ابھی بات کروں گا کچھ رضاکار اور گاڑیاں بھی بہت ضروری ہیں کہ یہ کام میونسپل بورڈ نہیں کر سکتا۔ بیلے کو گرفت میں لے کر اس بات کا اندازہ کیا جائے گا کہ آگے کیا کارروائی ہو۔ آج کی میٹنگ برخاست۔"

محمود صاحب نے آج کی میٹنگ کے فیصلے کو بڑی کامیابی سمجھا۔ انھوں نے اپنے ممبروں اور موافقین کے ذریعے شہر میں یہ شہرت کر دی کہ بیلا پاگل ہو گیا ہے اور انسانی جانوں کی

چاٹ لگ گئی ہے۔

جس نے بھی سنا دہشت زدہ رہ گیا۔ دہشت کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نیلا چھپا ہوا تھا اور چھپی ہوئی چیز عیاں چیز کے مقابلے میں زیادہ خطرناک محسوس ہوتی ہے۔ لوگوں نے دیواروں پر نیلے کو پکڑ لانے پر انعام دینے کے اشتہار لگا دیے۔ نیلے کو پکڑنے کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگیں۔

ضلع کلکٹر نے، جو صبح ہی اپنا نمائندہ بھیج کر ٹھاکر صاحب کو تنبیہ کر چکا تھا، شام کو ٹھاکر صاحب کو ضلع سدر میں بلایا۔ ٹھاکر صاحب بادل ناخواستہ پہنچے، حالاں کہ اندر ہی اندر خوش بھی تھے کہ آج کلکٹر سے بات کرنے کا موقع ملے گا۔ شہر میں کلکٹر کے آفس میں داخل ہوئے تو وہ بڑی سی میز کے پیچھے سنجیدگی کے ساتھ بیٹھا نظر آیا۔ بیٹھتے ہی اس نے ٹھاکر صاحب سے پوچھا:

"اودل سنگھ جی! نیلے نے سخت تباہیاں مچا رکھی ہیں۔ روزانہ کوئی نہ کوئی شکایت آ جاتی ہے۔ اب اس کا انتظام کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ آپ نے کیا سوچا ہے؟ میرے اوپر رائے عامہ کا بہت زبردست دباؤ ہے۔ دوسرے قصبے والے بھی شکایت کر رہے ہیں کہ ٹھاکر کے نیلے کی وجہ سے گاؤں اور قصبے میں بہت بربادی ہو رہی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ کبھی کبھی دوسرے قصبوں اور خود شہر میں بھی آ جاتا ہے..."

ٹھاکر اودل سنگھ خاموش رہے۔

"سنا ہے آپ کہتے ہیں کہ اس کو اگر مار دیا جائے تو لوگ گئو ہتیا سمجھ کر جذباتی ہو جائیں گے؟ مجھے آپ سے ایسی بچکانہ باتوں کی امید نہیں تھی۔ ہم سب کو پڑھے لکھوں جیسی بات کرنی چاہیے..."

ٹھاکر صاحب بولے، "پڑھے لکھوں کے سامنے پڑھے لکھوں جیسی باتیں ہوتی ہیں۔ دیہات اور قصبے میں لوگ ان پڑھ ہیں۔ انھیں آپ سے زیادہ میں جانتا ہوں۔"

"پھر بھی،" کلکٹر بولا، "پھر بھی میں اسے صحیح نہیں مانتا کہ بربادی پھیلانے والے ایک وحشی جانور کو، جسے آپ نے پال رکھا ہے، صرف اس وجہ سے نہیں روا جا سکتا کہ ان پڑھ اسے گئو ہتیا سمجھیں گے یا دھرم کا اپمان سمجھیں گے۔"

ٹھاکر صاحب نے ایک اور پینترا چلا۔

"اصل میں بات یہ ہے صاحب کہ آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ نیلے کو مارنا قانون جرم

۱۹۷۲ کے تحت جرم ہے۔

"مگر اس کا علاج ہے،" کلکٹر بولے۔ "میں فارسٹ آفیسر سے بات کر کے چیف وائلڈ لائف آفیسر سے اسے پاگل ڈکلیئر کرا کے مروا سکتا ہوں۔"

"مگر یہ تو زیادتی ہوگی۔ نیلا پاگل تو نہیں ہے۔"

"لیکن حرکتیں تو پاگلوں والی ہی کر رہا ہے۔"

"میں اس کا علاج کر رہا ہوں صاحب! آج ہی سے بیسے کو پکڑنے کی تیاریاں کر لی ہیں۔ آپ مجھے ایک موقع دیجیے۔"

کلکٹر نے بادل ناخواستہ انھیں موقع دے دیا۔

سورج غروب ہونے کے بعد جب وہ قصبے میں داخل ہوئے تو قصبے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لوگوں نے گھروں کے دروازے بند کر رکھے تھے اور گلیوں میں پولیس والے گشت کر رہے تھے۔ رضاکار ٹکڑیاں کھیتوں اور جنگلوں میں بیسے کی تلاش میں نکل گئی تھیں۔

ٹکڑی نمبر ۱ نے آدھی رات میں قصبے کے باہر والے بیر کے باغ اور کھیتوں کی پگڈنڈی پر کسی کو کھڑے دیکھا۔ اشارے سے بتایا۔ سب لوگ خاموش ہو گئے۔ لاٹھیاں مضبوطی سے پکڑے پکڑے اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے اور بیس گز دور سے اس پر ٹارچ پھینکی۔ تین سیل کی ٹارچ کی روشنی میں دیکھا گیا کہ نیلا دھند کے بیچ میں کھڑا ہے۔ ٹارچ فوراً بند کر لی گئی۔ اس ٹکڑی میں پانچ لوگ تھے۔ قریشیوں کا لونڈا یعقوب، جو ایک ہی سانس میں کبڈی ٹیم کے کسی تگڑے پٹھے کو چھو کر سامنے والی ٹیم پر ہتھمار کر آجاتا تھا، آج ہاتھ میں موٹی سی لاٹھی سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کا پڑوسی منشی قصائی کا بڑا بیٹا ہاتھ میں سنکٹ لیے ہوئے تھا۔ وہ قصبے کے انٹر کالج کی ہاکی ٹیم کا کپتان تھا۔ اسی محلے کے شیخ جلیل مسیح نور کے ہاتھ میں تین سیل کی جیبی ٹارچ تھی۔ وہ خود کو ٹکڑی نمبر ۱ کا لیڈر تصور کیے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے شکروالوں کا لونڈا کلّن والی بال تھا جو والی بال کھیلتے ہوئے اتنا اونچا اچھل کر والی مارتا تھا کہ کبھی کبھی جال کے دوسری طرف مخالف ٹیم کے پالے میں جا گرتا تھا۔ پانچویں تھے بوڑھے منسو چچا جو اپنی جوانی میں خرگوش اور تیتر میدان میں دوڑا کر، تھکا کر زمین پر بٹھا لیتے تھے اور ان کے چاروں طرف چکر لگا کر لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتے ہوتے

اچانک ڈھیلے یا ڈنڈے سے خرگوش یا تیتر کو زخمی کر کے پکڑ لیتے تھے۔ یہ ٹیم ہر لحاظ سے نیلے کو قابو میں کرنے کے لیے آئیڈیل تھی۔

نتھو چچا نے اشارے سے سب کو کچھ دیر خاموش رہنے کو کہا تاکہ نیلا ان کی طرف سے بے فکر ہو جائے اور پھر آہستہ آہستہ گھیرا ڈال کر اسے لاٹھی اور سنگل کی مدد سے قابو میں کر لیں۔ بوڑھے نتھو چچا کے ان خاموش مشوروں سے مسیح نواز کو ایسی تین سیل کی ٹارچ اور لنڈی کی بے عزتی محسوس ہوئی۔ اس نے نتھو چچا کو پیچھے دھکیل کر باقی لوگوں کو اشارے سے پلان سمجھایا کہ سب نیلے کو موقع مت دو، چاروں طرف سے گھیر کر ایک دم ہلا بول دو۔ منصوبے پر عمل ہوا۔ نیلے کو چاروں طرف سے خاموشی سے گھیر کر ایک ساتھ حملہ ہوا۔ لاٹھی اور سنگل اچھٹ کر مارنے والوں کے ہاتھوں سے نکل کر فضا میں لہرانے لگیں۔

وہ بیری کا ایک موٹا درخت تھا۔

ٹکڑی نمبر ۲ نے آموں کے باغوں میں نیلے کو ڈھونڈنے کا پلان بنایا تھا۔ آموں کے گھنے باغ میں جیسے ہی سب لوگ داخل ہوئے تو باغ کے اندر چیخ چیخ کرتا ہوا کوئی بھاگا۔ بارش سے باغ میں کیچڑ ہو گئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں سب نے واضح طور پر دیکھا کہ وہ نیلا ہی تھا۔ مگر وہ ایک محور، پٹھا تھا جس کے ابھی سینگ بھی پوری طرح نہیں نکلے تھے۔

ٹکڑی نمبر ۳ نے قصبے کی مشرقی سرحد کے کھنڈروں میں تلاش کا بیڑا اٹھایا۔ کھنڈر میں داخل ہوتے ہی سب نے محسوس کیا کہ کھنڈر میں کوئی ذی روح ہے۔ سب کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ ہمت کر کے آگے بڑھے۔ ملبے پر چڑھ کر کھنڈر کے آخری سرے تک دیکھا تو وہاں ایک سایہ نظر آیا۔ اگر ٹارچ کی روشنی وہیں سے ڈالی تو وہ بھاگ سکتا ہے، یہ سوچ کر لوگ خاموشی سے ملبے کے پیچھے اتر آئے اور پورا چکر کاٹ کر دھیرے دھیرے اس ٹوٹی ہوئی دیوار کے نیچے پہنچ گئے جس کی آڑ میں نیلا کھڑا تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ٹوٹی ہوئی دیوار سے ہاتھ نکال کر ٹارچ جلائی۔ وہ رام دلاری تیلی کی دیوی کے نام پر چھوڑی ہوئی بوڑھی گائے تھی۔

البتہ ٹکڑی نمبر ۴ نے جب بڑے پوکھر کے کنارے کی جھاڑیوں میں کھڑے نیلے کو چاروں طرف سے گھیر کر لاٹھیوں سے اچھی طرح پیٹ کر زمین پر لٹا دیا، اور روشنی میں اس کی چوٹوں کا جائزہ لینے کے لیے جب لالٹینیں جلائی تو معلوم ہوا وہ لوٹن تانگے والے کا لنگڑا گھوڑا تھا جو اب اپنے

Scanned with CamScanner

لنگڑے پن کی معذوری سے چھٹکارا پانے کی منزل کے بہت پاس پہنچ چکا تھا۔

لیکن قصبے کے اندر پولیس والوں نے نیلے کے دھوکے میں جن پالتو جانوروں کو مارا اس میں اُن کا، یعنی پولیس والوں کا، کوئی قصور نہیں تھا کیوں کہ ان پالتو جانوروں اور نیلے میں بہت چیزیں مشترک تھیں۔ مثلاً حاجی کی بھینس اس لیے ماری گئی کہ اس کا قد نیلے کے قد سے ملتا جلتا تھا۔ حسن شال والے کا بیل اس لیے زد میں آیا کہ اس کی کوہان نیلے کی اونچائی کے برابر تھی۔ گنگا تیلی کا بھینسا اس لیے نشانہ بنا کہ اس میں اور نیلے میں یہ قدر مشترک تھی کہ دونوں کے دو دو کان تھے۔

شاکر اور دل شکوہ اتنی سرگرمی کے ساتھ نیلے کی تلاش کی مہم کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ وہ حویلی میں آئے۔ جیپ میں بیٹھ کر سیدھے دیہات پہنچے اور گڑھی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ انھیں نیلا بہت یاد آ رہا تھا۔ گڑھی میں پہنچ کر انھیں خاص طور سے نیلے کی ساری باتیں یاد آ جاتی تھیں۔ آنگن میں پڑی چارپائی پر لیٹ کر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ انھوں نے سوتے جاگتے کی کیفیت میں دیکھا کہ نیلا ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ہے اور ان کا ہاتھ چاٹ رہا ہے۔ آہٹ پر آنکھیں کھول دیں۔ وہ خواب نہیں تھا۔ نیلا واقعی ان کا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ انھوں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے سینگ اور کھر پر تازہ لہو کے نشان تھے۔ انھوں نے گھبرا کر معائنہ کیا کہ خون دوسروں کا ہے یا نیلے کے بدن سے نکلا ہے۔ ٹارچ سے دیکھ کر انھوں نے اوپر والے کا شکر ادا کیا۔ خون دوسروں کا ہی تھا

۱۴

نیلا اس وقت گڑھی میں تھا۔ حالاں کہ درحقیقت وہ اس وقت قصبے میں تھا۔ وہ آموں اور امرودوں اور بیروں اور جامنوں کے ہر باغ میں تھا۔ قصبے کا ہر فرد سمجھ رہا تھا کہ نیلا کہیں اور نہیں خود اس کے دروازے سے لگا کھڑا ہے۔ بس ذرا دروازہ کھلا اور ۔

۱۵

نمبردار اودل سنگھ فیصلہ لینے میں دیر نہیں کرتے تھے، البتہ فیصلہ سنانے میں عجلت سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فیصلہ کرنا اور فیصلہ سنانا دو مختلف عمل ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے میں الجھانا مناسب بات نہیں ہے۔ وہ جانتے تھے کہ فیصلہ جلد لینا عقل مندوں کا شیوہ ہے لیکن فیصلہ ظاہر کرنے میں جلدی کرنا احمقوں کا کام ہے۔ انھوں نے نیلے کے انجام سے متعلق آخری فیصلہ تو نہیں لیا لیکن اتنا ضروری سوچ لیا کہ انی اوقت کیا کرنا چاہیے۔ نیلے کے بارے میں آخری فیصلہ لینے کے لیے انھوں نے اپنے آپ سے وقت مانگا، جو انھوں نے اپنے آپ کو فوراً دے دیا۔ وہ لوگوں کا ردعمل جاننا چاہتے تھے، کہ گڑھی کے باہر گاؤں والے، پنچ، اسکول کا ہیڈماسٹر اور مندر کا پجاری نیلے کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔ انھیں اس بات کی بھی فکر تھی کہ قصبے میں حویلی والے اور حویلی کے باہر دیگر افراد نیلے سے کس حد تک بدظن ہیں اور کس حد تک خائف ہیں، میونسپل بورڈ کے موافق اور مخالف ممبران کے جوش کا اب کیا حال ہے۔ ضلع کلکٹر شہر میں بیٹھا کن خطوط پر سوچ رہا ہے، اس بات کی فکر کی آنچ بھی ان کے ذہن کے کسی اجاڑ گوشے میں دھیمے دھیمے سلگ رہی تھی۔

نیلے کے انجام کے بارے میں وہ آخری فیصلہ لے سکتے تھے، لیکن انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ فیصلہ نہیں لیں گے، پہلے اس معاملے کے ہر پہلو کا باریکی اور گہرائی سے جائزہ لیں گے۔ لیکن باریکی اور گہرائی سے جائزہ لینے کے لیے وقت کی ضرورت تھی۔ نیلے کو کسی غیر نے دیکھ لیا تو وقت ملنا مشکل ہو جائے گا۔ تبھی انھوں نے ایک فیصلہ کیا۔

بڑے کی کھڑکی کے پاس جا کر آواز دی۔

"پرتاپ... او پرتاپ... باہر آؤ بیٹا!"

ان کی آواز سن کر اندر کمرے میں اچانک چوڑیاں کھنکیں۔ وہ کھڑکی سے دور ہٹ آئے۔

تھوڑی دیر بعد پرتاپ باہر آ گیا۔

"نیلا ہماری گڑھی میں آ گیا ہے،" انھوں نے بغیر کسی جذبے کے یہ جملہ ادا کیا۔ دوسروں کا ردعمل جاننے کی ابتدا وہ گھر سے ہی کرنا چاہتے تھے۔ پرتاپ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ بنیادی طور

Scanned with CamScanner

سے اچھا آدمی تھا۔

"بابو! اب اس کا ڈر یہاں نہیں ہوگا۔ گاؤں والے، قصبے والے، یہاں تک کہ شہر کا کلکٹر بھی، سب کے سب ہی اس کے دشمن ہو گئے ہیں۔ اور پکی بات تو یہ ہے کہ کوئی مدد بھی نہیں ہے۔ اس نے بہت تباہی مچا رکھی ہے۔" پرتاپ نے گڑھی کے آنگن میں اندھیرے میں کھڑے بیٹے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ بات کہی۔

"لیکن یہ ہمارے لینے کا کام آیا ہے اور کوئی بھی ہتھے کام آ سکتا ہے۔" مسرداس نے اس کی طویل گفتگو کا مختصر سا جواب اس انداز سے دیا کہ اس کا جواب ایک سوال بن کر پرتاپ کی آنکھوں کے سامنے آ کر اساس کرنا چھوڑا۔

"وہ سوچ سوچ کر رک رک کر بولا:

"بابو! یہ گڑھی اور حویلی کی حفاظت کرنا ہے تاکہ ہمارا دھن دولت اور اناج بنا رہے لیکن اتنی بربادی کر دیتا ہے کہ ہمیں اس دھن دولت اور اناج کو سمیٹنے کا وقت بھی نہیں مل پاتا۔ مرے یہ دکھ سنے ہیں کہ آج بیٹے نے ان کا کھیت اجاڑ دیا، کل بیٹے نے ان کا کھلیان اجاڑ دیا۔ کبھی وہ ننھے بچوں کو کچل کر آ جاتا ہے۔ اب وہ بڈھے بے قصوروں کو مارنے چلا ہے۔ کبھی چنے کی جیسے مویشیوں کو ہلاک کر رہا ہے، کبھی چھوٹی چھوٹی مڑیوں پر گرا رہا ہے۔ ہمیں اپنی چیزوں کی حفاظت کے لیے اس جنگلی کی مدد نہیں لینا چاہیے۔ ہم خود چوکس ہو جایا کریں گے"

"تم سورما ہو پرتاپ! اس کا مطلب، تم ان وچار کے آدمی ہو کہ گڑھی میں یا حویلی میں پہلے چور کو آنے کی چھوٹ دے دو۔ جب وہ آ جائے تو چوکنا ہو کر اسے پکڑو۔ ارے سورما! کوشش یہ ہونا چاہیے، اور یہی کوشش میں نے کی تھی، کہ ایسا نقشہ بن جائے کہ کوئی گڑھی اور حویلی میں گھسنے کا خیال بھی من میں نہ لائے۔"

پرتاپ چپ ہو گیا۔ وہ زیادہ دیر تک اپنے باپ سے بحث نہیں کر پاتا تھا۔ میں نے سوچا۔ انھوں نے پرتاپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر رکھا، اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب وہ پرتاپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کوئی بات کہتے ہیں تو وہ کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔ بیٹے کو کچھ دن کے لیے مندر والے کھیت میں چھپا دیتے ہیں۔ یہ اندازہ کرنے میں کہ لوگوں کا اس کے بارے میں کیا وچار بن رہا ہے۔۔

انھوں نے صرف پرتاپ اور گڑھی کے دونوں پہرے دار نوکروں کو اپنا ہمراز بنایا۔

اندھیرا سا ہو گیا تھا۔ دونوں پہرے دار نیلے کو گڑ اور بادام کھلاتے ہوئے آہستہ آہستہ رات کے پچھلے سناٹے میں گڑھی سے باہر لے گئے۔ اس کے زخموں پر ہلدی تھوپ دی گئی تھی جس سے بدن کیسریا ہو گیا تھا۔ تنگ گلیوں سے نکال کر آموں کے باغوں کے برابر سے ہوتے ہوئے مندروالے ارہر کے گھنے کھیت کے پاس پہنچے۔ ایک اسے لیے کھڑا رہا، دوسرا اندر جا کر کھیت کے بیچوں بیچ پودے کاٹ کر جگہ بنانے لگا۔ پھر دھیرے دھیرے بیلے کو کھیت میں داخل کر کے اس جگہ پہنچے۔ نیلا اس کھیت سے مانوس تھا۔ اکثر وہاں آیا کرتا تھا۔ اس نے فی الوقت کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اندر ایک موٹا سا کھونٹا ہاتھ بھر زمین میں گاڑ کر نیلے کی گردن میں رسان کے ساتھ رسی باندھ دی۔ رسی لمبی تھی، اتنی لمبی کہ نیلا آسانی سے چل پھر سکتا تھا۔ دوسرے پھیرے میں بہت سا چارا، بہت سا موٹا اناج اور بہت سا گڑ اور بادام لا کر اس کے پاس رکھ دیے گئے۔ ناند میں اوپر تک پانی بھر کر ناند وہیں مٹی میں جما دی گئی۔

واپسی میں سایوں کی طرح رینگتے ہوئے دونوں پہرے دار گڑھی میں پہنچے اور نمبردار کو بیلے کے اس کچے انتظام کی پکی خبر دی۔ نمبردار اودل سنگھ نے، جو اتنی دیر سے سانس روکے بیٹھے تھے، ایک بڑی سی اطمینان بھری سانس باہر چھوڑی۔ 'اب تم باہر جا کر اطمینان سے سو جاؤ۔ بہو سے کچھ نہ کہنا...' انھوں نے ایسے یقین سے کہا گویا شوہر لوگ بیویوں سے راز چھپا پاتے ہوں۔ ویسے بھی بڑی بہو نے کھڑکی کی اوٹ سے منظر کا آدھا حصہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

نمبردار صبح اٹھے تو سب سے پہلے گاؤں کا ایک چکر لگایا۔ لوگ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی کہ آج بہت دنوں بعد نمبردار کو گاؤں پر ٹوٹ کر پیار آیا ہے، اور وہ بھی ہر گلی پر۔

عورتوں نے انھیں دیکھ کر گھونگھٹ کاڑھ لیے اور مردوں نے ان کے پاس اکٹھا ہو کر نیلے کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ 'کیا ہوا نمبردار جی، نیلا ملا کہ نہیں؟'

'بھئی کوشش تو جاری ہے۔ ایک ذرا سے جانور کو ڈھونڈنے کے لیے قصبے میں بیسیوں پولیس والے اور قصبے والے رات دن ایک کیے ہوئے ہیں،' انھوں نے گول مول بات کی۔

لیکن ان کی اس گول مول بات میں بھی کچھ لوگوں نے اچھے خاصے چوکور مطلب نکال لیے۔ دراصل 'ذرا سے جانور' اور 'بیسیوں پولیس والے اور قصبے والے لوگوں کی کوشش' والا جملہ ـــــ

سردار دونوں بیٹوں کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ اس بات کا متقاضی تھا کہ لوگ گھر اکر ان کے سامنے ہمدردی کا اظہار کریں۔

کئی دن سے دیکھا نہیں تو کچھ عجیب عجیب سا لگتا ہے۔ ان سے ایک پڑوسی نے سنبھل سنبھل کر جملہ بولا۔

پنڈت جی کے محلے سے راستہ کھل گیا تھا۔ ان کے تمام ہمدرد ہو ... بھی قد کھڑے کھڑے ان کی طرف ہو گئے تھے۔

جانے خدا جب کو کن رنگ چاہ، کسی طرح سے نہیں دوسرے نے تاسف کرتے ہوئے لہجے میں اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

پچھلے کئی مہینوں سے وہ بالکل چپ چاپ ہو گیا تھا۔ چلتے چلتے رک جاتا تھا۔ تیسرے نے انکشاف کیا۔

اس انکشاف پر سردار کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مگر صورت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے انھوں نے اپنا منہ جلدی سے بند کر لیا اور سوچا ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔ دراصل یہ بات سچ ہی تھی۔ بیٹا چلتے چلتے رک جاتا تھا اور رک کر اس شخص پر حملہ کرتا تھا جو سب سے نزدیک ہو۔

چوتھے نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ابھی پندرہ دن پہلے میں کھیت سے ہل چلا کر واپس آ رہا تھا تو دیکھا، سردار کا بیٹا میرے سامنے کھڑا ہے۔ جیسے ہی سورج ڈوبتا ڈوبے، سردار کے بیٹے نے مندر کی طرف منہ کر کے ڈنڈوت کی اور دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

باقی لوگوں کے چہرے پر عقیدت کی روشنی جگمگ جگمگ کرنے لگی۔

شاکر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اندازہ کیا کہ جن جن کے گھروں کے برتن بیٹے نے توڑے تھے، جن کے بچوں کو کچلا تھا اور جن جن پر حملہ کیا تھا، وہ ان لوگوں کی ہم نوائی نہیں کر رہے ہیں۔ خاموشی سے ایک دوسرے سے بس خاموش نگاہی سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں

ان کے ہمراہ لوگ ان کے ساتھ چلے۔ باقی لوگ پیچھے رہ گئے تھے۔ انھوں نے واضح سنا، وہ سردار اور بیٹے دونوں کو سرگوشیوں میں گالیاں دے رہے تھے۔

راستے میں مندر کے پاس رک کر انھوں نے ہاتھ جوڑے۔ پجاری جی باہر نکل آئے۔ انھوں نے اپنے ساتھ کے لوگوں کو سنانے کے لیے پجاری جی سے پوچھا۔ تھیلے میں اٹکھیلیاں کر کے نیلا

بھاگا تھا، آپ نے ادھر تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں بیٹا..." پھر کچھ رک کر انھوں نے جملے کو آگے بڑھایا، "ہو سکتا ہے، پاپیوں کی بستی سے کچھ دنوں کے لیے کہیں دور چلا گیا ہو۔" نمبردار نے سوچا، ساتھ والے دیہاتی خود کو 'پاپی' نہ سمجھیں۔ انھوں نے اپنے جملے میں اس کی وضاحت کر دی۔

"ہاں مہاراج! قصبے والے ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ دراصل وہ مجھ سے دشمنی نکالنا چاہتے ہیں۔" وہ یہ کہہ کر چلنے لگے۔

"تو چنتا نہ کر نمبردار، انت میں اچھائی کی برائی پر جیت ہوتی ہے..." پجاری جی نے نمبردار کو چلتے چلتے آشیرواد دیا۔

نمبردار سب کو ساتھ لے کر آگے بڑھ لیے تھے۔ کچھ یاد آیا، رکے اور گھوم کر دیکھا۔ پجاری جی وہیں کھڑے تھے۔ انھیں لگا جیسے پجاری جی کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر ساتھ کے آدمیوں کی وجہ سے کچھ سنکوچ میں ہیں۔

نمبردار کو کچھ یاد آیا۔

"ارے مہاراج، ادھر میں بہت کام کاج میں لگا رہا... دھیان نہیں رہا۔ مندر کے گیہوں، گڑ اور کپڑے ابھی نہیں پہنچا پایا ہوں۔ آج ہی شام کو آدمی دے جائے گا۔"

مہاراج نے اطمینان کی سانس لے کر پھر آشیرواد دیا۔ اس بار انھوں نے ہاتھ اٹھا کر بڑا والا آشیرواد دیا تھا۔

بس اس ہیڈماسٹر کے بچے کے خیالات اور معلوم ہو جائیں، انھوں نے امرائی کے پاس کمر جھکے شکستہ اسکول کو دیکھ کر سوچا۔

ہیڈماسٹر سے ان کے تعلقات عجیب نوعیت کے تھے۔ ضلع کلکٹر اور شہر کے پڑھے لکھوں کو دکھانے کے لیے گاؤں میں اسکول ہونا ضروری تھا، اس لیے اسکول تھا۔ اسکول کا خرچ گرام پنچایت اٹھاتی تھی جس میں ساری بات نمبردار کی چلتی تھی۔ لیکن ہیڈماسٹر نمبردار اودل سنگھ کی بے جا خوشامد نہیں کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ حرکت ایک معقول حرکت نہیں کہی جا سکتی۔ نمبردار کو دیہات کے بچوں کی تعلیم بہت اکھرتی تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ سارے لونڈے جنھوں نے اس اسکول میں تعلیم پائی تھی ان سے، اتنے خوش نہیں رہتے تھے جتنے وہ لونڈے جنھوں نے تعلیم

Scanned with CamScanner

نہیں پائی تھی۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ بات بھی خود نکال لی تھی کہ انھیں یہ ہیڈ ماسٹر بچوں
کو تعلیم دینے کے بجائے سرور کی برائیاں کو نہیں کرتا۔ اس جاسوسی کے نتیجے میں انھیں راہ
راست شکایت موصول نہیں ہوئی، بلکہ خود بچے والوں نے سرور کو یہ مشورہ دیا تھا کہ آج کل اسکول
کی جو کتابیں چھپتی ہیں ان میں جو مواد ہوتا ہے وہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کو پڑھ کر لونڈے لوگوں کو
سرور کا میاں آچار ہوگا۔ مثلاً بہادر عورت کا وہ حصہ نصاب میں ہوتا، یا سروری سے جس میں کسی کا
درست عورت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس طرح زبان کا پاٹھ ہوں ملے ذکر کے نتیجے بھی ہو سکتا
ہے۔ انھوں نے تاریخ کی کتابوں پر بھی مداخلت کی ... بتا کہ ہیڈ ماسٹر جان بوجھ کر ان
حصوں کو سب تفصیل کے ساتھ پڑھاتا ہے جن حصوں میں مشرق، مسولینی وغیرہ
کا ذکر آتا ہے۔ ان لوگوں کی نظروں سے معاشیات کی ... سے وہ محدودیت جیسے بھی نہیں بچ سکے
جن کو پڑھ کر لونڈے خود کو سب سے بڑا سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لیے وہ حصے بھی مناسب نہیں
تھے جن میں ... انقلاب کی ضرورت اور تعلیم دی جاتی تھی۔

سرور نے نصاب سے متعلق شکایات کی ان تحریروں کو ہیڈ ماسٹر کے سامنے رکھا تھا۔
ہیڈ ماسٹر پہلے تو پریشان ہو گیا تھا۔ پھر ہنسنے لگا تھا۔ اس کی ہنسی کو کسی حد تک وہ ان سطروں کی
سمجھ میں آئی تھی کہ اس ہنسی کو انھوں نے بدتمیزی پر محمول کیا تھا۔

آپ جانتے ہیں کہ آپ اس اسکول میں کس کی وجہ سے ہیڈ ماسٹر ہیں؟ میری وجہ سے،
کیسے۔ تب ہیڈ ماسٹر نے دھیمی آواز میں ان کو بتایا:

اول تو یہ کہ میں ہیڈ ماسٹر نہیں صرف ماسٹر ہوں، کیوں کہ میرے علاوہ اسکول میں کوئی
ماسٹر نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ میں بچوں کو تعلیم دیتا ہوں اور اس کے بدلے میں گرام پنچایت
مجھے مہینہ کے تین تین مہینے بعد تنخواہ دیتی ہے۔ تیسرے یہ کہ اتنی کم تنخواہ میں تین
ماسٹروں کا کام اس دیہات میں میرے علاوہ کون کرے گا؟

سرور کو سچائی کے اس قسم کے زوردار اور بے تکلف اظہار سے بڑی الجھن سی ہوئی
تھی۔

اگر میں گرام پنچایت سے کہلوا کر آپ کو نکلوا دوں تو؟ تو کہنے کے لیے جتنا منھ کھولنا
ضروری ہوتا ہے انھوں نے اس سے زیادہ کھولا اور دیر تک کھولے رکھا۔

تو یہ ہوگا کہ گاؤں میں آپ کی شو شو ہوگی اور جب یہ بات قصبے تک پہنچے گی تو اگلے الیکشن میں آپ کے خلاف یہ بھی ایک نکتہ استعمال کیا جائے گا۔

نمبردار نے پھر بڑا سا کھلا ہوا منہ جلدی سے بند کر لیا کیوں کہ وہاں تک نمبردار ودل سنگھ کی عقل نہیں گئی تھی اس لیے وہ ہیڈ ماسٹر کی اس اطلاع سے نروس ہو گئے تھے۔ تب انھوں نے پینترا بدل کر کہا تھا:

"میں نے تو ہیڈ ماسٹر صاحب، آپ کی گہرائی جاننے کے لیے اتنی باتیں کیں۔ آپ کا رہنا اور یہاں رہ کر بچوں کو تعلیم دینا گاؤں کی شوبھا بڑھاتا ہے۔ بلکہ آپ مجھے یہ کہنے دیجیے کہ یہ گاؤں آپ اور آپ کے سکول کے بغیر ادھورا ادھورا سا لگتا ہے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔

ہیڈ ماسٹر اپنی چرچ چوں سائیکل پر بیٹھ کر اسکول کی طرف بڑھ گیا تھا۔

انھیں ماسٹر کا ایک جملہ اور یاد آیا۔

جنگلی جانور کو گڑ ہو دام کھلا کر اور سرسوں کا تیل پلا کر نمبردار نے اس کی بدھی بھرشٹ کر دی ہے۔ یہ پراکرتی کے خلاف ہے۔"

آج وہ اسی ہیڈ ماسٹر کے پاس کسی نیلے کے بارے میں اس کی تازہ رائے جاننے کے لیے نکلے تھے۔

ہیڈ ماسٹر سکول میں بیٹھا بچوں کو سبق پڑھا رہا تھا۔

نمبردار ایک یاد سے بہت بچتے تھے۔ یاد آتے ہی خود کو دھرم دھرم بنا بیٹھتے تھے۔ مگر آج انھیں اسی ہیڈ ماسٹر سے وہ عجیب و غریب پُر اسرار ملاقات پھر یاد آگئی۔ یہ جب کی بات ہے جب بڑکی کی عزت لوٹی گئی تھی۔ اس پُر اسرار ملاقات سے کچھ دن پہلے کمہار کی بیوہ اور بڑکی اور چھٹکی نے اسکول کی چھٹی کے بعد سکول کے باہر نیم کے درخت کے نیچے ماسٹر صاحب کا انتظار کیا تھا۔ جب وہ اسکول بند کر کے وہاں سے گزرے تو کمہارن نے ان کے پاؤں پکڑ کر رو رو کر کہا تھا کہ نمبردار کا نیلا روزانہ ان کے محنت سے بنائے ہوئے برتن توڑ دیتا ہے۔ وہ آج شکایت لے کر ٹھاکر کے پاس گئیں تو ٹھاکر نے ہنس کر ان سے کہا کہ برتن توڑتا ہے، مٹی تو نہیں کھا جاتا ہے۔ اسی مٹی کو پھر سے گوندھ گوندھ کر برتن بنا لیا کرو۔ اس میں اتنی پریشانی کی کون سی بات ہے جو مجھے کلیوا کے وقت پریشان کر رہی ہو۔"

ہیڈ ماسٹر نے ان دونوں کو دھارس دی اور گاڑی میں جا کر سرور کو سمجھایا۔ نمبردار نے تو ہنس کے ٹال دیا مگر دکاندار کا چہرہ سرخ ہو گیا جو وہیں کھڑا سب کچھ سن رہا تھا۔

گاڑی کے دروازے پر تینوں عورتیں کھڑی ماسٹر کا انتظار کر رہی تھیں۔ جب ماسٹر بڑے دروازے سے نکل رہا تھا تو اس نے دکاندار کو غصے کی حالت میں کمہارن اور اس کی بیٹیوں سے بات کرتے دیکھا۔ وہ ان تینوں کو ننگی ننگی گالیاں دے رہا تھا جن کی آج اتنی ہمت ہو گئی کہ وہ پنچایتی سکول کے ماسٹر تک اس کے باپ کے پاس بیٹے کی شکایت لے کر گئیں۔ ماسٹر کو آتا دیکھ کر اس نے نسبتاً شائستہ لہجے میں ان دونوں لونڈیوں کو میٹھے مارنے والی نظروں سے دیکھ کر کہا تھا:

وہ دونوں لے کا شکر کرو کہ ابھی نیچے نے کی ران توڑے ہیں۔ میں نے تو ابھی برتنوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وہ جاہل عورتیں کیا سمجھتیں، مگر ماسٹر کا ماتھا ٹھنک گیا۔ وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔

جب لڑکی کا سوچ چڑھے دو ... وہ ختم ہو گیا تو ایک رات ٹھاکر جیب میں سو روپے رکھ کر گاؤں کی گاڑی تک آئے اور اتر کر تھکے تھکے قدموں سے جب گاڑی کے دروازے پر پہنچے تو دھندلکے میں انھیں ایک شخص رضائی اوڑھے کھڑا دکھائی دیا۔ وہ آدمی دھیمے دھیمے رو رہا تھا۔ انھیں اس پراسرار شخص سے ڈر محسوس ہوا۔ وہ پھر سے دروازے کو آواز دینے ہی والے تھے کہ اس شخص نے رضائی سے منہ نکال لیا۔ اس کی بوڑھی آنکھیں سرخ تھیں اور سوجی تھیں۔ اس نے مدھم مدھم آواز میں ٹھاکر سے کہا،

صبر کریں جی! لڑکی کی عزت معلوم ہے کس نے ...؟

کس نے؟ ٹھاکر نے مری مری آواز میں پوچھا۔ انھیں اس سوال کے جواب اور ہیڈ ماسٹر کے اس پراسرار روپ سے ڈر لگ رہا تھا۔

اس نے ... ادھر دیکھو ... ٹھاکر نے اس کی انگلی کے اشارے پر نظریں دوڑائیں۔ سامنے اندھیرے میں ہیولا کھڑا تھا۔ ہیڈ ماسٹر انھیں حیران دیکھ کر ہنسا تھا اور پھر اندھیری گلی میں غائب ہو گیا تھا۔ ٹھاکر نے جلدی سے اس یاد کو اپنے ذہن سے جھٹکا۔ نمبردار اور ان کے ساتھ والوں کو دیکھ کر اس نے جلدی جلدی سبق ختم کر دیا، سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور سلام کر کے خاموش کھڑا ہو گیا۔

پھر بولا:

میرا دل چاہتا ہے کہ آپ میرے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چل کر بیٹھیں۔
نمبردار کو اس معمولی گزارش میں ایک طرح کی ملامتی قسم کی گستاخی نظر آئی۔

"نہیں نہیں ہیڈ ماسٹر صاحب... بس بہت دن سے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔ سوچا آپ سے سلام دعا کر لیں۔ ہم لوگ ادھر نیلے کی تلاش کر رہے ہیں۔ آپ نے تو نہیں دیکھا؟" نمبردار نے یہ کہہ کر ماسٹر کے چہرے کو گہری نگاہوں سے کریدا اور اپنے ذہن کی داد دی کہ کیسے انھوں نے سمجھ لیا کہ ہیڈ ماسٹر کے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر لے جانے والے جملے کا مطلب تھا کہ نمبردار بھی اس کی شاگردی اختیار کر کے علم کی بلندیاں چڑھ کر اس کی اونچائی تک پہنچ جائیں۔ انھوں نے ایک بار پھر اپنی عقل کو داد دی اور ایک بار پھر ہیڈ ماسٹر کے چہرے کو اپنی نظروں سے کریدا۔ کیوں کہ ہیڈ ماسٹر کے چہرے پر شیو بڑھا ہوا تھا اس لیے وہ اس کے چہرے کو اپنی نظروں کی مدد سے زیادہ نہیں کرید پائے۔

"نہیں ادھر تو نہیں دیکھا۔ لیکن میں نے آپ کو پہلے ہی سمجھایا تھا کہ ایسے وحشی جانور کو اگر پالنا ہی ضروری ہے تو وہی کھانا پانی دیں جو اسے جنگل میں ملتا ہے اور اسے انسانوں کی صحبت سے دور رکھیں، ورنہ اس کا وہ فطری ڈر ختم ہو جاتا ہے جو ہر جانور کو انسان سے محسوس ہوتا ہے۔"

نمبردار کو اندازہ ہو گیا کہ ہیڈ ماسٹر کی نیلے کے بارے میں تازہ رائے کیا ہے۔ ہیڈ ماسٹر کی تازہ رائے ہیڈ ماسٹر کی باسی رائے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اب نمبردار نے اسے علم کے وار سے گھائل کرنا مناسب سمجھا۔

"ہیڈ ماسٹر صاحب، میرے بہت سے دوست ہیں، آسام سے لے کر گجرات اور بہار سے لے کر تمل ناڈو تک۔ آسام والے نے قاضی رنگا سے ایک نیلا پکڑ کر پالا، گجرات والے نے گیر کے جنگل سے نیلا لا کر اپنے ساتھ رکھا۔ ترائی والے دوست نے دودھوا کے جنگل سے نیلا حاصل کیا اور تمل ناڈو والے نے باندی پور کے جنگل سے پکڑ کر اپنا پالتو بنایا۔ مگر آپ کو میرے ہی نیلے میں ساری برائیاں نظر آتی ہیں..."

"نمبردار! آپ سچ سچ بتانا، کیا آپ کے دوستوں نے جو نیلے پالے وہ بڑے ہو کر قیمتی عد نہیں بن کر جنگل میں دوڑنے کی محنت اٹھانے بغیر چارا کھا کر، کیا مست نہیں ہوئے؟ کیا بربادی نہیں مچائی؟"

نمبردار نے اس بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ خود اپنے نیلے میں اتنی بری طرح الجھے رہتے تھے کہ انھیں اپنے دوستوں کے نیلوں کا زیادہ دھیان ہی نہیں آتا تھا۔

Scanned with CamScanner

انھوں نے بات بدلنے کی خاطر پوچھا:

"اب تو ماسٹر صاحب، آپ ہی بتائیے، اب کیا کیا جائے؟"

"پہلے تو آپ بیلا ڈھونڈیے۔ وہ جہاں کہیں جائے گا تکلیف اٹھائے گا۔ اس کی عادتیں خراب ہو چکی ہیں۔ اسے ڈھونڈ کر اپنے پاس باندھ کر رکھیے، اور آہستہ آہستہ اس کی بری عادتیں چھڑوائیے۔ اس کی عادت بدلیے۔ اسے یہ احساس دلائیے کہ اس کی غلطی کی سزا اسے مل رہی ہے۔ حالاں کہ اس میں پریشانی تو ہوگی مگر یہ تو اب کرنا ہی پڑے گا۔ جب وہ اپنی عادت کا عادی ہو جائے تو اس کو میدانوں میں چھوڑ آئیے۔ اس کی چربی بھی کچھ کم ہو چکی ہوگی، اور چربی کم ہونے سے وہ میدان میں دوڑنے میں تکلیف نہیں محسوس کرے گا۔ میدانوں میں ساتھ دوڑنے سے جب اسے پھر جنگل کی عادت پڑے گی اور اپنے ساتھی ملیں گے اور وہ انھیں ملیں گے تو اس کا احساس ختم ہو جائے گا اور پھر سے فطری زندگی کا عادی ہو جائے گا...."

"لیکن میری گڑھی اور حویلی کا کیا ہوگا؟" شاید اس کے منہ سے نکل پڑا۔

"اس کا کیا مطلب؟"

"نشانہ لگانے والوں کے منہ سے حماقت کی بات نکل گئی ــــ یعنی صحیح بات نکل گئی۔ مگر بعد میں سنبھل گئے۔ مطلب، گڑھی اور حویلی میں اسے دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ وہ نظر نہیں آئے گا تو کتنا برا لگے گا۔"

"صاحب جی! گڑھی اور حویلی میں اپنے بیٹے اور بہو اور پوتے پوتی اور گاؤں والوں اور قصبے والوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو جیے، اور انھیں میں اپنی دل چسپی کا سامان پیدا کیجیے۔ انھیں میں آپ کی زندگی ہے اور انھیں سے آپ کی زندگی ہے۔ جنگلوں کے لیے اب اپنا شوق ختم کیجیے۔ آپ کا یہ شوق اس بیل کو بھی مہنگا پڑ رہا ہے اور گاؤں اور قصبے والوں کو بھی۔ گڑھی اور حویلی میں ہی آبادی بچی ہوئی ہے۔ آج جا کر آپ اس کا پتا لگا کر سوچیے کہ کیا کارن ہے جس کی وجہ سے آپ کو نیلے کی چاہ ہے۔ جب وہ کارن سمجھ میں آ جائے تو اس کارن کی جڑ کاٹ کر پھینک دیجیے۔"

صاحب جی ... سنگھ جب وہاں سے آئے تو بظاہر وہ اپنے ساتھ والوں سے ہیڈماسٹر کی حماقت آمیز باتوں پر ہنس ہنس کر مذاق بنا رہے تھے، لیکن اندر سے انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ جاہل ہیڈماسٹر نے ان کی دکھتی نس پر انگلی رکھ دی ہے۔

گاڑی میں واپس آ کر وہ چھت پر چڑھ گئے اور وہاں انھوں نے دور مندر کے کھیت میں کھڑے نیلے کو محسوس کیا اور اس بات سے مطمئن ہوئے کہ سردیوں کا زمانہ ہے، ورنہ گرمی ہوتی تو نیلا اتنی دیر تک کھیت کی گرمی کی تاب نہ لا پاتا۔ وہیں کھڑے کھڑے انھوں نے نیلے سے پیدا ہونے والی دہشت کو محسوس کیا اور اس دہشت کے سائے میں قطرہ قطرہ بڑھتی دولت اور بیچ بیچ بڑھتے اقتدار اور حقیر کا لقمہ لقمہ ہضم کیا۔ اور جب وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے تو ایک طرف تو ان کا ذہن کہہ رہا تھا کہ نیلے سے چھٹکارا حاصل کر لو اور دوسری طرف کوئی چپکے چپکے کہہ رہا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے کان لگا کر سنا تو یہ دوسری آواز ان کے سینے کے بائیں طرف سے آئی تھی۔

جب وہ آنگن میں آ کر مونڈھے پر بیٹھے تو چراغ جل چکے تھے۔ باہر سے پہرے دار دوڑتے ہوئے آئے اور انھیں اطلاع دی کہ نیلا اربر کے کھیت میں سے رسی تڑا کر بھاگ گیا ہے۔

ان کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ قصبے میں پہنچ جائے۔ اب کوئی بربادی ہوئی تو بڑی بدنامی ہوگی۔

وہ جیپ پر بیٹھ کر ہوا کی رفتار سے قصبے کی طرف روانہ ہوئے۔ پرتاپ روکتا ہی رہ گیا۔

قصبے کی گلیوں میں اسٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی تھی۔ لیکن انسان نہیں تھے۔ سب اپنے اپنے گھروں میں کنڈی لگائے بیٹھے تھے۔ چوراہوں پر پولیس والے کھڑے سیٹیاں بجا رہے تھے اور آوارہ کتے خلاف معمول اتنی جلد بازار سونا دیکھ کر منحوس آوازوں میں رونے لگے تھے۔

نیلا قصبے میں کسی بھی گھر کے پاس کھڑا مل سکتا ہے۔ یا ہو سکتا ہے قصبے کے باہر کھیت یا کسی اجڑے ہوئے باغ میں کھڑا ہو۔ حویلی تک جانے والی سڑک کے ایک موڑ پر جیسے ہی وہ مڑے، انھیں ایک سایہ سا نظر آیا۔ خوف کی ایک ٹھنڈی لہر ان کی گدی سے ہوتی ہوئی پوری پیٹھ پر پھیل گئی۔ یہ نیلے کا ہی سایہ ہوگا، کہ انسان تو سارے اسی کے ڈر سے گھروں میں بند بیٹھے ہیں۔

حویلی کے صحن میں جا کر انھوں نے نیلے کو ہر طرف تلاش کیا۔ وہ کہیں نہیں ملا۔ بجلی چلی گئی تھی اور رات بالکل تاریک تھی۔ وہ بیٹھک میں اکیلے بیٹھے سوچتے رہے اور ڈرتے رہے۔ رات بارہ بجے کے بعد کسی وقت ان کی آنکھ لگ گئی۔ اچانک پورے قصبے میں چیخ پکار کی لپٹیں اٹھنے لگیں۔ حویلی کے نوکروں میں بھی بھگدڑ مچ گئی۔

Scanned with CamScanner

وہ جلدی سے اٹھے اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اندھیرے میں کوئی جانور تیز تیز سانس لیتا ہوا بھاگا جا رہا تھا۔ وہ اندازہ نہیں کر پائے کہ وہ کدھر گیا۔ اچانک پھر ایک جانور مخالف سمت سے بھاگتا ہوا آیا اور دوڑتا چلا گیا۔

انھوں نے سامنے کی گلی کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہاں بھی ایک سیاہ سایہ کھڑا تھا۔ انسانوں کا شور اور پولیس کی سیٹیوں کی آوازیں اب بھی تھمی نہیں تھیں۔ انھوں نے گلی کی طرف پھر دیکھا۔ اب وہ سایہ وہاں نہیں تھا۔

١٦

اس رات ایک ساتھ ۱۲ وارداتیں ہوئیں۔ قصبے کے کوڑے والے محلے کے ایک ہی خاندان کے تین گھروں کے دروازے ٹوٹے ہوئے پائے گئے۔ بازار کی پانچ دکانوں کے شٹر ٹیڑھے ہوئے تھے اور اندر کی جنس دکانوں میں چاروں طرف بکھری ہوئی ملی تھی۔ تین پولیس والوں پر پیچھے سے کسی جانور نے اندھیرے میں حملہ کیا جو ندی کی پلیا پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میونسپل بورڈ میٹنگ ہال کا دروازہ توڑ کر اندر کی کرسیوں کو سیٹوں سے قلم کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا تھا۔ جو وارداتیں کچی زمین پر ہوئی تھیں وہاں جانور کے کھروں کے نشان پائے گئے تھے۔

میونسپل بورڈ کے آفس میں ڈسٹرکٹ کلکٹر منتظر بیٹھا تھا۔ ٹھاکر اودل سنگھ اور محمود صاحب اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ قصبے کا دورہ کر کے ایس پی صاحب جیپ سے اترے، ان کے ساتھ ہی قصبہ انچارج کوتوال۔ ہال میں آ کر ایس پی صاحب ایک کرسی کھینچ کر کلکٹر صاحب کے برابر بیٹھ گئے۔ قصبہ انچارج سامنے آ کر اٹینشن کھڑا ہو گیا۔

"آرام سے۔" ایس پی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ آرام سے ہو گیا۔

"آپ نے نتیجہ دیکھ لیا" کلکٹر نے خاموشی توڑی۔

سب لوگ چپ بیٹھے رہے۔ محمود صاحب نے بھی سر جھکا لیا۔ اودل سنگھ کی بدنامی اور

بے عزتی اتنی واضح تھی کہ محمود صاحب کی مزید کھٹک کی ضرورت نہیں تھی۔

"مگر یہ ساری وارداتیں ایک ہی نیلے کی کارستانی نہیں ہیں،" ایس پی نے انکشاف کیا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ کئی نیلے ہیں؟" کلکٹر صاحب نے پوچھا۔

"نہیں، یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن پولیس والوں کا بیان تھا کہ ان پر جو حملہ ہوا اس میں ایک سے زیادہ جانور ملوث تھے۔" ایس پی کے اس جملے سے نمبردار اودل سنگھ کے بدن میں کچھ جان پڑی۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟ کچھ اندازہ؟"

"قصبہ انچارج سے بات چیت کے دوران اندازہ ہوا کہ کچھ روز پہلے کاکی باؤس سے نیلے نے جن بجاروں کو آزاد کر دیا تھا وہ اس کے ملزم ہو سکتے ہیں۔ کئی دنوں کے بھوکے پیاسے بجار رات کو جنگل پناہ گاہوں سے نکلے ہوں گے اور پانی پینے نالے پر آئے ہوں گے۔ وہاں سپاہی بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ پانی کے حصول میں مزاحم سمجھ کر حملہ بول دیا ہوگا۔"

"کیا نیلے اور بجار کے کھر کے نشان میں فرق محسوس ہو سکتا ہے؟" کلکٹر صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں سرکار!" قصبہ انچارج بولا۔ "مگر ہوا اتنی چلی کہ ان کے کھر آدھے ہیں آدھے غائب۔ اب پہچان مشکل ہے۔"

نیلے کے کھر کی پہچان والی بات سن کر نمبردار اودل سنگھ نے بڑی بے چینی محسوس کی۔ فوراً بولے، اور کیوں کہ اس بار پہلی مرتبہ بولے تھے اس لیے بات دھیان سے سنی گئی:

"صاحب! بزریا کی دو دکانیں توڑ کر سامان کون اٹھا لے گیا؟ یہ حرکت جانور نہیں کر سکتا۔"

اس بات کو سن کر ایس پی اور تھانا انچارج نے سر جھکا لیا۔ تھانا انچارج کا لمبوترا چہرا اس کے سینے پر لٹک گیا اور دیر تک وہیں لٹکا رہا۔

کلکٹر نے مسوری کی تربیت کے دوران بڑی مادر دایاب باتیں سیکھی تھیں، اس لیے وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا:

"اصل معاملے سے توجہ نہیں ہٹنا چاہیے۔ جب جڑ کا علاج ہو جائے گا تو باقی باتیں خود بخود درست ہو جائیں گی۔ اس پورے فتنے فساد کی بنیاد ہے دراصل ٹھاکر صاحب کا نیلا، جو اب پاگل ہو چکا ہے۔ اس وقت اسی کے بارے میں گفتگو کرنا چاہیے۔ اب آپ بتائیے ٹھاکر صاحب کہ آپ

Scanned with CamScanner

کا فیصلہ کیا ہے؟

جس میں سب کی بھلائی ہو۔ ٹھاکر دین زور دے کر بولے۔

اگر وہ، یعنی آپ کے تو اس کا کیا کیا جائے؟ کلکٹر نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

میرے حوالے کر دیا جائے۔ میں اسے دوبارہ جنگل کی عادت ڈال دوں گا۔ پھر اس کا پاگل پن ختم ہو جائے گا۔ ٹھاکر دل سنگھ نے میڈیا سنٹر والا سبق یاد کرنے کی کوشش کی۔

آپ کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ پھر آزاد ہو کر تباہی مچائے! کلکٹر نے استہزا کے انداز میں کہا۔

ٹھاکر صاحب کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا کلکٹر کو معلوم ہے کہ وہ میرے ہاتھ آ کر نکل چکا ہے؟ پھر انھوں نے خود کو تسلی دی کہ کلکٹر نے یہ بات یوں ہی رو روی میں کہہ دی ہے۔

سیٹھ صاحب! آپ نے بالکل درست فرمایا ہے۔ دیگر قصبوں والوں نے بھی شکایت کی ہے کہ گوریلا نے وہاں بھی تباہی مچا رکھی ہے۔ کل گوریلا شہر میں بھی دیکھا گیا ہے۔ اب یہ معاملہ مقامی نہیں رہا۔ لیکن چونکہ گوریلے کا آپ سے واسطہ ہے، اور اس کا مقام واردات خاص طور پر یہ قصبہ ہے، اس لیے آپ دونوں حضرات قصبے کے معزز شہری کی حیثیت سے اس کاغذ پر دستخط کیجیے کہ گوریلے کی وحشیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے اسے گولی مار دینا مناسب ہو گا۔ یہ درخواست وائلڈ لائف افسر کے نام ہے۔ میں اس سے اجازت نامہ پیشگی حاصل کر چکا ہوں۔ یہ دیکھیے۔ انھوں نے کوٹ کی جیب سے سرکاری مہر والا ایک کاغذ دکھایا۔

محمود صاحب نے تیزی سے اور ٹھاکر صاحب نے دھیرے دھیرے ہاتھوں سے کلکٹر کے دیے ہوئے کاغذ پر دستخط کیے۔ محمود صاحب نے شکر ادا کیا کہ کلکٹر اور ایس پی کسی نے بھی میونسپل بورڈ کے آفس کی توڑ پھوڑ کے بارے میں کسی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ٹھاکر دل سنگھ نے دستخط کرنے کے بعد سوچا کہ یہ معاملہ ختم ہو تو وہ جلد از جلد گڑھی اور حویلی کی ساری دولت نکال کر شہر کے اس بینک میں رکھ دیں گے جہاں چھپے چھپے ہی پیسے لا کر تقسیم ہو، شروع ہوتے ہیں جس کو حاصل کرنے کے لیے نام کا اندراج نہیں کرنا پڑتا، بلکہ کوڈ نمبر دے دیا جاتا ہے۔

مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جانور واردات کر کے چھپ کہاں گئے ہیں۔ ایس پی

Scanned with CamScanner

صاحب بولے۔

"میں کچھ کہوں گا تو کہا جائے گا کہ میں نیلے کی حمایت میں بول رہا ہوں۔ آپ یقین کیجیے، میں نے رات کو چیخ پکار کے بعد اپنی کھڑکی سے تین نیلے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے،" ٹھاکر نے رات کا منظر یاد کیا اور جھرجھری لے کر بولے۔

"کیا وہ نیلے ہی تھے؟" ایس پی نے پوچھا۔

"نہیں... لیکن وہ جانور یقیناً تھے،" ٹھاکر نے جواب دیا۔

"ممکن ہے ٹھاکر صاحب کا نیلا جنگل سے اور وحشی نیلوں کو لا لایا ہو جو اس کے بدن کی موٹی چربی دیکھ کر لالچ میں آ گئے ہوں،" کلکٹر نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"ممکن ہے قصبے کے عام جانوروں نے نیلے کی وحشت کی شہرت کا فائدہ اٹھایا ہو،" ایس پی نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"لیکن یہ سب کچھ بہت خطرناک اور پراسرار ہے،" محمود صاحب نے کہا۔ وہ چاہتے تھے کہ گفتگو نیلے اور دیگر جانوروں سے ہی متعلق رہے، میونسپل بورڈ آفس کی توڑ پھوڑ کا ذکر نہ آ پائے۔

"لیکن بنیاد وہ نیلا ہی ہے،" کلکٹر نے کہا لیکن دل ہی دل میں سوچا کہ دور دراز کی ساری بستیوں سے جن بربادیوں کی خبریں آ رہی ہیں ان سب کا سبب تو یہ اکیلا نیلا نہیں ہو سکتا۔ تمام علاقوں میں کل ملا کر کتنے پالتو نیلے ہیں؟

"وہ اگر ختم بھی ہو جائے تو اس کے ساتھ کے نیلے اور گائے بھینسوں کے بچاروں کا بھی انتظام کرنا ہوگا،" ایس پی نے ان کا دھیان بٹایا۔

"ارے پہلے اس ایک نیلے کو ہی قابو میں کیجیے کپتان صاحب،" کلکٹر نے فکرمند مسکراہٹ کے ساتھ کہا جس میں کچھ کچھ طنز کی چمک سی تھی۔

اس جملے کے بعد سب نے اپنے اپنے سر جھکا لیے تھے۔ خود کلکٹر صاحب کا سر بھی اٹھا ہوا نہیں تھا۔

دور آفس سے ملحق پارک کی سیڑھیوں پر کچھ شور سا ہوا۔ گڑھی کا پہرے دار ہانپتا کانپتا روتا چلاتا بھاگا چلا آ رہا تھا۔

آفس میں گھس کر اس نے نمبردار کے پیر پکڑ کر کہا:

Scanned with CamScanner

نمسرو رجی، نیلا گڑھی میں آ گیا ہے۔ بڑی بہو کے کمرے پہ ٹکر مار رہا ہے۔ پرتاپ بھیا اور بچے بھی کمرے ہی میں ہیں۔"

باہر سے کلکٹر کا باڈی گارڈ ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"شہر سے وائرلیس میسج آیا ہے کہ وہاں وہی واردات ہو گئی ہے۔"

کلکٹر اور ایس پی شہر روانہ ہونے سے پہلے تھانا انچارج کو نیلا مارنے کا اجازت نامہ اور ضروری ہدایتیں دے گئے۔ وہ جیپ پر چڑھتے چڑھتے وعدہ کر گئے کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر پولیس کی مزید ٹکڑیاں بھیج دیں گے۔

ٹھاکر صاحب کے سینے میں پنکھے چل رہے تھے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ کانپتے ہوئے قدموں سے جیپ پر چڑھے اور چند ہی منٹوں میں، لیکن اپنے حساب سے کئی گھنٹوں میں، دیہات پہنچ پائے۔ گڑھی کے سامنے چھنکی کا جھونپڑا چڑیا کے گھونسلے کی طرح لٹا لٹا پڑا تھا۔ گاؤں کے سب لوگ دہشت زدہ اپنے اپنے گھروں میں بند تھے۔ جھونپڑے کے باہر چھنکی کی کھوندی ہوئی لاش پڑی تھی۔ بچے کمرے میں بند تھے۔ اور پرتاپ اور بڑی بہو گڑھی کے دروازے کی سلاخوں سے لگے کھڑے کانپ رہے تھے۔ نیلے کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

"وہ ہمارے دروازے پر ٹکریں مار مار کر لہولہان ہو گیا تھا۔ دروازہ بہت مضبوط تھا، ٹوٹا نہیں۔ وہ گڑھی میں چاروں طرف بھاگ بھاگ کر کسی کو تلاش کر رہا تھا۔ شاید آپ کو ہی تلاش کر رہا تھا۔ چاروں طرف سے اس پر یورش ہے، بس آپ کو ہی اپنی پناہ سمجھتا ہے۔" پرتاب نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتایا۔

"جیسے ہی وہ گڑھی سے باہر نکلا ہم نے کمرے سے نکل کر گڑھی کا دروازہ بند کر لیا۔ وہ چھنکی کے جھونپڑے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا.. بڑی بہو کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

پھر اس نے ڈر سے کانپتے ہوئے، شرم سے آنکھیں جھکائے ہوئے بتایا، "اپنے جھونپڑے میں چھنکی ہر مہینے کپڑے کے چیتھڑے رکھ دیتی تھی۔ جیسے ہی وہ اس دفعہ کے چیتھڑے رکھ کر مڑی، نیلا پیچھے کھڑا تھا۔ وہ چیخ کر جھونپڑے میں گھس گئی اور ٹٹر بند کر لیا۔ نیلے نے گردن اٹھا کر ان چیتھڑوں کو سونگھا اور انھیں سونگھتے ہی دو پیروں پر کھڑے ہو کر دیوانوں کی طرح زمین پر لوٹنے لگا۔" بڑی بہو بیان کرتے کرتے تھک گئی تھی۔

تب پرتاپ نے واقعہ بیان کرنا شروع کیا، "پھر وہ، ٹھا اور پیروں پر کھڑا ہو کر کسی ان دیکھے انسان سے لڑنے لگا جیسے کسی پر قابو پانا چاہتا ہو... پھر اس نے چھٹکی کی چیخیں سنیں۔ اس نے سینگوں کے ایک ہی ریلے میں ٹٹر توڑ دیا اور اگلی ٹانگیں اٹھا اٹھا کر چھٹکی کو کھوندنا شروع کر دیا۔ جب وہ بے دم ہو کر گر پڑی تو نیلے نے چھپر کا تنکا تنکا الگ کر دیا" پرتاپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جو مسلسل بہہ رہے تھے، مگر بیان کے زور میں وہ انھیں پونچھنا بھی بھول گیا۔

انچارج نے چھٹکی کی لاش کا پنچ نامہ کرایا اور شہر روانہ کر دیا۔ انچارج نے ٹھاکر صاحب کے پاس آ کر سرگوشی کی، "وہ آپ ہی کی چاہ میں ہے۔ شاید آپ کے قابو آ سکے۔ ویسے تو اب اسے مارنے کا اجازت نامہ بھی میرے پاس موجود ہے..."

کھیتوں کی طرف سے ہیڈ ماسٹر دوڑتے ہوئے آئے اور بتایا کہ انھوں نے ابھی ابھی نیلے کو مندر والے کھیت میں گھستے دیکھا ہے۔

پولیس کی کئی جیپیں رکیں۔ شہر سے کمک آ گئی تھی۔

ٹھاکر اودل سنگھ نے سوچا، اس بیچ نیلے کو پتی غذ کہیں نہیں ملی ہوگی سی لیے وہ مندر والے ارہر کے کھیت میں چلا گیا ہے۔ وہاں اب بھی اناج گڑ اور بادام رکھے ہوں گے اور ناند میں پانی بھی بھرا ہوگا... اور وہاں کوئی آدمی بھی نہیں ہوگا۔

تھانا انچارج نے گالیاں دے دے کر گاؤں کے مردوں کو ان کے گھروں سے نکالا۔ سب اس بات پر راضی ہو گئے کہ ارہر کے کھیت تک ٹھاکر اودل سنگھ بھی جائیں گے۔

"کیا میں اسے مرتا ہوا دیکھ سکوں گا؟" ٹھاکر اودل سنگھ نے اپنے دل سے پوچھا۔ اس کے دل نے جواب دیا کہ شہر میں سے نئے طریقے کے لاکر آ گئے ہیں... انھوں نے کھیت پر جانے کی ہامی بھر لی۔

تھانا انچارج نے سپاہیوں کو گاؤں کے چاروں طرف بندوقیں دے کر کھڑا کر دیا اور مختلف ہدایتیں دے کر سب کے مورچے درست کرائے۔

لاٹھی، ڈنڈا، سنٹھا، جو جس کے ہاتھ آیا لے کر ارہر کے کھیت کی طرف چلا

"تم دونوں بچوں کو لے کر اپنے کمرے میں بند ہو جاؤ، مگر گڑھی کا دروازہ کھلا رکھنا۔ شاید وہ بھاگ کر ادھر ہی آئے۔ اگر وہ گڑھی میں آیا تو میں دروازہ بند کر کے رام کر لوں گا،" ٹھاکر صاحب

Scanned with CamScanner

نے پرتاپ اور بڑی بہو کو ہدایت کی۔

۱۷

مانتا ہو گئے کے بعد اس کے کھیت سے نکلتے ہی خود کشی اور سر پر لاٹھیاں اور ڈنڈے لگاتار پڑے۔ سیاہ بدن پر تھک تھک خون نکل رہا تھا۔ وہ مدہوش ہو گیا۔ اس کی ایک آنکھ بھی باہر نکل گئی تھی اسی لیے وہ شیر کی طرح جھپٹ جاتا تھا۔ شنکر اور اس سنگھ اسے گاؤں کی طرف ہانکتے ہوئے پچھواڑے والے راستے سے حویلی کے ساتھ گڑھی کی طرف بڑھے۔ لاٹھیاں لیے ہوئے لوگ پچھلے والے راستے سے اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ پیچھے سے بچہ سے تنے ہوئے خون کی چادر کے پیچھے سے کچھ مسلح شخصوں کو گاؤں کی سرحد پر دیکھا۔ اس نے گاؤں والوں کو گڑھی کے پچھلے والے راستے یعنی ٹوٹی ہوئی دیوار سے داخل ہو اور گڑھی کے صحن میں آگیا۔ پرتاپ اور بڑی بہو بچوں کو کمرے میں بند کر کے خود باہر کھڑے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ٹوٹی ہوئی دیوار کے راستے سے آ جائے گا۔ دونوں بھاگ کر بڑی تیزی سے کمرے کی طرف ہو لیے جس کے دروازے میں بچے کھڑے دیوانوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ بڑی بہو کا پیر ساڑی میں الجھا اور وہ لڑکھڑا گئی۔ پیچھے سے آتا ہوا پرتاپ اس سے ٹکرا گیا۔ بہو کمرے کے اندر داخل ہو چکی تھی اور پرتاپ بیلے کے سینگوں سے الجھا ہوا تھا۔ بڑی بہو اضطراری طور پر کمرے سے باہر آئی تو بچے بھی ماں سے لپٹ کر باہر آ گئے۔ وہ گھوم کر بچوں کو پکڑ کر کمرے میں ڈال لیں۔ مگر تب تک دیکھا کہ بیلا پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوا اگلے کھروں سے پرتاپ کا سر پاش پاش کر رہا ہے۔ تب دھول کچھ کم ہوئی تو بڑی بہو نے حیران حیران خالی خالی آنکھوں سے دیکھا کہ پرتاپ زمین پر پرانے لحاف کی طرح ادھڑا پڑا ہے اور نیلا خون کی دھاریوں کے پیچھے سے بڑی آنکھوں کو پٹ پٹ کھول رہا ہے، بند کر رہا ہے اور پرتاپ کی لاش کے چاروں طرف گھومتا، لڑکھڑاتا ہوا چکر لگا رہا ہے، اور گڑھی کے دروازے سے نمبردار اور سنگھ دیوانوں کی طرح چیختے چلاتے داخل ہو رہے ہیں۔

اسے بہت دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ ایک آنکھ شاید بالکل ختم ہو گئی تھی اور دوسری

سر سے بہنے والے خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔

نیلے نے خون سے لتھڑی آنکھیں پٹ پٹائیں، زور زور سے سانس بھری کہ اس کی حصے کی مٹی اڑنے لگی، گردن کو جھٹکا دیا، دُم کو گردش دی اور سینگوں کو آگے کر کے پوری طاقت سے اس آدمی سے ٹکرا کر دیوار تک روندتا چلا گیا۔ جب دیوار سے اس آدمی کا سر ٹکرا گیا تو سینگوں کو گھونپ گھونپ کر اس کی آنتیں نکال کر اپنے کھروں سے کھوندتا رہا اور پھر وہاں کسی کو نہ پا کر ٹوٹی ہوئی دیوار کے راستے کو یاد کے سہارے تلاش کرتا ہوا گڑھی سے باہر نکل گیا۔

بڑی بہو اپنے بچوں کو لے کر چپ چاپ کمرے سے باہر نکلی اور پرتاپ اور بابوجی کی لاشوں کے درمیان کھڑے ہو کر بچوں کو مضبوطی سے پکڑ اور آسمان کی طرف دیکھا۔

پولیس کی گاڑیاں اور گاؤں کا مجمع گڑھی کے دروازے پر اکٹھا ہو گیا تھا۔ انھیں علم نہیں تھا کہ اندر کیا ہوا۔ انھیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ نیلا پیچھے والے راستے سے نکل کر، تالاب پار کرتا ہوا، خون کی چپچپاہٹ سے بند ہوتی آنکھیں دھوتا ہوا زخمی حالت میں کدھر بھاگا ہے۔

پھر سب کو اس بات کی خبر ہوئی کہ زخمی، اندھا اور پاگل نیلا غائب ہو گیا ہے۔

تھانیدار نے تھکے تھکے ہاتھوں سے رائفل خالی کی اور سوچا کہ کیوں کہ وہ زخمی ہے اس لیے کہیں بھی مر سکتا ہے۔

گڑھی کے کچے صحن پر ننگے پاؤں کھڑی بڑی بہو نے دونوں بچوں کے ہاتھ مضبوطی سے تھامے، آنکھیں بند کیے، دل کڑا کر کے سوچ کر کیوں کہ وہ اندھا ہے اس لیے اب کسی کو بھی نہیں پہچان سکتا۔

بوڑھے ہیڈ ماسٹر نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو چھپایا اور سوچ کہ وہ پاگل ہے اس لیے کبھی بھی حملہ کر سکتا ہے۔ اور کیوں کہ وہ غائب ہے اس لیے کسی بھی گلی کو پار کرتے ہوئے، کسی بھی کھیت کی طرف جاتے ہوئے اور کسی بھی راستے پہ چلتے ہوئے اچانک بالکل سامنے، بالکل قریب کھڑا نظر آ سکتا ہے ___ سینگ آگے کیے، سر نیوڑھائے اور اگلے کھر فضا میں بلند کیے۔

لیکن کسی کو بھی یہ سوچنے کی سکت نہیں تھی کہ نیلا گاؤں میں ہی ہے یا گاؤں کے پاس کسی کھیت میں چھپا ہوا ہے یا گاؤں کی سرحد سے دور قصبے تک پہنچ گیا ہے یا قصبے سے بھی آگے خون کے چھینٹے اڑاتا شہر کی طرف بھاگ رہا ہے یا اس سے بھی آگے۔۔

**

اسد محمد خاں

سارنگ

لوغر گریکا نند گنیش نے پلے والا بٹن دبا دیا، سونڈ پھیلا کر آسائش کی سانس لی اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سامنے اسکرین پر جما دیں۔ دیولوک کے وشنو زمری اینڈ کمنڈر گارڈن ود پلانٹ کا گزر آنے میں ابھی دیری تھی۔ لنچ بکس کا ڈھکنا کھولے اور دو چار مودک   لڈو   پیٹ پیسے میں کیا لگتا، مگر گنپتی گنیش کو یاد آیا کہ ماتا پاربتی پر ہے، خود کر میز دیکھ کے چڑ جاتی ہے، کھا لکھا میں تیل کرے گی وہ۔ اس نے ڈھکن لگا لنچ بکس توند پر سے پھسلا دیا اور اپنی چھوٹی آنکھیں اور چھاج ایسے کان پھر سے اسکرین کی اور کر لیے۔

روش سے بیچوں بیچ ایک کدہ پڑا تھا۔ کونے میں ایک مٹکا اور مٹی کا پیالہ دھرا تھا۔ کدے میں اندھیرا تھا، پر سلاخیں لگے دریچے روشن دان سے اندر کچھ چاندنی آ رہی تھی۔ کدّے پر ایک بوڑھا پڑا آرام کرتا تھا۔

دیکھتے دیکھتے بوڑھا کسمسایا اور کروٹ بدل سکے اٹھ بیٹھا۔ سر جھٹک کے اس نے جمائی لی اور کمر سے کھڑا ہو گیا۔ ہے رام! یہ کون گھڑی ہے؟

کن کی ماں وہاں نہیں تھی۔ کوئی بھی نہیں تھا جو جواب دیتا۔ بوڑھا تیزی سے روشن دان

والی دیوار تک گیا۔ دیوار پر ہتھیلیاں ٹکا کر اس نے سر اٹھایا۔ دھیمے اجالے کے اس ماخذ کو دیکھا اور چیخ کے بولا، کوئی ہے؟ ارے کوئی ہے؟' پھر بڑبڑایا، کوئی بولتا ہی نہیں۔'

تھوڑی دیر بعد وہ پھر چیخا، یہ کون جگہ ہے بھائی! بتاتے کیوں نہیں؟ کہیں سے کوئی آواز نہ آئی تو وہ گدے پہ آ بیٹھا اور پنی جانگھ کھجانے لگا۔

اسے کھجاتا دیکھ کے گجانن گنیش کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ اپنی ران پر سونڈ مار کے چنگھاڑا۔ کہیں سے عورت کی آواز آئی، کیا بات ہے؟ گجانن!

"کچھ نہیں ماں! کچھ بھی تو نہیں۔"

پکارنے والی اما تھی، شیو اردھانگی، ماں پاروتی۔

یوٹوک نے جانگھ کھجانی بند کر دی۔ وہ اٹھ کے مٹکے تک گیا، پانی پی کے پھر گدے پہ آ لیٹا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔

گجانند گنیش نے سونڈ سے اپنی توند سہلائی اور بڑبڑایا، بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔

تھوڑی ہی دیر پہلے اس نے بھاری ناشتا کیا تھا۔

یوٹوک کچھ دیر کو سو گیا، پھر جو اٹھا تو دن نکلنے والا تھا۔ روشن دان اور زیادہ اُجل گیا تھا۔ باہر سے کسی گاڑی کے بار بار سلف اٹھنے کی آواز آ رہی تھی، انجن اسٹارٹ نہیں ہو پاتا تھا۔ بیٹری کمزور ہو گئی۔

گنیش نے کان لگا کے سنا۔ یہ وِدیالے کا گرڈ نہیں ہو سکتا۔ اس کے آنے میں ابھی دیری ہے۔ ٹھیک ہے نا۔ گاڑی کی آواز تو اسکرین سے آ رہی ہے۔ اس نے پھر آنکھیں جما دیں۔

Scanned with CamScanner

صبح سے دوپہر، دوپہر سے شام ہو گئی، کوئی نہ آیا۔ بہت بھوک ستاتی تو یووک اٹھ کے پانی پی لیتا، مگر خالی پیٹ تو پانی بھی تکلیف پہنچانے لگا تھا۔ یووک کی چڑ بڑھتی جا رہی تھی۔

گنپتی گنیش نے جماہی لی اور صوفے کی پشت پر اپنا بازو پھیلا دیا۔ صوفہ چرچرا گیا۔

اچانک ہی یووک کے سرہانے کوئی چیز آ گری۔ اس نے پہلے پہل توجہ نہ دی، پڑا رہا۔ پھر کچھ گرا۔ بہت ہلکی آواز تھی، شیشے کی کھنک جیسی۔ یووک نے سر گھما کے دیکھا۔ فرش پر سرخ شیشے کے ٹکڑے پڑے تھے۔ یہ کہاں سے آئے؟ اس نے سر اٹھایا، روشن دان سے اس کے دیکھتے دیکھتے چوڑی کا ایک اور ٹکڑا گرا۔ ادھر کوئی ہے جو شرارت کر رہا ہے۔ اس نے گدے سے اٹھ کے دیوار سے کان لگا دیے۔ ایک اور ٹکڑا گرا۔ اس نے دیوار پر تھپکی دی، جواب میں دوسری طرف بھی کسی نے ہاتھ مارا۔ آواز ہلکی تھی۔

آواز گنیش نے نہیں سنی مگر اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے پہلو بدلا۔ صوفہ پھر چرچرایا

یووک نے کھڑے ہو کے روشن دان کی طرف منھ کیا اور بولا، "کون ہے؟ ارے، کون ہے اُدھر؟" کوئی جواب نہ آیا۔ آہٹ بھی سنائی نہ دی۔ یووک نے دیوار پر پھر ہاتھ مارا۔ اُدھر سے بھی دیوار تھپکی گئی۔ یہ آواز بہت صاف تھی۔

ے بڑھو! گجانن گنیش نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ دوسری طرف بھی کوئی ہے۔

یووک نے پوچھا، "کون ہو تم؟"

کسی نے سرگوشی کی، "شور نہیں کرو۔ آہستہ بات کرو۔" یہ لڑکی کی آواز تھی۔

ہے مالک! روشن دان کے پار سے لڑکی بات کرتی ہے!

"کون ہو تم؟" یُووک نے پھر پوچھا۔

لڑکی نے کچھ کہا جو کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔

"پھر سے کہو۔ کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں ہوں۔ ادھر ان کا کھانا بناتی ہوں۔"

یُووک کھانے کا سن کے نہال ہو گیا۔ "میں بھوکا ہوں۔"

"مجھے خبر ہے۔"

"کچھ کھانے کو مل سکتا ہے؟" یُووک نے التجا کی، "ذرا دیکھ کے بتاؤ۔"

"مشکل ہے۔ کہیں آ جا نہیں سکتی،" وہ بولی۔ "مجھے بھی تالے میں رکھتے ہیں۔ جب کھانا بنانا ہوتا ہے یا جب ضرورت ہوتی ہے میری، تب لے جاتے ہیں۔"

"ضرورت؟ کیسی ضرورت؟"

"رتی کریا کے واسطے۔"

لڑکی کے منھ سے اتنے کھلے پن سے کہی گئی یہ بات یُووک کو بری لگی تھی۔ وہ چپ رہا۔ لڑکی نے سنکوچ سے کہا، "کچھ کھائے بنا تمھیں بڑا سمے گزر گیا۔ ہاں نا؟"

"ہوں۔"

"دیکھو، پکا نہیں کہتی، پر سویرے تمھارے واسطے کچھ لاؤں گی۔ کوشش کروں گی۔"

"سویرے؟ کل نا؟"

"ہاں۔"

وہ بڑبڑایا، "صبح میں ابھی بہت دیر ہے۔"

"ہوں۔"

"یہ تو بتاؤ یہ جگہ کیا ہے؟"

"کارخانہ ہے۔"

"وہ تو ہے۔ وہ کام کون سا ہے؟"

Scanned with CamScanner

"کچھ نہیں۔"

تھوڑی دیر بعد بلوک نے پوچھا، "اے! تمہیں کہاں سے لائے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔"

"کیوں لائے ہیں تمہیں؟"

"ملا تو دیا کسی با سوا نے ہیں ورنی"

"اچھا اچھا۔" بلوک نے اسے جملہ پورا نہ کرنے دیا۔ "وہ تم سے کوئی بات چیت نہیں کرتے؟"

"کرتے ہیں، پر کم کم۔"

"ان سے پوچھا۔ یہاں سے کہاں لے جائیں گے تمہیں ــــ اور مجھے"

"نہیں بتائیں گے۔ مجھے مار دیں گے۔"

"مارتے ہیں؟ کیوں؟"

"چُپ! کوئی آ رہا ہے۔"

دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا ہو گا۔ آواز اتنی ہلکی تھی کہ بمشکل سنائی دی۔ اُدھر کسی مرد نے دھیمے سے کچھ کہا۔ لڑکی نے اونچی آواز میں پوچھا، "کیا کہ رہے؟"

مرد کی آواز آئی، گھُوں گھُوں گھُوں۔

"پر کیوں؟" لڑکی نے بگڑے تیوروں سے پوچھا۔

چٹاخ سے طمانچہ پڑا۔ بلوک چونک گیا۔ اس کے سیدھے ہاتھ نے دیوار پر گھونسا بنا لیا تھا۔ دوسری طرف سے سب سسکی آوازیں آ رہی تھیں جیسے ہاتھا پائی ہو رہی ہو۔ کپڑے پھٹنے کا چرّاٹا سنائی دیا اور لڑکی کی دبی ہوئی چیخ۔ یوں لگا جیسے اُسے فرش پر گھسیٹا جا رہا ہو۔ کوئی دروازہ کہیں زور سے بند ہوا اور پھر سناٹا۔

بلوک روشن دان کی طرف منہ اٹھائے یہ آوازیں سنتا رہا تھا۔ اس کی گردن اکڑ گئی، جسے سہلاتا ہوا وہ گدّے پر آن بیٹھا اور آنکھیں بند کرکے کانوں کے خواب دیکھنے لگا۔

گریجانند گنیش توند پر سونڈ پھسلاتے ہوئے میٹھے مہکتے موڈک کے بارے

Scanned with CamScanner

میں سوچ رہا تھا جو پلاسٹک کے شوخ رنگ لنچ بکس میں رکھے تھے۔ وہ گوسوامی تلسی کی لکھی استُوتی گنگنانے لگا جس میں خود اس کی ماتا کا گُن گان کیا گیا تھا اور ان لڈوؤں کا ذکر تھا: مودک پریہ مد منگل داتا، مودک پریہ۔ مگر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ وہ بھدّی آواز میں گنگنا رہا ہے۔ وہ چپ ہو گیا۔

یُووک کتنی ہی بار سویا اور جاگا تھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ اندر دھوپ چلی آ رہی تھی۔ کوئی چیز (نرم اور گرم) روشن دن کے رستے یُووک پہ آ گری۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ سمجھا ہو گا کوئی جانور گرا ہے، مگر دوسری طرف سے دیوار پہ ہاتھ رکھے لڑکی نے پوچھا، 'مل گیا؟'

یُووک نے سامنے پڑی چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہ اُبلا ہوا آلو تھا، خوب گرم۔ اُس نے چھیلنے کا بھی کشٹ نہ کیا، کھانے لگا۔

شاید اُس کا مُنھ جلا ہو گا تو یُووک نے تکلیف کی آواز نکالی۔

لڑکی سمجھ کے ہنسنے لگی، بولی، 'ہُشیاری سے کھاؤ رے، گرم ہے۔'

"کرپا تمہاری، بڑی بڑی مہربانی۔"

"یہ اور لے،" ایک اور آلو پھینکا گیا جو واپس اُدھر ہی گر گیا۔

لڑکی خوش دلی سے ہنسی۔ 'ٹھیر۔ پھر پھینکتی ہوں۔" اس بار آلو سیدھا گدّے پہ آن گرا۔

وہ بولی، 'پیٹ تو نہیں بھرے گا تیرا۔ پر پانی پیئے جو گا ہو جائے گا۔'

"نہیں ٹھیک ہے،' یُووک نے کہا۔ 'ٹھیک ہے۔'

سُنو! دونوں ایک ساتھ بولے تھے۔ دونوں ہی ہنس پڑے۔

کچھ پیٹ میں پڑا تھا تو یُووک بھلا جیسا ہو گیا تھا۔ بولا، "نام کیا ہے تمہارا؟"

"رُوپکا۔"

"اُہو!" یُووک نے حیرت کی آواز نکالی۔

'کیا ہوا؟'

"میرا نام رُوپ ہے۔"

"ارے! اچنبھے کی بات ہے ــــ ہے نا؟"

Scanned with CamScanner

۔ ٹھیک ہے، ۔ وقت ہے بات نہ جانی، کوئی اتی ۔ کھی سی ہیں۔ میں زوپ، تم زوپکا۔ " یہ کہہ کے وہ جھینپ گیا۔

ے تو! ماں پاروتی کی ڈلار سے بھری آواز آئی۔ ے تو رہے! جا تیر ا گرڈ آ گیا۔ جا، دیر ۔ کر۔ آج پاروتی نے گریکانند کو کیٹو کہہ کے بلایا تھا ــ میرا ادم دار تارا! میری روشنی!

ہے! گپتی بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر گرڈ رکا ہوا تھا۔ اس کی سن سن سنائی دے رہی تھی۔ گپتی گریکانند لنچ بکس اٹھا کے بھاگا۔ مود ک ہیرا مُد منگل وا! مود ک ہیرا مُد منگل اور تو اور، جلدی میں اس نے اسٹاپ والا بٹن بھی نہیں دبایا تھا۔

آواز سنیں تو جگت ماتا پاروتی ٹہلتی ہوئی آ گئی۔ وہ پلٹے کا گرڈ گیانن کو لے کے جا چکا تھا، اب کام کوئی نہیں تھا۔ گریکا ماں اسکرین کے سامنے سونے پر آن بیٹھی۔

زوپکا!

زوپ! ہے؟ ہوں تو اب بہت خوش ہیں تھی۔

میں سمجھا تم چلی گئیں۔"

"اب نہیں جاتی۔ اب کہیں نہیں جاتی۔ سُنا تو نے؟"

"ہوں"

وہ یہ بھی سن لے۔ میں آؤں گی۔ اُدھر تیرے پاس ہی آؤں گی۔

ماں پاروتی نے لمبی پتلی انگلیوں سے اپنے رخسار چھوئے جو میشور شیو شنکر کے خیال سے گلابی ہوئے جلتے تھے اور تپ رہے تھے۔ ہے آماور!

ہے وِگمبر! ہے میشور!

Scanned with CamScanner

ایسے کیوں ہنستی ہو؟

"تیری عمر کتنی ہے؟"

"اٹھارہ کا ہوں۔"

"چھوٹا ہے نا۔"

"چھوٹا؟ تم کتنی بڑی ہو؟"

حیشی کا دھیان اُدھر نہیں تھا۔ یُووک اور کماری پہلے کچھ ایسا کہہ گئے تھے جو اس نے سُنا نہیں تھا، یا سُنا ہوگا تو دھیان نہیں دیا۔ وہ سوچنے لگی، پلٹ کے سُن لوں۔ پر ایسا بھی کیا ہوگا۔ اَما اب سیدھی ہو بیٹھی۔ کماری سے یُووک اس کی عمر پوچھتا تھا۔

"سترہ برس کی ہوں میں، مگر..."

"اگر مگر کیا؟ چھوٹی ہو مجھ سے۔"

"میں نہیں، تُو چھوٹا ہے۔ ابھی کچھ دیکھا ہی نہیں تُو نے۔"

یُووک چڑ گیا۔ کہنے لگا، "تم نے ایسا کیا دیکھ لیا؟"

دیوار کی اوٹ سے آتی آواز میں دُکھ بھر گیا۔ "بہت کچھ۔ جو تُو دیکھ لیتا تو چھ دس برس کی عمر میں یک دم بڑھ جاتا — ایک ہی راتری میں۔"

"ایک ہی... رات... میں۔" یُووک نے ٹھہر ٹھہر کے دُہرایا۔

دیوار کے پار اب وہ سسکیاں لیتی تھی۔ "وہ اٹھ کے آئے تھے مجھے۔ میں پکاری، بچاؤ، مجھے بچاؤ! کوئی ایک نہیں بولا۔ کوئی آگے نہیں آیا۔"

یُووک نے افسوس کی آواز نکالی، کہا کچھ نہیں۔

اب جو وہ بولی تو آواز میں ایک ذرا ٹھہراؤ تھا۔ "یہاں بس وکت جتنے ہیں، سب کی روٹی بناتی ہوں، چہرے دھوتی سکھاتی ہوں۔ روج رات میں دن میں، جبھی مرجی ہو، کھینچ لے جاتے ہیں۔ تین برس سے ایسا ہی ہے۔ اِن سے پہلے دوسرے تھے۔ اُن سے پہلے دوسرے — سب

Scanned with CamScanner

سکتی ہیں، کسی نہ کسی طور۔ جب ہم جی کڑا کر کے رکھتے ہیں۔ جی ہو جاتا ہے، کسی اور کے ساتھ لگا دیتے ہیں۔ وہ روئے جا رہی تھی۔

یہ کیا کر دیا میں نے؟ بُووک دیر سے اس کا پیٹھ کندھا ہی سہلا رہا تھا۔ چپ رہوں یا دلاسا دوں اسے؟

وہ خود ہی چپ ہو گئی۔

بُووک دھیرے سے بولا، "دکھ ہوا سب سن کے۔"

لڑکی کی آواز میں چمک تھی۔ "ارے سب چلتا ہے۔ تو دکھی مت ہو۔ سال پیچھے سنا کے روئی ہوں۔" اس نے ہنسنے کی سی کوشش کی تھی۔

"سال پیچھے کسے سنایا تھا؟"

"تب روئی ہو۔"

بُووک چپ ہو گیا۔

لڑکی نے آواز دی، "رُوپ! ــــ رُوپمان!"

"ہوں۔"

"کوئی بات کر۔"

"بات؟ ــــ میں یہ بات صدیوں کا نہیں، جو تو نے کہی، صدیوں کا نہیں۔"

"کون بات؟"

"رُوپ کا کشٹ جھیلتی ہے، مصیبت میں ہے۔"

"مصیبت تو رُوپمان اتنی دیر کی تھی، جتنی دیر کی تجھے سنایا۔ اب ٹھیک ہوں، پر، نہیں ــــ بچی ہو گئی ہوں۔ ان چھنالوں سے بدلہ بھی چکا لیتی ہوں اب تو۔"

"بدلہ؟ وہ کیسے؟"

"ابھی دو کو لڑا دیا۔ ایک سے ایک نے چھری ماری۔ گاڑی ادھر مجھے لے کے آ گئی، ادھر اسے لے گئی۔ بچے گا نہیں۔ گردن کی رگ ہی کٹ گئی ہے۔"

"کس طرح لڑا دیا؟"

"بس ــــ لڑا دیا۔"

Scanned with CamScanner

"بتاؤ نا، کیسے؟ کیا کیا تم نے؟"

"نہیں بتاؤں گی۔"

"رُوپکا! یہ کیا بات ہوئی؟ بھلا دوست نہیں ہیں ہم؟"

"دوس؟ دوس کا تو پتا نہیں... پر بتاؤں گی نہیں۔ بڑی بے سَری کی بات ہے۔ تجھے تو بالکل نہیں بتانے کی۔"

"اچھا۔ رہنے دو پھر۔"

"بُرا کیوں مناتا ہے؟ — بس نا، ختم کر۔"

"ہاں۔ ختم کر دیا۔ پر ایک بات ہے۔"

"کیا؟"

"نہیں پتا چل گیا کہ وہ رُوپکا کی وجہ سے جھگڑے ہیں تو بُرا حال کریں گے تمھارا۔ اور کیا برا کریں گے چنڈال؟ ویسے کسی کو علم نہیں ہوئے گا کی جھگڑا کیسے، کس وجہ سے ہوا۔"

"وہ پوچھیں گے۔ ایک تو ردی ہو گا۔ وہ جس نے مارا ہے۔"

"وہ وہ نہیں بتائے گا۔ کوئی مرد ایسی بات نہیں بتاتا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے بات وہ کہی کی دونوں لڑ پڑے، پر ایک سے دوسرے کو بتائی نہیں۔ چُپ کی — کھاموسی کی بات ہے۔"

"خبر نہیں کیا کہہ رہی ہے!"

"اسی لیے کہا تھا ابھی تو چھوٹا ہے۔"

"چل پھر وہی مت شروع کر — جا سو جا۔"

"کھفا ہو گیا؟"

"نہیں نہیں، سوچتا ہوں تو پھر نہ رونے لگے۔ اب سو جا۔ میں تھک گیا ہوں۔"

"ہاں۔ تھک گیا ہے تو سو جا — دوس!"

"دیکھا! آخر تو نے دوست کہا نا مجھے۔"

لڑکی دیوار کے پار سے ایسے ہنسی کہ یُوکؔ کی کوٹھری میں بسنت آ گئی۔

"دیکھ؟ دوست بنا لیا تجھے۔ مجھے دوست کہا نا تُو نے،" یُوکؔ تڑا کے بولا۔ وہ پھر ہنسی۔ "وہ تو ایسے ہی کہہ رہی تھی — جھوٹ موٹ۔"

ماں جگدمبے نے سیس کا چندر کرن پُشپ اُتارا اور رُو پکا کی اور پھینک دیا۔

"یہ کیا تھا؟"

"کیا؟" وہ کھلکھلا کے بولی۔

"جو ابھی دیوار کے پار تیری طرف گیا؟"

"چندر کرن پُشپ۔ یہ تُو نے پہنا ہے نا؟"

"میں نے؟ — نہیں تو۔"

"جیادہ مت اِتراؤ، جُھوٹے!"

شیو اور دھانگی پاروتی ایک مند مُسکان لیے اسکرین پر نظر ڈالتی رسوئی میں چلی گئی۔ یہاں بہت کچھ ہوتا رہا۔

یُوک پوچھ رہا تھا، "کیا بازار جا رہی ہے؟"

لڑکی بولی، "ہاں بزار لے جا رہے ہیں سُسرے۔ ماچ، مسالے کھتم ہو گئے۔"

"اچھا ہے، چلی جا۔ جتنی دیر یہاں سے دور رہے، اچھا ہے۔"

"دیر دُور کیسا۔ اِدھر سے دور اب نہیں رہنا۔ اور جو بزار جاؤں گی تو تُو بھی سنگ ہووے گا میرے۔"

"وہ کیسے؟"

"یہاں میں — یہاں کرتا ہے؟ — پرو لئے دل۔"

یُوک ہنس پڑا، "آہ!"

"ہنستا کیوں ہے؟ اِیتبار نہیں؟"

"ہے۔ اعتبار ہے۔ اچھا بتا کیا لانے گی؟ میرے لیے بزار سے کیا لانے گی؟"

لڑکی کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی، سارنگ۔

"سارنگ کیا؟"

وہ بولی، 'سب چیج۔'

'کیا سب چیز؟'

'سُن — سارنگ بولتے ہیں جب کسی اپنے کو کچھ دنیا ہووے اور سمجھ نہیں آوے کی کیا دے۔ جی کرے یہ دُنیا سنسار کی، برہمانڈ کی سبھی چیج دے دیو۔ تسی بولتے ہیں کی تیرے لیے سارنگ لاؤں گی۔"

'اچھا۔ پر یہ سارنگ ہوتا کیا ہے؟ چیز کیا ہے؟

لڑکی بولی، 'سب چیج! کنول کا پھول سارنگ۔ کاجل، کپڑا، موتی، سونا، چراگ دیوا، یہ سب سارنگ۔ ہاتھ، ہنس، مور، گھوڑا سبھی سارنگ اور جیسا تُو ہے بانکا سپیرا — تو تُو بھی سارنگ۔ تال، سنکھ، پپیہا، ہرنی، کویل — ارے آرے! تیرے کو کویل لادوں؟ گوئو، گوئو — ہاں؟"

باولی ہے تُو تو۔"

بھی سُن نا۔ سارنگ بولتے ہیں رات کو، چندرما کو، سُوریہ کو، جیمین کو، بھونرے کو، اور آکاس کو، کبوتر کو، بل کو، راجے کو، سر کے چھتر کو اور تیرے چرن لاگنے چندل کو۔

'چندن؟'

ارے ہاں نا۔ جسے صندل بولتے ہیں اور چڑیا بھی سارنگ ہے اور عورت بھی — عورت جچتے تیرے کو؟"

"ایک دم مستک اُلٹ گیا ہے تیرا!"

لڑکی رو پڑی۔ 'ہاں رے رُوپ! مہادیو میرا ساکشی۔ تُو نے تو میرا مستک ہی اُلٹ دیا رے۔'

اور ٹھیک اسی وقت ایک بے آنکڑ گتی سنائی دی۔ مہادیو کا ڈمرُو بجتا تھا۔ ایک دھمکی کے نقارے میں بُوک اور کھاری کے بیچ کی دیوار ڈھے گئی۔

کوٹھری میں پڑے (کتنی ہی رنگی ریوں سے چکٹے) میلے کچیلے گدّے پر بانگھبر بچھ گیا۔

سچّے ہو!

رُوپ اور رُوپکا پہلی بار ایک دوسرے کے سامنے آئے۔

"تم رُوپ ہے؟" لڑکی نے پوچھا۔

"اور تم رُوپکا ۔ تم نرملا ہو اور اچھوتا بھی۔"

"میں چنڈالوں کی رکھیل رُوپکا۔"

"تم ستیہ ہو، شو اور سُندر بھی۔"

میری جنگھاؤں کے بیچ اَپوترتا کی دلدل ہے۔

یُووَک نے اُس کے دونوں ستنوں کو چھوا ۔ تم دیوی اور پوتر ہو اور نرمل بھی۔

یُووَک نے اُس کے مستک کو ہاتھ لگایا ۔ سچے ہو!

لڑکی نے اُس کے چرن تھام لیے۔

وہ اسے بالکھنڈر پر لے آیا۔

کسی ستھری زندگی کے پچھواڑے، جہاں کچھ نہیں بچا تھا، زانیوں چنڈالوں کا رستا روکے ہوئے سب ایک سی اور بے خوف زندگی سر اٹھا رہی تھی۔

رُوپ اور رُوپکا، کروڑوں گرہستی مہیش کے بالکھنڈر پر تھے۔ دُنیا بھر کے میلے مسلائے پہنے ہوئے یہ زیست پُرش اور استری پرستش کرتے تھے۔ ان کی دھڑکنوں میں گرہستی مہیشور کے شوکت و جلال کا ڈمرو بجتا تھا۔

**

رابندرناتھ ٹیگور

انگریزی سے ترجمہ: حسین مسلم

آرٹ کا مفہوم

اتھروَوید میں ایک عجیب اشلوک ہے جو ہر اس چیز کو جو انسانی دنیا میں عظیم ہے، "زائد" (superfluity) سے منسوب کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے:

رِتم ستیم تپو راشٹرم سرمو دھرمس چ کرم چ
بھوتم بھوِشیت اچھِشٹے ویریم لکشمی بلم بلے

(راست شعاری، سچائی، بڑی کاوشیں، فرماں روائی، مذہب، کارِ عظیم، دلیری اور تن آسودگی، ماضی اور مستقبل، سب بستے ہیں زائد کی قوتِ نہایت میں)

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنا اظہار بہتات کے ذریعے کرتا ہے جو اس کی ضرورتِ محض کو کم و بیش ڈھانپے ہوئے ہوتی ہے۔
ویدوں کے مشہور شارح سایَن آچاریہ کہتے ہیں: چڑھاوے کا بھوجن جو بلیدان کی رسوم کے مکمل ہونے کے بعد بچ رہتا ہے، اس کا بکھان اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہ برہما کی علامت ہے جو

Scanned with CamScanner

کائنات کا اوّل منبع ہے۔

اس شرح کے مطابق برہما اپنی بہتات میں بے انت ہے جو اپنا اظہار کبھی ختم نہ ہونے والے دنیوی عمل میں کرتا رہتا ہے۔ یہاں ہمیں تخلیقِ کائنات کا قانون نظر آتا ہے، اور اسی لیے آرٹ کے آغاز کا بھی۔ دنیا کی تمام ذی روح مخلوقات میں انسان کے پاس اس کی حیاتی اور دماغی قوت اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے اور یہ قوت سے مختلف النوع تخلیقی کاموں پر، خود اُن کاموں کے لیے، کھپاتی ہے۔ خود برہما کی طرح وہ ایسی تخلیقات میں مسرت محسوس کرتا ہے جو اس کے اپنے لیے غیر ضروری ہیں، اور اس لیے اس کے اسراف کی علامت ہوتی ہیں نہ کہ آمدوخرچ برابر جیسی قلاشی کی۔ جو آواز محض کافی ہے، وہ جتنا روز کے استعمال کے لیے ضروری ہے بول سکتی ہے، رو سکتی ہے، لیکن جو آواز فاضل ہے وہ گاتی ہے اور اس میں ہمیں اپنی شادمانی ملتی ہے۔ آرٹ انسانی زندگی کی دولت کو ظاہر کرتا ہے جو اپنی آزادی کمال کو پہنچی ہوئی شکلوں میں ڈھونڈھتی ہے جو بذات خود اپنی غایت ہوتی ہیں۔

جو کچھ بھی بے حرکت اور بے جان ہے، محض ہونے کی حقیقت تک محدود ہے۔ زندگی مستقل تخلیق کار ہے، کیوں کہ اپنے اندر وہ ایک چیز زائد رکھتی ہے جو غیر رُکے، فوری زمان ومکاں کی حدبندیوں کو اپنے ساتھ میں پار کرتا، بس ہمیشگی وجود کے لیے، اپنے بوقلموں اظہار کی مہم میں لگا رہتا ہے۔ ہمارا زندہ جسم اپنے اندر وہ عناصر رکھے ہوئے ہے جو اس کی کارگزاری کے لیے اہم ہیں، لیکن یہ جسم بہرحال محض معدے، دل، پھیپھڑوں اور دماغ رکھنے کی سہولت کے لیے ایک تھیلا ہی نہیں ہے؛ یہ جسم ایک تمثال ہے اور اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ اپنی شخصیت کا پتہ دیتا ہے۔ اس میں رنگ ہے، وضع قطع ہے، حرکت ہے، جن کا بڑا حصہ زائد کی ملکیت ہے اور جن کی ضرورت اپنے اظہار کے لیے ہے نہ کہ اپنی بقا کے لیے۔

تمام تخلیق کی نیو میں ایک سچائی ہے جو بظاہر لغو ہے ___ ایک منطقی تخالف۔ اس کا عمل دو مخالف قوتوں کی مسلسل مصالحت میں ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ زائد کا فطری عنصر، یعنی اُچھلنا، ہی سرِ آمادہ بہ تکمیل عمل کی طاقتِ حرکی ہے۔ لیکن زائد کے اس بے حدود بہاؤ کو، خود کو ظاہر میں لانے کے لیے، اپنے آپ کو متناہیت کی حدود کے سپرد کرنا ہوتا ہے؛ سچ کے حقیقت میں متشکل ہونے کے لیے بے حدود کو حدود میں آنا پڑتا ہے۔ ہمارے سامنے ہر شے کے مبدء کے بارے میں

Scanned with CamScanner

اُپنشد سے دو مثالیں دیتی ہیں۔ ایک طرف تو یہ کہا گیا ہے کہ آنندا دھیوا کھلو یمانی بھوتانی جنیتے (کائنات مسرت سے پیدا ہوئی ہے)؛ دوسری طرف وہ شلوک ہے جو کہتا ہے: سا تاپو تپتوا سا تپستپتوا سروم اسرجتا یدادم کنچا (برھما نے تپسیا کی، اور تپسیا سے جو گرمی پیدا ہوئی اس سے اُس نے ہر اُس کی تخلیق کی جو ہے)۔ مسرت کی آزادی اور تپسیا کی بندش، دونوں ہی برھما کے تخلیقی اظہار میں مساوی طور سے سچ ہیں۔

یہ بے حدود کا حدود میں آنا فرد کا ہونا ہے۔ برھما جہاں تخلیق کرتا ہے، فرد ہے۔ جہاں وہ زیست کی اندرونی ضرورتیں صحیح وزن میں اور ہمیشگی کے لیے بہم پہنچاتا ہے، وہ شاعر ہے، دماغ کا بادشاہ، مطلق العنان طاقت اور خود کو تخلیق کرنے والا۔ وہ اپنے قانوں کی حدود کو تسلیم کرتا ہے اور یوں کھیل چلتا رہتا ہے جو کہ یہ دنیا ہے، جس کی حقیقت اس کے اصل شخص (برھما) سے رشتے میں ہے۔ اشیا ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن اپنی ماہیت میں نہیں، اپنے ظہور میں، بہ الفاظِ دیگر اپنے اس تعلق میں جو وہ اُس سے رکھتی ہیں جو انھیں دیکھتا ہے۔ یہی آرٹ ہے، جس کی سچائی مادّے یا منطق میں نہیں ہے بلکہ اظہار میں ہے۔ تصوراتی سچائی سائنس اور مابعد الطبیعیات کا حصہ ہو سکتی ہے، لیکن حقیقت کی اقلیم آرٹ کی ملکیت ہے۔

دنیا، بہ حیثیت ایک آرٹ کے، پرم پُرش کا ناٹک ہے جو تمثال سازی کی رنگ رلیوں میں لاتا ہے۔ تمثال کے عناصر کی کھوج لانے کی کوشش کیجیے، وہ آپ کو جُل دے جائیں گے۔ وہ کبھی بھی اظہار کے ابدی راز کا آپ کو پتا نہیں دیں گے۔ زندگی کو گرفت میں لانے کی کوشش میں، جیسی کہ وہ زندہ خلیوں کے سلسلوں اور بافت میں ظاہر ہوتی ہے، آپ کو کاربن، نائٹروجن اور کتنی سے حیات سے قطعاً غیر مماثل چیزیں ملیں گی لیکن خود زندگی کبھی نہیں۔ روپ رنگ خود اپنے پر، اپنے اجزا کے ذریعے، کوئی شرح پیش نہیں کرتا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے مایا کہہ لیجیے اور اسے تسلیم نہ کرنے کا بہانہ کیجیے۔ لیکن اس سے اُس بڑے آرٹسٹ مایاون کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی، کیوں کہ آرٹ مایا ہے۔ اس کی کوئی اور توضیح نہیں ہے سوائے اس کے کہ یہ ویسا لگتا ہے جیسا کہ ہے۔ یہ کبھی اپنی اس ہاتھ نہ آنے والی خاصیت کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتا ہے، بلکہ خود اپنی پہچان پر نمائش کرتا ہے اور چھپنے ڈھونڈھنے کے اپنے کھیل کو اپنے مستقل تغیرات کی اُڑان میں کھیلتا رہتا ہے۔

اور یوں زندگی کو، جو آزادی کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا دھماکا ہے، اپنی بحر (metre) بار بار موت میں ڈوب کر ابھر آتی ہے۔ ہر دور ایک موت ہے، اور ہر لمحہ بھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ آزادی کا ایک بے شکل، اندھا گونگا اور بے حرکت ریگستان۔ کیوں کہ زندگی خود مایا ہے، اور جیسا کہ منطقی خلق کہتے نہیں تھکتے، یہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ ہمارے ہاتھ اس میں سے جو کچھ آتا ہے وہ وہ ہے، تال یا تناسب ہے جس میں وہ خود کو پیش کرتی ہے۔ کیا چٹانیں اور معدنیات اس لحاظ سے بہتر ہیں؟ کیا سائنس نے یہ حقیقت ہم پر آشکار نہیں کی ہے کہ ایک عنصر اور دوسرے عنصر میں حتمیہ فرق محض لے یا تال کا ہے؟ سونے اور پارے میں بنیادی امتیاز محض ان کی اس تال یا لے کے فرق میں ہے جو ان کی اپنی جوہری ساخت میں مضمر ہے۔ جیسے شاہ اور رعیت میں امتیاز ان کے مختلف عناصر ساخت میں نہیں ہے بلکہ مختلف اور ان مقام و حالت میں ہے۔ یہاں آپ کو سین کے پیچھے چھپا ہوا آرٹسٹ ملتا ہے، تال اور لے کا جادوگر جو بے حقیقت کو حقیقت کا ایک ظاہرہ بخشتا ہے۔

اور یہ تال یا لے (rythms) ہے کیا؟ یہ وہ حرکت ہے جسے ہم ساز (harmonious) بندش پیدا کرتی ہے اور جس پر ضبط و قیود بھی عاید کرتی ہے۔ یہ تخلیقی قوت ہے جو آرٹسٹ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جب تک الفاظ ایک بے ربط نثری جنگل میں رہتے ہیں، وہ ہمیں حقیقت کا کوئی پائیدار احساس نہیں بخشتے؛ جب انہیں شاعر لے یا تال کے حوالے کر دیتا ہے، ان میں ارتعاش سے تابندگی آجاتی ہے۔ یہی حال گلاب کا ہے؛ اس کی پنکھڑیوں کے گودے میں آپ کو ہر وہ چیز ملے گی جس سے گلاب بنا ہے لیکن جو گلاب ہے، ایک تصور، ایسا کرنے میں وہ گم ہو جائے گا، اس کی لطافت جس میں لامحدودیت کا لمس ہے وہ کھو جائے گی۔ مجھے گلاب ساکت لگتا ہے لیکن اپنی ترتیب کے وزن یا گر کی بنا پر اس میں، اس کی گہری خاموشی کے میان، حرکت کا ایک گیت موجود ہے اور یہ ویسا ہی ہے جیسے ایک ایسی تصویر کی حرکت خوبی جس میں مکمل طور سے ترتیب کی ہم آہنگی ہو۔ یہ حقیقت ہمارے شعور میں، اسے حرکت کا ایک ایسا جھوٹا دیتی ہے جو اس کی اپنی حرکت کے ساتھ ہم وقت ہو، ایک موسیقی پیدا کرتی ہے۔ اگر تصویر رنگوں اور لکیروں کے بے آہنگ، بے ترتیب جمگھٹے پر مشتمل ہو تو وہ کسی میت کی طرح ساکت ہوگی۔ بے عیب حسنِ ترتیب میں آکر آرٹ کی وہ صورت تاروں جیسی بن جاتی ہے جو اپنے بظاہر سکوت میں

کسی ساکت نہیں ہیں، جیسے ایک بے حرکت تو جو غیر حرکت کے کچھ اور نہیں ہے۔ ایک مہان تصویر ہمیشہ گویا رہتی ہے، لیکن اخبار میں چھپنے والی خبر، چاہے وہ کسی نمود ناک واقعے ہی کی ہو، مردہ تن وجود میں آتی ہے۔ کوئی خبر کسی جریدے کی گم نامی میں پڑی محض روزمرہ کی ایک بات ہو سکتی ہے، لیکن اسے صحیح لے یا تال عطا کیجیے، پھر وہ کسی ٹھکانے سے عاجز نہیں رہے گی۔ یہ آرٹ ہے۔ اس کے پاس جادو کی وہ چھڑی ہے جو ہر اس چیز کو جس سے وہ مس ہوتی ہے، کبھی نہ مرنے والی حقیقت بخش جاتی ہے؛ وہ ان چیزوں کا ہماری درونی ہستی سے تعلق پیدا کر دیتی ہے۔ ہم اس کی تخلیق کے مقابل کھڑے ہو کر کہتے ہیں: میں تمہیں ویسے ہی جانتا ہوں جیسا خود اپنے آپ کو۔ تم حقیقی ہو۔

یہاں مجھے موقع دیجیے کہ اپنے ایک پچھلے مقالے سے آرٹ کے ذیل میں کہی بات دہراؤں۔ جب ہم جمالیات کا آرٹ کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں تو ہمیں جاننا چاہیے کہ یہ خوب صورتی کی، اس کے عام معنوں میں، بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ ان گہرے معنوں میں ہے جس کا اظہار ایک شاعر نے اپنے الفاظ میں یوں کیا ہے: خوب صورتی سچائی ہے، سچائی خوب صورتی۔ ایک آرٹسٹ ایک خستہ حال شخص کی ایسی تصویر پینٹ کر سکتا ہے جو آنکھوں کو بھلی نہ لگے لیکن پھر بھی ہم اسے مکمل یا بے عیب کہتے ہیں جب اس کی سچائی کی ہمیں گہری آگہی ہوتی ہے۔

زندگی کے امید سے تہی المیوں کو اصطلاحاً کبھی بھی خوب صورت نہیں کہا جا سکتا ہے، لیکن آرٹ کے پس منظر کے مقابل ظاہر ہو کر وہ ہمیں مسرت بخشتے ہیں اور اس کی وجہ حقیقت کا وہ تیقن ہے جو وہ ہمارے دماغ میں پیدا کرتے ہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہر چیز جو اپنے اندر پنہاں قطعیت کی بنا پر اپنی ہستی کا لوہا ہم سے منوا لیتی ہے، خوب صورت ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جسے سنسکرت میں منوہر (لغوی معنی: دماغ کو موہ لینے والا) کہا جاتا ہے: من (دماغ) جو معلوم کرنے والے اور معلوم کے درمیان ایستادہ ہے۔ ہماری اصلی ہمدردی ان تمام اشیا کے لیے ہے جو زندہ ہیں، کیوں کہ اگر سمجھا جائے تو وہ ہماری زیست کی آگاہی کی محرک ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت کہ ہم موجود ہیں، اس کی سچائی اس حقیقت میں مضمر ہے کہ دوسری ہر چیز بھی وجود رکھتی ہے۔ "میں" کا "میں ہوں" اپنے پھیلاؤ سے، اپنی لاانتہائیت سے تب ہی پوری طرح آگاہ ہوتا ہے

Scanned with CamScanner

جب وہ کسی دوسری شے کا صحیح معنوں میں ادراک کرتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اپنی محدودیتوں اور بے شمار ذہنی مشغولیتوں کی وجہ سے ہماری دنیا کا ایک بڑا حصہ، باوجود نزدیک سے ہمارے گرد ہونے کے، ہماری توجہ کی روشنی کے گھیرے سے بہت دور رہتا ہے۔ اور یہ بڑا حصہ جو دھندلا ہے، ہمارے پاس سے گزرتا جاتا ہے، سایوں کا ایک کارواں جیسے ایک لینڈ سکیپ جو ایک روشن ریلوے کمپارٹمنٹ کی کھڑکی سے رات میں نظر آتا ہے۔ مسافر جانتا ہے کہ باہر کی دنیا اپنا وجود رکھتی ہے، یہ کہ وہ اہم ہے، لیکن وقتی طور سے ریلوے کا ڈبا اس کے لیے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ مگر اس دنیا کی ان گنت چیزوں میں سے چند ایک ایسی ہوں جو ہماری روح کی پوری تابانی میں آجائیں اور یوں ہمارے لیے حقیقت کا روپ اختیار کرلیں تو وہ مسلسل ہمارے تخلیقی دماغ کو ابدی نمائندگی بخشنے جانے کی دہائی دیتی رہتی ہیں۔ وہ اسی اقلیم سے تعلق رکھتی ہیں جس سے ہماری وہ خواہش جو ہمارے اپنے آپ کی دوامیت کی تمنا کی نمائندگی کرتی ہے۔

میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جن چیزوں سے ہم ذاتی منفعت کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں ان میں حقیقت کا وجدان ہے۔ اس کے برعکس ایسی چیزیں ہمارے اپنے سائے سے گھنا جاتی ہیں۔ پیش خدمت ہمارے لیے اس سے زیادہ حقیقی نہیں ہے جتنا محبوب۔ افادیت پر تنگ نظر زور ہماری توجہ کو پورے انسان سے ہٹا کر محض کار آمد انسان پر منعطف کر دیتا ہے۔ بازار کی قیمت کا دبیز لباس حقیقت کی واقعی قیمت کو مٹ دیتا ہے۔

برہد آرنیکا میں کہا گیا ہے: یہ خواہش کہ بیٹا ہو سے پیارا نہیں بناتی ہے؛ بیٹا خود اپنی ذات میں پیارا ہے۔ یعنی بیٹے میں باپ ایک حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے جو اس کے اندر بلاواسطہ اور گہری ہے۔ وہ اس لیے خوش نہیں ہے کہ اس کا بیٹا بے عیب اور خوب صورت ہے، بلکہ اس لیے کہ اس کا بیٹا بلاشبہ اس کے لیے حقیقت ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، ہماری مسرت حقیقت کے بے لوث ادراک میں ہے۔ یہ منبع ہے تمام فنون اور ادب میں ہماری سرخوشی کا جہاں حقیقت ہمارے سامنے اپنی مطلق قیمت کے پایۂ ستون پر رکھ کر پیش کی جاتی ہے۔

ہمارے دماغ کے تمام گہرے نقوش کے ہمراہ کچھ جذبات ہیں جو اپنی مختلف النوع تھرتھراہٹ ہمارے شعور میں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہلچل ہماری آواز اور حرکات کو تناسب سے گھٹاتی بڑھاتی ہے اور ہمیں رنگوں، شکلوں اور آوازوں کی تخلیقی نمود پر برانگیختہ کرتی رہتی ہے۔ اس

Scanned with CamScanner

پر مجھے وہ موقع یاد آتا ہے جب میں نے ایک اسکول کی عمارت کی دیوار پر بڑے بڑے حروف میں لکھا دیکھا تھا: بچن پرلے درجے کا گدھا ہے۔ اس بات پر مجھے ہنسی بھی آئی اور ساتھ ہی اس سوال کا جواب بھی مل گیا کہ آرٹ کیا ہے۔ کوئی بھی سے وجہ یہ اعلان کرنے کی رتی بھر تکلیف گوارا نہیں کرے گا کہ بچن لمبا ہے یا یہ کہ اُسے زکام ہے۔ عام حالات میں ہمارے دماغ پر بچن کا جو نقش بنے گا وہ متانت آمیز اور غیر جانبدار ہوگا، لیکن جب ہم اس سے محبت یا نفرت کرتے ہیں تو بچن کی ہستی کی حقیقت جذبات کے اس ہیجانی پس منظر پر دمک کر عیاں ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں ہمارا دماغ غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ وہ بچن کے تصور کو اس جم غفیر سے جو ہمارے لیے غیر اہم ہے، علیحدہ کرتا ہے اور اپنی صلاحیت کے مطابق اُسے دوسروں کے لیے بھی ویسی ہی ناقابلِ تردید، حقیقی بنانے کی کوشش کرتا ہے جتنا وہ ہمارے لیے ہے۔ وہ لڑکا جو بچن کے بارے میں اپنی بری بھری رائے کو دوامیت دینا چاہتا تھا، اور چاہتا تھا کہ ساری دنیا بھی اسے تسلیم کرے، اس کے پاس سوائے اپنے ناکافی لکڑی کے کوئلے اور اپنی بے اثر ڈرائنگ کے اور کچھ نہ تھا، جب کہ اس کے زمانۂ قدیم کے آباواجداد جب جوش دلائے جانے پر غصّے میں آ جاتے تھے تو اس غصّے کو وہ نہ صرف پُراثر طریقے سے پیکار میں نکال سکتے تھے بلکہ زرق برق طریقے سے جلال کے اظہار میں بھی جس کے لیے قدرتی رنگ، پر، چمکیلی اشیا اور لڑائی کے ناچ اُن کے ہتھیار ہوتے تھے۔ وہ دیوارِ مدرسہ کی تحریر جو بقائے دوام کے لیے تڑپ رہی تھی، رنگوں اور نئے بھری لکیروں کی افسوس ناک حد تک معکاری تھی جو اُسے ایک شہرۂ آفاق ہم جنسوں کی صف میں جگہ دیتے ـــ مشہورِ زمانہ گپھاؤں کی آبی رنگوں والی تصاویر کی صف میں جن میں فنکاروں نے بعض شخصیتوں اور متعدد واقعات نے اپنے جذبے پر زور دیا ہے اور انہیں ابدیت بخشنے کی کوشش کی ہے، کیوں کہ آرٹ کی تخلیقات مشتمل بہ جذبات اظہار ہوتی ہیں حقائق اور تصورات کا۔ وہ کبھی بھی فوٹوگرافک کیمرے کی کاریگری کی مانند نہیں ہو سکتی ہیں جو روشنیوں اور پرچھائیوں کو بلاامتیاز تفصیل منفعل طور سے قبول کرتا جاتا ہے۔ ہمارا سائنسی دماغ ہر طرح کی طرف داری سے آزاد ہے۔ اس کے روبرو جو حقائق آتے ہیں انھیں وہ سارے رحم تجسس سے، بغیر کسی ترجیح کے، قبول کرتا جاتا ہے۔ آرٹسٹک دماغ شدید طور سے جانبدار واقع ہوا ہے اور وہ جانبداری نہ صرف یہ کہ اس کی رنگ چڑھے پن سے، موضوع کے انتخاب میں رسائی کرتی ہے بلکہ اس کی تفصیل کے انتخاب میں بھی۔ آرٹسٹک دماغ

Scanned with CamScanner

زور حساس اور سمیت کی رنگین روشنیاں اس طرح اپنے موضوع پر ڈالتا ہے کہ وہ ایک فرد یا کردار بن جاتا ہے، اور یہ سبجاؤ اسے اپنے ساتھیوں سے ممیز کرتا ہے۔ سائنس کے لوے (skylarks) اپنی شہادت اپنے ایک جیسے ہونے میں دیتے ہیں، آرٹسٹوں اور شاعروں کے لوے ایک جیسے نہ ہوتے ہیں۔ اگر شیلی کی نظم اس پرندے کے بارے میں ویسی ہی ہوتی جیسی ورڈزورتھ کی تو اُسے سچائی سے عاری ہونے کی بنا پر رد کر دیا جاتا۔

چوں کہ آرٹ کسی چیز، کردار یا واقعے کے سہارے ذاتی جائزے کا حامل ہوتا ہے، آرٹسٹ اپنے عمل میں فطرت کے پھیلے ہوئے پیچ میں پڑنے کے طور کو نہیں اپناتا ہے۔ اس کے برخلاف وہ اپنی انسانی سرشت کا تابع رہتا ہے جو آمادہ بہ انتخاب ہے۔ جو کچھ اس کے اپنے مقصد اظہار کے لیے غیر ضروری ہے اس سے دامن چھڑا کر، اور جو اہم ہے اُس پر زور دے کر، وہ اپنی تخلیق کی سچائی کو زیادہ وضاحت سے پیش کر سکتا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ حقیقت کی نقل کرے جو ہر موجود چیز کے بارے میں قطعاً غیر جانبدار ہے۔ خدائی تخلیق کی سالمیت رکھی بے کراں ہے، اور یہ کسی شے کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ اس سے اپنے رشتے میں حد سے زیادہ سرکشانہ طور پر مختلف ہو جائے، لیکن انسانی شعور کا پس منظر چھوٹا ہے اس لیے یہ کبھی بھی ممکن نہیں ہوگا کہ ہم فطرت کی تفاصیل کو اپنے آرٹ کی تخلیقات میں سمو سکیں۔ قبل از تاریخ کے جنگل کو اپنے باغیچے کے تختوں کے تناظر میں ڈھونڈنے کی کوشش کرنا کودکی ہے اور تاریخ حیوانات و نباتات کی ہمارے شہ پاروں میں تصویر کشی جو حقائق کو ہماری شخصیت کے شعر میں کم و زیادہ کرتی ہے۔

ایک دفعہ مجھ سے سوال کیا گیا تھا کہ میں موسیقی کو اپنے فن کے نظریے میں کیا مقام دیتا ہوں۔ مجھے اس سوال کا جواب دینا ہے اور اس موقعے کو میں اپنی توضیح پیش کرنے کے لیے کام میں لا رہا ہوں۔

اقلیم سائنس میں ریاضی کی مثل، موسیقی تمام فنون میں سب سے زیادہ خیالی ہے۔ درحقیقت دونوں کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے۔ ریاضی، بہ حیثیت عدد اور ابعاد (لمبائی، چوڑائی اور گہرائی یا موٹائی) کی منطق ہماری سائنسی معلومات کی بنیاد ہے۔ جب اسے اس کے کائناتی مظاہر سے مادی رشتوں سے علیحدہ کر کے علامتوں میں محدود کر دیا جائے تب ریاضی اپنے عظیم ساختیاتی کردار کو ــــ یعنی اپنی مکمل ہم آہنگی کی ناگزیریت کو ــــ ظاہر کرتی ہے۔ لیکن

Scanned with CamScanner

ایک چیز ریاضی کا جادو بھی ہے جو تمام ظہور کی بیخ میں کارفرما ہے اور جو وحدت کی ہم آہنگی کو پیدا کرتا ہے۔ اشیا کا ایک دوسرے سے رشتے کا زیروبم جو انھیں کل کی قلمرو میں لے آتا ہے۔ ہم آہنگی کی اس لے کو اس کے عام سیاق و سباق سے نکال کر آواز کے وسیلے سے ظاہر کیا گیا، اور یوں انفرادیت کا خالص عطر جو وجود میں آیا، اسے موسیقی میں پیش کیا جاتا ہے۔ آواز میں اسے کم سے کم مزاحمت ملتی ہے اور اسے ایسی آزادی میسر آتی ہے جس پر حقائق اور خیالات کا بوجھ نہیں ہوتا۔ یہ چیز اسے ایسی قوت عطا کرتی ہے جو ہم میں حقیقت کے شدید احساس کو بیدار کرتی ہے، جو ہمیں تمام اشیا کی روح تک لے جاتی ہوئی لگتی ہے اور ہمیں وجدان کے سانس کو عظیم ترین تخلیقی مسرت سے آتا ہوا محسوس کراتی ہے۔

مصوری، پیکرسازی اور صوتی فنون میں، مادی شے اور اس سے متعلق ہمارے احساسات ایک دوسرے سے بہت نزدیک آجاتے ہیں، جیسے گلاب اور اس کی خوشبو۔ موسیقی میں صوت میں نچوڑا ہوا احساس بذاتِ خود ایک مستقل شے بن جاتا ہے، وہ لے کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو واضح ہوتی ہے لیکن ایسا مفہوم جس کی تعریف ممکن نہیں، لیکن جو پھر بھی ہمارے دماغ کو ایک مطلق سچائی کے احساس کے ساتھ اپنے بس میں کر لیتا ہے۔

صدیوں پہلے بنگال میں ایک وقت آیا جب نارائنی پریم ناٹک جس کا ابدی کھیل انسانی روحوں میں تھا، اس کا واضح اظہار ایک ایسی شخصیت میں کیا جانے لگا جو پرم آتما سے اپنی پوری آگاہی کے گہرے تعلق کی ضوافگنی کرتی تھی۔ ایک پوری قوم کا دماغ دنیا کے ایسے دیدنی پیکر کی شکل میں پیش کیے جانے سے، جو ایک آئینہ تھا جس کے ذریعے ہمیں مسرتِ کامل سے ملاقات کی دعوت دی جا رہی تھی، ہلچل میں آگیا۔ پرم آتما کی محبت کی پکار کے ناقابلِ بیان راز تھے ـــــ جو رنگوں اور ہیئتوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا مسلسل منظر تھا، جسے اپنا ہم تو طانفہ انسانی احساسات میں مل رہا تھا۔ موسیقی میں ایسی تخلیقی حرکت کو جگایا جو کلاسیکی تقلیدیت کی بندشوں کو پار کر گئی۔ ہمارے کیرتن سنگیت نے بنگال میں ایسے جنم لیا جیسے ایک جذبے کے آتش گرفتہ بھنور نے ایک ستارے کو ایک پوری قوم کے دل میں تھا پھینکا ہو۔

ہماری تاریخ میں ایسے مواقع آتے ہیں جب عوام الناس کے ایک بڑے گروہ کا شعور یکایک کسی ایسی چیز کی معرفت سے جو روزمرہ کے واقعات کے معمولی پن سے کہیں بالاتر آتی ہے، منوّر

ہو اٹھتا ہے۔ ایسا ہی ایک موقع تھا جب (گوتم) بدھ کی آواز تمام ذہنی اور اخلاقی رکاوٹوں کے پار، دور کے ساحلوں تک پہنچی۔ اس وقت ہماری زندگی اور ہماری دنیا نے اپنے حقیقت کے گہرے مفہوم کو اس مرکزی شخص سے اپنے تعلق میں پایا جس نے ہمیں محبت کی آزادی عطا کی تھی۔ اور آدمی اس مہان انسانی تجربے کو دائمی یادگار بنانے کے لیے ناممکن کو کر گزرنے کا عزم کر بیٹھا۔ انھوں نے چٹانوں کو گویا کرایا، پتھروں کو گویا اور گیھاؤں کو حافظہ دیا۔ خوشی اور امید کی آواز نے پہاڑیوں، ریگستانوں، لق و دق تنہائیوں اور گنجان آباد شہروں میں ہر شکلیں اختیار کیں۔ ایک جناتی تخلیقی مہم نے ان رکاوٹوں کو، جن میں مغلوب کر لینے کی طاقت تھی، خاطر میں نہ لا کر عظیم الشان ترشوں کو جسم دے کر اپنی فتح منائی۔ یہ جوشیلا عمل جو براعظم کے پورے بڑے حصے پر پھیلا ہوا ہے، اس سوال کا واضح طور سے جواب دیتا ہے کہ آرٹ کیا ہے۔ آرٹ انساں کی تخلیقی روح کو حقیقت کی پکار کا جواب ہے۔

لیکن انسانی دماغ کا، اپنے مزاج اور زیست کے لحاظ سے، حقیقت کا اس کے بعض پہلوؤں میں پیدا ادراک ہوتا ہے۔ ہم گندھارا کی بدھ کی مورتیوں میں یونان کے فنی اثر کو دیکھ سکتے ہیں جن میں سامنے کا پہلو، بالخصوص تشریح ابدان کی صحت، پر زور دیا جاتا تھا، جب کہ خالصتاً ہندوستانی دماغ علامتی پہلو پر جما رہا اور اس نے بدھ کی آتما کے اظہار کی کوشش کی اور ایسا کرنے میں کبھی بھی حقیقت نگاری کی محدودیت کو تسلیم نہیں کیا۔ یوروپ کے عظیم مجسمہ ساز رودان (Rodin) کی ہم خوروں کے لیے حقیقت کا سب سے اہم پہلو اس کی کبھی نہ تھمنے والی، نامکمل کے اپنی کوتاہیوں کی بیڑیوں سے رہائی پانے کی جدوجہد ہے، جب کہ مشرقی آرٹسٹ کے دماغ کے لیے، جو فطرتاً آمادہ بہ مشاہدہ نفس ہے، جو کچھ حقیقی ہے وہ تکمیل کی آدرشی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس لیے جب ہم اس حقیقت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جسے ہندوستانی آرٹ کہا جاتا ہے تو اس سے اشارہ ایک ایسی سچائی کی طرف ہوتا ہے جس کی نیو ہندوستانی روایت اور مزاج پر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارا یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ انسانی تہذیبوں میں مکمل ذات پات کی قیود جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ انسانی گروہوں میں آمیز ہونے اور نئی متنوع تخلیق کی قوت سدا رہتی ہے، اور ایسے امتزاج جگوں سے چلے آ رہے ہیں اور یہ اس صداقت پر دال ہے کہ انسانی نفسیات یہی کہ رنگی میں ایک ہے۔ اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی آرٹ میں ایرانی عنصر کو

رکاوٹیں نہیں ملیں اور دیگر بیرونی اثرات کے بھی نشانات ملتے ہیں۔ چین اور جاپان کو اپنی آرٹسٹک اور روحانی زندگی کی بالیدگی کے لیے ہندوستان کا زیر بار ہونے کو تسلیم کرنے میں کبھی قباحت پیش نہیں آئی ہے۔ ہماری تہذیبوں کی خوش بختی سے ایسی تمام آمیزش اس دور میں ہوئی جب آرٹ کے پیشہ ور ناقدوں کی بھرمار نہیں تھی اور درجہ بندی کرنے والے ہر وقت تنبیہ کی انگلی سے آرٹسٹ کو یہ نہیں بتاتے رہتے تھے کہ وہ اپنے وجدان میں سے کس کا انتخاب کرے؛ نہ ہی ہمارے آرٹسٹوں کو یہ عیاں حقیقت بیزار کر دینے کی حد تک یاد دلائی جاتی تھی کہ وہ ہندوستانی ہیں، نتیجتاً باوجود دوروں سے تمام تر اخذ کرنے کے، انھیں خود قدرتی طور سے ہندوستانی ہونے کی آزادی رہتی تھی۔

بڑے اختراعی قابلیت رکھنے والوں کی عظمت کی پہچان، بسااوقات ان کے علم میں آئے بغیر، ان کی اخذ کرنے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ ان کی ساکھ دنیا کے تہذیبی بازاروں میں لامحدود ہوتی ہے۔ صرف اوسط درجے والے اخذ کرنے سے جھینپتے اور ڈرتے ہیں کیوں کہ انھیں اپنا قرضہ اپنے سکّے میں لوٹانا نہیں آتا۔ ناقدین میں سے کسی انتہائی بے وقوف کو بھی شیکسپیئر کو اپنے قومی ورثے کے باہر سے کھلم کھلا تصرف کرنے کا اُلاہنا دینے کی ہمت نہیں ہوتی ہے۔ انسانی روح کو اپنی ہمہ گیر حساسیت پر فخر ہے؛ جب وہ پوری طرح بیدار ہوتی ہے تو اپنی ہر جگہ رسائی کا اعلان کر رہی ہوتی ہے۔ ہم اس امر پر خود کو مبارک باد دیتے ہیں اور اسے روحانی طور سے اپنے زندہ ہونے کی علامت گردانتے ہیں کہ یوروپی خیالات اور ادبی ہیئتوں کی ہمارے ذہن سے اوّلیں اتصال ہی سے، بنگالی ادب میں فوری پذیرائی ہوئی۔ اس سے ہمارے ادبی اظہار کی اقلیم میں ایک عظیم انقلاب آیا۔ بنگالی ادب میں زبردست تبدیلیاں آئیں لیکن ہماری ہندوستانی روح اس تصادم کو جھیل گئی، اور اس طغیانِ عظیم پر بڑے پُرزور طریقے سے پھلی پھولی ہے۔ اس سے صرف یہ پتا چلتا ہے کہ گو انسانی ذہنیت، کرۂ ارض کی آب و ہوا کی مثال، اپنے مختلف جغرافیائی خطوں میں اپنے مختلف ٹمپریچر رکھتی ہے لیکن ایسے مختلف کمروں میں دیوار بست نہیں ہے کہ ایک سے دوسرے میں اس کا گزر نہ ہو سکے، اور یوں مشترک ہوا کی حرکت پورے کرے پر اپنے صحت بخش اثر کے ساتھ جاری ہے۔ سو ہمیں دل بڑا کر کے جرأت مندانہ تجربات کرنے چاہییں، تمام خطروں کے مقابل کھلی سڑک پر نکل آنا چاہیے، ناپاک مانعتوں کو، جن کے ادبی سنگ دلی درجے کے محتاط

Scanned with CamScanner

ناقدری میں، بلکہ اس کے سوتے انسانی دماغ کی عظیم دنیا کے مرکز سے گزرنا چاہیے، اور جب وہ رکشت سے باہر سے آرٹسٹوں کو اپنے بچوں کی طرح رہنے اور کسی ان کے سکوں کے کرنے کی دھیر سے ہر قدم نہ تماشے کی تلقین کریں تو ان پر ہنسنا چاہیے۔ ڈھے ڈرے ایک روایتی ناپ سے سدا مطابقت رکھنا، پختگی کی علامت ہے۔ صرف چھوٹے بچوں میں خدوخال کی انفرادیت دھندلی ہوتی ہے اور اس لیے ذاتی پہچان زیادہ واضح نہیں ہوتی ہے۔ بچپنا ایک ذہنیت ہے جس کی بہ آسانی تقسیم کی جا سکتی ہے، بچوں کی عادتیں عام طور پر ایک ہی صوتی لرزش پر مبنی ہوتی ہے، اس کے کھلونے بھی تقریباً ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن بلوغت کی عمر کی درجہ بندی مشکل ہے۔ بلوغت کی عمر مشتمل ہوتی ہے [illegible] جو ہر ذاتی انفرادیت کے پہچانے جانے پر منحصر ہوتے ہیں؛ یہ ذاتی انفرادیت نہ صرف چہرے کے مخصوص خطوط میں نظر آتی ہے بلکہ تمام بیرونی حرکات پر اپنے خصوصی ردعمل یا تاثرات میں بھی۔

میں اپنے ہم عصر آرٹسٹوں سے شدت سے اس بات پر اصرار کرتا ہوں کہ وہ تدبر سے کام لے کر کسی چیز کے تخلیق کرنے کی اپنی ذمہ داری سے انکار کر دیں جس پر ہندوستانی آرٹ کا لیبل لگایا جا سکے اور جس کی مطابقت پچھلی دنیا کے کسی مخصوص اسلوب سے ہو۔ انہیں واضح ہوئے جانوروں کی طرح کھدیڑ کر باڑے میں بند کیے جانے سے فخر کے ساتھ انحراف کرنا چاہیے جن سے مویشیوں کا ساتھ لیا جاتا ہے، کیوں کا نہیں۔ سائنس غیر ذاتی ہے؛ اس کا ایک پہلو ایسا ہے جو محض آفاقی ہے اور اس لیے تصور مجرد۔ لیکن آرٹ ذاتی ہے اور یوں اس کے ذریعے جو کچھ آفاقی ہے وہ وجود کے روپ میں خود کو آشکار کرتا ہے: مثال، مختار چہرے مہرے ہیں، جہاں وہ ادب کی شکل میں۔ سائنس تعمیر کی پیچیدہ کڑیوں کا ایک سلسلہ ہے؛ وہاں ہر سمت سے استدلال کرنے والے دماغ ایک ہی جیسی گاڑی میں ایک ساتھ سفر کرنے کے لیے آتے ہیں۔ آرٹ ایک تنہا پیادہ پا ہے جو سیدھے چلتے ہیں، پیلا اور گرد کے مختلف انواع تجربات کو، جنہیں نہ قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے نہ کسی ترتیبی فہرست میں ڈالا جا سکتا ہے، اپنے میں ضم کرتا ہوا چلتا رہتا ہے۔

ایک وقت تھا جب انسانی نسلیں ایک دوسرے سے نسبتاً علیحدگی میں رہتی تھیں اور اس بنا پر آرٹ کے کارنامے انجام دینے والوں کو اپنا تجربہ محدود کی ایک تنگ وسعت میں، بعض عمومی خصوصیت کی گہری لکیروں کے درمیان، میسر آتا تھا۔ لیکن آج وہ وسعت بہت بڑھ چکی

ہے ور ہم سے اُس تاثر پذیری کی نسبت سے قدیم زمانوں میں ہم خود میں پیدا کرنے پر مجبور تھے، آج کہیں زیادہ تاثر قبول کرنے کی طاقت کی متقاضی ہے۔ آج اگر ہم میں ایک زندہ روح ہے جو تصورات اور ہیئت کی خوب صورتی کی حس رکھتی ہے تو اسے اپنی استعداد کا ثبوت ہر اس چیز کو اپنا کر دینا چاہیے جو اپنائے جانے کے لائق ہو، کسی رسم و رواج کے اندھے حکم امتناعی ور چلن کے مطابق نہیں، بلکہ دائمی قدر کے اپنے وجدان کے تعاقب میں۔ اُس وجدان کے جو ہر [illegible] فنکار کو پرم آتما کی دین ہوتا ہے۔ اس کے باوصف ہمارے آرٹ میں یقیناً ایک خصوصیت ہونی جو ہندوستانی ہے، لیکن اسے ایک اندرونی خصوصیت ہونا چاہیے، کوئی مصنوعی طور سے پالا پوسا ہوا تکلف نہیں، اور اس لیے اُسے نہ تو مخل ہونے کی حد تک عیاں ہونا چاہیے نہ ہی خلاف معمول طور سے اپنا احساس دلانے والا۔ جب ہم ہندوستانی آرٹ کے نام پر سوچی سمجھی جارحیت کے ساتھ، جو بذاتِ خود ایک گزری ہوئی نسل سے آنے والی عادت پر مشتمل ہوتی ہے، یک کٹر پن کو جنم دیتے ہیں تو ہم اپنی روح کو دفن کی ہوئی صدیوں سے کھود کر نکالے ہوئے مخصوص سالیب کے تلے دبا دیتے ہیں۔ گزشتہ کے یہ مخصوص سالیب مبالغہ آمیز نقوش والے مصنوعی چہروں کی مثال ہیں جو سدا بدلتی ہوئی زندگی کے کھیل کا تاثر پیدا نہیں کر سکتے۔ آرٹ گم شدہ برسوں کی تنہا بدعت پر اپنی جا سے بیلے بن غور و خوض میں ڈوبی ہوئی کوئی رنگ برنگی سمادھی نہیں ہے۔ آرٹ زندگی کے جلوس میں شامل ہے، مستقل پیش آنے والے تجربوں سے خود کو کم و بیش کرتا ہوا، مستقبل کی یاترا کے اپنے پتھ پر، حقیقت کی نامعلوم سمادھیوں کی کھوج لگاتا ہوا، ایسا مستقبل جو ماضی سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا درخت بیج سے۔

آرٹ کبھی نہ ختم ہونے والی تخلیقی روح کی رونق و شان کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ مانگنے میں بھی سخی ہے اور سرفراز کرنے میں بھی سخی۔ وہ اپنی ہیئت میں یکتا ہے اور اثر اندازی میں آفاقی، وہ کل کے لیے مہمان نواز ہے کیوں کہ اس کے پاس وہ دولت ہے جو اس کی اپنی ہے۔ اس کا زاویۂ نظر نیا ہوتا ہے چاہے منظر پرانا ہو۔ عمدگی کا اس کا اپنا خاص معیار اس کے اپنے اندر ہوتا ہے اس لیے ایسوں کے فصیح و بلیغ ڈراووں سے جنھیں تخلیق کے نازک رازوں کی ہوا بھی نہیں لگی ہے، جو اپنے درسی ضابطۂ قانون سے اس کو آسان بنانا چاہتے ہیں جو خود اپنی بے ساختگی میں قطعاً آسان ہے، بجائے مطابقت اختیار کرنے کے انھیں حقارت سے رد کر دیتا ہے۔

Scanned with CamScanner

ایک قوم نے آرٹ کا آدرش روایت کی محدود مشق میں مضبوطی سے پکڑ کر اپنے میں نہایت کی خصوصیت پیدا کر سکتا ہے اور پھر وہ کتا دینے والی یکسانیت سے پتے اور پھول پیدا کرتا رہے گا۔ چوں کہ مگر اس آرٹ کے پیچھے ایسا دماغ کھلاتا نہیں ملتا ہے جو حاصل کیے ہوئے کو حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہو، اور چوں کہ اسے ایسی عادت جو بڑی پارسائی سے تجربوں کی ترغیبوں سے باز رکھتی ہے استحکام بخشتی ہے، نہ اسے عوام کی ترقی پذیر زندگی سے مدد ملتی ہے۔ نہ ہی وہ اس زندگی کو نہال کر سکتا ہے۔ وہ ماہرین کے حلقوں میں محدود رہتا ہے جو نازک توجہ سے اس کی پرداخت کرتے ہیں، اس کی لطیف قدیم مہک پر فخر کرتے ہیں جو ان کے رویے اس کی اس شان میں ہے کہ وہ عوام کے لیے ہے۔ وہ بس دھار نشیں ہے جو حس رتیں میں رہتا ہے اس کی آبیاری کرتا ہے، بلکہ ایک ظرف شراب سے جسے اندھیرے تہ خانے میں زیر زمین رکھا گیا ہو اور جو اپنی مصنوعی پرورش سے پیدا کی ہوئی ماندہ کہنگی کی وجہ سے ایک خاص 'مارے والی خصوصیت اپنے میں پیدا کر لے۔ حرکت کی آزادی کے بدلے میں جو زندگی سے بھری ہوئی جوانی کا حق ہوتی ہے، ہمارے ماتھ طبیر مسرت بوڑھی کاملیت آتی ہے جس نے اپنی دانائی کو ٹھوس گول مول مقولوں میں ڈھال رکھا ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ایسے بھی ہیں جو ایک بچے کو اس کے دادا دادی کی عمر کا لگنے کو سودمند سمجھتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ بڑے ہونے کے جوکھوں اور تکلیف سے بچ جائے اور ان کے خیال میں ایک آرٹسٹ کے لیے یہ عزت کی معراج ہے کہ وہ آہستہ آہستہ، روایت کی جوڑ توڑ کر سانی ہوئی کسی میراث کی مدد سے، یکسانیت کی آسان کامیابی اپنے لیے پیدا کر لے۔

لیکن اگر ہم آرٹ کی پرورش میں روایت کو یکسر ٹھکرا دیں تو یہ سمجھیے ہم دوسری سمت میں بہت آگے نکل گئے ہیں اور یہ کہنا کہ عادات کا واحد اثر ہمارے ذہن کو مردہ کر دینے میں ہے، سچائی کا ادھورا بیان ہوگا۔ جو روایت مددگار ہے وہ اس ساحل کی طرح ہے جو دھارے کے بہنے میں معاون ہوتی ہے۔ جہاں پانی تیزی سے آگے کو بہہ رہا ہوتا ہے وہ کھلی ہوتی ہے، جہاں اس کے ادھر ادھر مڑنے کا خطرہ ہوتا ہے وہ اس کی حفاظت کرتی ہے۔ گھاس کی زندگی اپنی عادت کی بندھن میں کہیں سے کھلی ہوئی نہیں ہے۔ اس کی زندگی بس کاملیت کے تنگ دائرے میں گھومتی رہتی ہے۔ انسانی زندگی بھی وقت کے آزمودہ اپنے اصول رکھتی ہے جو اس کی ترتیب یافتہ عادات پر مشتمل ہیں۔ جب یہ قوانین بازوؤں کا کام کرتے ہیں تو نتیجہ تمام و کمال ہو سکتا ہے ـــــ

شہد کی مکھی کے چھتے کی طرح بناوٹ کی درستی میں بے عیب، لیکن اس دماغ کے لیے نامناسب جس کے اندر ترقی کے ان گنت امکانات ہوتے ہیں۔

[خطبے کو] ختم کرنے سے پہلے میں اس موقعے سے کام لیتے ہوئے اپنے آرٹسٹوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے پیشے کی عظمت کو پہچانیں۔ ان کا پیشہ زندگی کے تیوہار میں تخلیقی طور سے حصہ لینے کا ہے اور یہ تیوہار ہے درون انسان موجود لامحدودیت کے اظہار کا۔ اپنی روزمرہ کی دنیا میں ہم عسرت میں گزارا کرتے ہیں، اس میں ہمیں اپنے وسائل کو کفایت شعاری سے تصرف میں لانا پڑتا ہے، ہماری توانائی پست پڑ جاتی ہے اور اپنے خدا کے سامنے جب ہم پہنچتے ہیں تو بھکاری بن کے ہیں۔ تیوہار کے دنوں پر ہم اپنی دولت کی نمائش کرتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں ہم بھی ویسے ہی ہیں جیسا وہ ہے، اور خرچ کرتے ہوئے گھبراتے نہیں۔ یہ وہ دن ہوتا ہے جب ہم اس کو اپنی مسرت کا تحفہ پیش کرتے ہیں، کیوں کہ خدا سے ہم حقیقت میں اس وقت ملتے ہیں جب ہم اس کے حضور اپنے نذرانے لیے آتے ہیں نہ کہ حاجتیں، اور وہ نذر سے اپنے اظہار کے لیے آرٹ کے طلبگار ہوتے ہیں۔

جس وشال دنیا میں میں نے جنم لیا ہے اس کے بارے میں میرے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سورج اس کا انتظار نہیں کرتا ہے کہ میں اسے کروں۔ لیکن صبح سویرے ہی سے میرے وجود کی چھوٹی سی دنیا سے میرے خیالات سر جاتے ہیں۔ اس کی اہمیت اس حقیقت میں ہے کہ مجھے ایک دنیا دی گئی ہے جس کا دارومدار اپنی کاملیت کے لیے میری اپنی تخلیقی روح پر ہے۔ یہ دنیا مہان ہے، کیوں کہ میرے پاس وہ شکتی ہے جو اسے اس ناتے کے یوگیہ بناتی ہے جو اس میں اور مجھ میں ہے؛ یہ دنیا اس لیے مہان ہے کہ اس کی مدد سے میں اپنی میزبانی تمام دنیا کے خدا کے حضور پیش کر سکتا ہوں۔

صبح کو سورج چمک دمک لیے آتا ہے، جھٹ پٹے میں ستارے اپنی روشنیاں دکھاتے ہیں۔ لیکن یہ ہمارے لیے کافی نہیں ہیں۔ جب تک ہم اپنے چھوٹے دیے نہیں جلا لیتے ہیں آسمان میں روشنی کی دنیا عبث ہے، اور جب تک ہم اپنی تیاریاں نہیں کر لیتے ہیں دنیا کی تیاریوں کی دولت ایسے منتظر رہتی ہے جیسے ایک بانسری انگلیوں سے چھوئے جانے کی۔

ایسی تیاری ساری دنیا میں جاری ہے، غار میں رہنے والے دور سے لے کر ہمارے زمانے

Scanned with CamScanner

تک۔ آرٹسٹ انسان خدا آرٹسٹ کو اپنے گھر مدعو کر رہا ہے۔ خدا اس کی اپنی تخلیق میں گھر رکھتا ہے اور انسان سے اس کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنا ماحول بھی تخلیق کرے اور اپنے رہنے کی جگہ بھی جو اس کی روح کے شایانِ شان ہو۔ ایک مکمل تخلیق کے لیے اس کے اندر بیٹھے ہوئے آرٹسٹ کو آزادی ہونی چاہیے، ایسے آرٹسٹ کو جس کا ایک مدعا کامیت ہوتا ہے منفعت نہیں، جس کے تئیں قیمت کی وہ توقیر ہوتی ہے جو مادی کامیابی کو حقارت سے دیکھتی ہے اور جس کے پاس وہ اولوالعزمی ہوتی ہے جو مشکلات، ہمت شکنی اور احتیاج کے مقابل دروُنی تکمیل کے آدرش کی جویا رہتی ہے۔ اور تب کہیں جا کے اس کی دنیا صداقت دنیا کا سچا جواب دے پاتی ہے جیسے اپنے پریمی کی منتو (بڑائی) کے جواب میں ایک استری کی مدھرتا۔

یہ آرٹسٹ کی ذمہ داری ہے کہ وہ دنیا کو یاد دلائے کہ اپنے اظہار کی سچائی سے ہم بچ ہیں پہنچتے ہیں۔ جب انسان کی ترتیب دی ہوئی دنیا اس کی تخلیقی روح کی کمزور کسی طاقت کے مقصد کے لیے بنائے ہوئے مشینی آلے کی مظہر زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ کرختگی اختیار کر لیتی ہے اور زندہ بڑھوتری کی نازک معنی خیزی کے عوض اس کے ہاتھ مہارت آتی ہے۔ اپنے تخلیقی کاموں میں آدمی فطرت کو اپنی زندگی اور محبت میں جذب کر لیتا ہے۔ لیکن اپنی افادیت کی طاقتوں کو وہ فطرت سے جنگ کرنے کے کام میں لاتا ہے، اُسے اپنی دنیا سے نکال باہر کرتا ہے، اپنی ہوس کی بدصورتی سے اُسے بدوضع اور غلیظ کر ڈالتا ہے۔ آدم کی ساخت کی ہوئی یہ دنیا اپنی بےتاب اور بےثمر جستجوں اور خود پسندی سے اس کے ذہن میں ایک ایسی کائنات کا مقصدی خاکہ ثبت کر دیتی ہے جس میں فرد کا لمس نہیں ہوتا اور، اس لیے، نہ ہی بالآخر اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ تمام عظیم تہذیبیں جو معدوم ہو چکی ہیں اپنے انجام کو اسی طور انسانیت کے اظہار میں پہنچی ہوں گی: دولت سے جنم لینے والے بہت بڑے پیمانے کے ایک دوسرے کے جسم پر پلنے سے، آدمی کے مادی وسائل سے چمٹے رہنے کے اعتقاد سے، حقیقت کو جھٹلانے، اس سے انکار کرنے کے تعصبی جذبے اور سچائی کی راہ کے سہارے آزو قے کو ہم سے چھین لینے سے۔

یہ آرٹسٹ کے کرنے کا کام ہے کہ وہ قائم و دائم اثبات میں اپنے اعتقاد کا اعلان کرے، کہ میرا ایمان اس میں ہے کہ ایک آدرش دھرتی کی فضا میں بھی پر مار رہا ہے اور دھرتی میں بھی سرایت کیے ہوئے ہے، ایک پرلوک کا آدرش جو محض تصور کی پیداوار نہیں ہے بلکہ آخری

Scanned with CamScanner

حقیقت ہے جس میں تمام چیزیں بستی ہیں اور چلتی پھرتی ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ پرلوک کا یہ درشن سورج کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے اور دھرتی کے سبزے میں، آدمی کے چہرے کی سندرتا میں اور انسانی محبت کے دھن میں، ان چیزوں میں جو بظاہر حقیر، ابہم اور نہ جانے والی ہیں۔ دھرتی میں ہر جگہ سورگ کی آتما جاگ رہی ہے اور اپنی آواز سنا رہی ہے۔ وہ ہمارے بھیتر کے کان میں بلا ہمارے جانے پہنچتی ہے۔ وہ ہمارے جیون کی دنیا کے سُر ملاتی ہے جس سے ہماری سنگیت کی ابھیلاشا نت سے پرے پہنچتی ہے، صرف پیار تمناؤں اور آشاؤں میں نہیں، مندروں میں بھی جو پتھر میں اگنی کی لپٹیں ہیں، چتروں میں جو سپنے ہیں جنھیں امر بنا دیا گیا ہے، نرت میں جو حرکت کے اچل مرکز میں والہانہ دھیان ہے۔

**

آئندہ صفحات میں مشرقی یورپ کے چار شاعروں کی چند نظمیں پیش کی جا رہی ہیں جنہیں افضال احمد سید نے انگریزی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔

تادیوش بوروسکی (Tadeusz Borowski) ۱۹۲۲ میں پولینڈ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۱ میں وفات پائی۔ ان کا بچپن یوکرین میں گزرا اور تعلیم انہوں نے وارسا یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۹۴۲ میں شائع ہوا۔ اگلے سال انہیں گرفتار کر کے آؤشوِز اور پھر ڈاخاؤ کے کیمپ میں بھیج دیا گیا جہاں وہ پولینڈ کے امریکیوں کے تسلط سے آزاد ہونے تک قید رہے۔ ۱۹۴۵ میں ان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ شائع ہوا اور ۱۹۴۶ میں کنسنٹریشن کیمپ کی کہانیوں کا مجموعہ میونخ سے چھپا۔ بعد میں ایسے دو اور مجموعے شائع ہوئے۔ ۱۹۵۱ میں بوروسکی نے گیس سے دم گھونٹ کر خودکشی کر لی۔

ماریں شورسکو (Marin Sorescu) کا تعلق رومانیہ سے ہے جہاں وہ ۱۹۳۶ میں پیدا ہوئے۔ یاسی یونیورسٹی میں فلسفے کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی انہوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ مختلف اخباروں اور رسالوں سے وابستہ رہے۔ آج کل وہ Ramuri ادبی جریدے کے مدیر ہیں۔ شورسکو کی نظموں کا پہلا باقاعدہ مجموعہ ۱۹۶۵ میں شائع ہوا۔ اب تک ان کے متعدد مجموعے اور منتخبات شائع ہو چکے ہیں۔ نظموں کے علاوہ وہ ڈرامے، مضامین اور بچوں کے لیے کتابیں بھی لکھتے ہیں اور ترجمے سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ ان کا ڈرامہ Jonah کئی یورپی ملکوں میں پیش کیا جا چکا ہے۔ شورسکو کو رومانیہ میں اور اس سے باہر کئی اعزازات مل چکے ہیں۔

جان پروکوپ (Jan Prokop) ۱۹۳۱ میں پولینڈ میں پیدا ہوئے۔ وہ شاعر ہونے کے علاوہ مترجم، مضمون نگار اور ادبی مورخ بھی ہیں۔ ان کی نظموں کی صرف تین مختصر کتابیں ۱۹۷۱، ۱۹۷۸ اور ۱۹۸۰ میں شائع ہوئی ہیں۔ پروکوپ پولینڈ کے شہر کراکو اور اٹلی کے شہر تورینو کی یونیورسٹیوں میں پڑھاتے ہیں۔ ۱۹۸۰ کے عشرے میں ان کی نظمیں یا تو پولینڈ سے باہر ورنہ خفیہ طور پر شائع ہوتی رہیں۔

وسلاوا شمبورسکا (Wislawa Szymborska)، جنہیں ۱۹۹۶ میں ادب کا نوبیل انعام پیش کیا گیا، ۱۹۲۳ میں پولینڈ میں پیدا ہوئیں۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۹۵۲ میں شائع ہوا اور اس کے بعد سات اور مجموعے چھپے۔ وہ فرانسیسی شاعری کے ترجمے کر چکی ہیں اور ان کے مضامین کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان کی جو دو نظمیں یہاں شامل کی گئی ہیں ان میں سے ایک (یاسلو کے قریب فاقہ کیمپ) اس سے پہلے "آج" کے شمارہ ۱۳ (سرما ۱۹۹۰) میں بھی شائع ہو چکی ہے۔

تادیوش بوروسکی

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

پروجیکٹ: پرچم

ہم قومی رنگوں سے تنگ آ چکے ہیں
ہم زندگی کا رنگ چاہتے ہیں
وہ نہیں جس کی چھٹیوں کے دن نمائش کی جاتی ہے
ہم ہر پرچم کو نئے رنگ دیں گے:
پولینڈ کا جھنڈا دھاری دار ہوگا
دھاریاں، بے شک، جیل کی سلاخیں ہیں۔

Scanned with CamScanner

مارین شورسکو

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

شیکسپیئر

شیکسپیئر نے دنیا سات دنوں میں بنائی

پہلے دن اس نے آسمان اور پہاڑ اور روح کی ندیاں بنائیں
دوسرے دن اس نے دریا، چھوٹے بڑے سمندر اور دوسرے جذبات بنائے
اور انھیں ہیملٹ کو، جولیس سیزر کو، کلوپیٹرا، اوفیلیا
اور دوسروں کو دیا
تاکہ وہ ان پر اپنی ولدیوں اور بعد کی نسلوں کے ساتھ
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حکومت کر سکیں

تیسرے دن اس نے تمام لوگوں کو مختلف ذائقوں کی تعلیم دینے کے لیے طلب کیا
خوشی کا ذائقہ، محبت کا، ناامیدی کا ذائقہ،
رشک کا، شہرت کا ذائقہ، وغیرہ
یہاں تک کہ کوئی ذائقہ تقسیم کرنے کے لیے نہیں بچا
پھر کچھ لوگ آئے جو دیر سے پہنچے تھے، ان کے لیے افسوس کیا جا سکتا ہے،
شیکسپیئر نے ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، اور انھیں بتایا کہ

Scanned with CamScanner

ان کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا کہ وہ ادبی نقاد بن جائیں
اور اس کی تخلیقات کو بُرا بھلا کہا کریں

چوتھے اور پانچویں دن کو اس نے قہقہوں کے لیے مخصوص کیا
مسخروں کو کھلی چھٹی دی، انھیں قلابازیاں کھانے کی اجازت دی
کہ وہ حکمرانوں، شہنشاہوں اور دوسرے بدقسمت لوگوں کے لیے
دل لگی کا سامان فراہم کر سکیں

چھٹے دن، اس نے انتظامی معاملات کو چھیڑا
اس نے ایک طوفان پیدا کیا، اور کنگ لیئر کو بتایا
کہ کانٹوں کا تاج کس طرح پہنتے ہیں

ساتواں دن اس نے اس بات کی تصدیق میں لگایا کہ کوئی چیز
بنے بغیر تو نہیں رہ گئی
اس وقت تک تھیٹر کے مینیجر تمام دنیا کو اپنے اشتہارات سے لیپ چکے تھے
اور شیکسپیئر نے سوچا اتنی سخت مشقت کے بعد
وہ ایک ڈراما دیکھنے کا مستحق ہے
مگر اسی دوران وہ شدید غنودگی محسوس کرتے ہوئے لیٹ گیا
تاکہ موت کی مختصر سی نیند لے سکے

شطرنج

میں ایک سفید دن آگے بڑھاتا ہوں
وہ ایک سیاہ دن چلتا ہے
میں ایک خواب کے ساتھ تیزی سے بڑھتا ہوں
وہ اسے جنگ میں مجھ سے حاصل کر لیتا ہے
وہ میرے پھیپھڑوں پر حملہ کرتا ہے
ایک سال تک میں سوچتا ہوا پڑا رہتا ہوں
ذہانت سے پیش بندی کرتا ہوں
اور ایک سیاہ دن جیت لیتا ہوں
وہ بدقسمتی کو حرکت دیتا ہے
اور مجھے کینسر کا خوف دلاتا ہے
(جو اس وقت ترچھی چال چل رہا ہے)
مگر میں ایک کتاب سے اس کی توضیح کرتا ہوں
اور اسے واپس جانے پر مجبور کر دیتا ہوں
میں کچھ اور مہرے چلتا ہوں
اور دیکھتا ہوں کہ میری آدھی زندگی ہاتھ سے غائب ہو چکی ہے
"میں شہ دوں گا اور تم اپنی امید ہار جاؤ گے،"
وہ دعویٰ کرتا ہے
فکر نہ کرو، میں مذاق کرنے کی کوشش کرتا ہوں،
پھر میں جہت کو آگے بڑھاؤں گا اور تمہارے بادشاہ کو گھیرے میں لے لوں گا
عقب میں میری بیوی، میرے بچے، سورج، چاند اور دوسرے تماشائی
میری ہر چال پر لرزتے رہتے ہیں

میں ایک سگریٹ جلاتا ہوں
اور کھیل کو جاری رکھتا ہوں

سینیکا

جب سورج ڈوبنے لگے گا
وہ مجھے بتاتے ہیں
مجھے اپنی نسوں کو کاٹنا ہوگا
ابھی صرف دوپہر ہوئی ہے
میرے پاس زندہ رہنے کے لیے کچھ گھنٹے بچے ہیں

کیا میں لوکولس کو خط لکھوں؟
اس وقت میرا دل نہیں چاہ رہا ہے
سیر کس کو جاؤں؟
مجھے اب کھیل تماشے کی ضرورت نہیں، نہ روٹی کی ہے
کیا میں فلسفے کے مستقبل کے بارے میں بتاؤں؟

ایک گھنٹا اور گزر گیا
میرے پاس مکمل چار گھنٹے اور ہیں
میرے حمام میں پانی گرم ہو رہا ہے
میں جمائی لیتا ہوں اور کھڑکی سے باہر جھکتا ہوں
اور اس سورج کے راستے کو دیکھتا ہوں جو پھر نہیں ڈوبے گا
اور ناقابلِ بیان حد تک بیزاری محسوس کرتا ہوں

**

جان پروکوپ

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

وکٹری اسکوائر، سابق سیکسونین اسکوائر، پر گمنام سپاہی کی قبر کے پاس چڑیوں کے لیے پھینکے گئے روٹی کے ٹکڑے کا نغمہ

میں نے، ملیک کے قصبے سے لے کر یہاں تک کا تمام سفر
طیر بسز سمد، پوچا لگانے والی صوفیان — کی (جس کا کوئی شوہر نہیں ہے) جیب میں کیا
اگرچہ میں مازوویز کے دھوپ بھرے میدانوں میں پیدا ہوا تھا،
جس کی شاعر برونیوسکی نے، جو انقلاب کا عوامی نغمہ خواں تھا، تعریف کی تھی
ہماری بس ایک تعطیلی سنیٹر کو پہنچی، لوگ دکانوں کی کھڑکیوں میں جھانکنے لگے
صوفیان — بچیوں کی ٹائٹس ورڈ پیپر کی تلاش میں تھی کیوں کہ وہ
آٹھ ماہ کی ماریوز کی بن بیاہی ماں ہے
ڈیر، مسٹر، کامریڈ، چیئرمین، سر اس نے ہزاروں بار لکھا
براہ مہربانی اپنی توجہ میری نامساعد حالت پر مبذول کریں
میں ایک ہاوسنگ خانے میں رہ رہی ہوں، مجھے ایک مکان الاٹ کیا جائے
نرم حصے کو جس پر چکنائی لگی تھی، کھانے کے بعد، اس نے مجھے
نلکیوں میں اسی غیر واضح انداز میں تھامے رکھا

جو ہیں نے اُس وقت اختیار کیا تھا جب ز زیسلاوس ـــــ ، ڈپٹی ڈائرکٹر ، نے
اپنے دفتر کا دروازہ بند کیا اور اسے وودکا پیش کی
مگر جب اس نے انتظامیہ کی تبدیلی کا اچانک حکم سنا
وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور تیں آہستہ سے
اس اسکوائر کے پتھروں پر گر گیا
جو تاریخ اور غموں سے اس قدر بھرا تھا
کہ جب چڑیوں کی سخت چونچوں نے مجھے زخمی کیا
میں نے سوچا: یہ ضرور گرے ہوئے پرچموں سے جاگ کر آنے والے
عقاب ہوں گے

**

وسلاوا شمبورسکا

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

ایک ریزیومے کا لکھنا

کیا کیا جانا چاہیے؟
درخواست بھرو
اور ایک ریزیومے منسلک کرو

فائل کی ضخامت سے قطع نظر
ریزیومے کو مختصر ہونا چاہیے

جامع، اچھی طرح منتخب کیے ہوئے حقائق ضروری ہیں
لینڈ اسکیپ کو مکانوں سے بدل دیا گیا ہے
قابل اعتبار تاریخیں اور ان یادوں کی جگہ لے لیتی ہیں

اپنی تمام محبتوں میں سے صرف شادی کا ذکر کرو
اور اپنے تمام بچوں میں سے صرف اُن کا جو پیدا ہوئے

جو لوگ تمھیں جانتے ہیں وہ اُن سے زیادہ اہم ہیں جنھیں تم جانتے ہو

Scanned with CamScanner

صرف بیرونی ممالک کے کیے گئے سفر
ممبرشپ کن کن اداروں کی، مگر اس کی وجہ بتانے بغیر
اعزازات، یہ بتائے بغیر کہ وہ کس طرح حاصل کیے گئے

اس طرح لکھو جیسے تم نے کبھی خود سے گفتگو نہ کی ہو
اور ہمیشہ اپنی ذات کو فاصلے پر رکھا ہو

اپنے کتوں، بلیوں، پرندوں، گرد آلود نشانیوں، دوستوں اور خوابوں کے پاس سے
دبے پاؤں گزر جاؤ

قیمت، مگر خوبی نہیں
اور خطابات، مگر یہ نہیں کہ ان کے اندر کیا ہے
اُس کے جوتوں کا نمبر جیسے تم
اپنے آپ کی حیثیت سے متعارف کرتے ہو
مگر یہ نہیں کہ وہ کہاں جانے والا ہے

اس کے علاوہ ایک تصویر، جس میں ایک کان نمایاں ہو
جس چیز کی اہمیت ہے وہ کان کی ساخت ہے، نہ یہ کہ وہ کیا سنتا ہے
کاغذ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والی مشین کی گڑگڑاہٹ کے سوا
یہاں پر سننے کو ہے بھی کیا!

یاسلو کے قریب فاقہ کیمپ

اس کو لکھ ڈالو۔ اس کو لکھو۔ عام سیاہی میں
عام کاغذ پر: "انہیں کوئی خوراک نہیں دی گئی تھی
وہ سب بھوک سے مر گئے۔"
"سب؟ کتنے؟
یہ چراگاہ تو بڑی ہے۔ کتنی گھاس کی پتیاں فی کس؟"
لکھو: "میں نہیں جانتا۔"
تاریخ نے ہر مکمل عدد میں ڈھانچے گنے ہوتے ہیں
ایک ہزار اور ایک
صرف ہزار رہ جاتا ہے
غیر ضروری شخص شاید کبھی تھا ہی نہیں
ایک خیالی جنین، ایک خالی گہوارہ
کسی کے لیے نہ کھولا گیا ایک قاعدہ
ہوا، جو مسکراتی ہے، شور کرتی ہے اور بڑھنا جاری رکھتی ہے،
خالی پن کے باغ میں نیچے جاتے ہوئے قدم رکھتی ہے
قطار میں کسی کی جگہ نہیں ہے

ہم اس چراگاہ میں ہیں جہاں یہ گوشت بن گئی
یہ ایک جھوٹے گواہ کی طرح خاموش رہتی ہے
دھوپ سے روشن، سبز۔ قریب ہی ایک جنگل ہے
ایک قطرہ پانی کے لیے چھال کا چوسنا
نظارے کا یومیہ راتب
جب تک بینائی کھو نہ جائے

اونچائی پر ایک پرندہ
جس نے اپنے نرم پروں کے سائے کو
ان کے منہ سے گزارا
جبڑے کھلے
اور فوراً بند ہو گئے
دانت دانتوں پر زور سے ٹکرائے
رات کے آسمان پر ایک ہلال درانتی
خیالی روٹیوں کی فصل کاٹ گئی
سیاہ کی ہوئی مقدس تصاویر سے نکلے ہوئے ہاتھ
خالی پیالہ تھامے
خاردار تار کی سیج پر
ایک آدمی نے پہلو بدلا
انھوں نے ایک نغمہ پیش کیا، ان کے منہ مٹی سے بھرے ہوئے
"جنگ سے متعلق ایک زندگی سے بھرپور نغمہ
جو سننے والے کے دل میں اتر جاتا ہے"
لکھو، یہاں کی خاموشی کے بارے میں:
ہاں۔

**

Scanned with CamScanner

The Annual of Urdu Studies

Editor
Muhammad Umar Memon

Associate Editor
G. A. Chaussee

Published by
University of Wisconsin-Madison
Center for South Asia
1220 Linden Drive
Madison, WI 53706, USA
Fax: 608/265-3538
Internet: mumemon@facstaff.wisc.edu
chaussee@students.wisc.edu

Number 11 (1996)
is available in Pakistan

Special price : Rs 500

Please call or write to:
aaj ki kitabain
A-16, Safari Heights,
Block 15, Gulistan-e-Jauhar,
Karachi 75290.
Phone: 8113474
e-mail: aaj@biruni.erum.com.pk

Scanned with CamScanner

افریقہ کے ملک روانڈا (Rwanda) میں پچھلے چند برسوں میں ہونے والے واقعات انسانوں کی بار بار اُبھر آنے والی حیوانیت اور سفاکی کی ایک تازہ یاددہانی کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ بات صرف روانڈا تک محدود نہیں کہ انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کو خود سے مختلف پا کر اپنا حریف بنا لیتا ہے اور اسے زندہ رہنے کے حق سے محروم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس اختلاف کی نوعیت الگ الگ ہو سکتی ہے اس دشمنی کے اسباب میں بھی فرق ہو سکتا ہے، لیکن اس قسم کے تمام غیر انسانی واقعات میں مشترک عنصر یہ ہے کہ یکسانی اور اشتراک کے بے شمار پہلوؤں کو نظرانداز کر کے اختلاف کے ایک پہلو کو سب سے اہم سمجھ لیا جاتا ہے۔ روانڈا میں بسنے والے دو گروہ — ہوٹو اور ٹوٹسی — آپس میں اتنا کچھ مشترک اور یکساں رکھتے ہیں کہ کسی غیر ملکی کو ان کے درمیان تمیز کرنے کا کوئی واضح طریقہ سمجھ میں نہیں آتا؛ اس کے باوجود ان میں سے ایک (اکثریتی) گروہ نے چند سال پہلے دوسرے (اقلیتی) گروہ کو صفحۂ ہستی سے مکمل طور پر صاف کر دینے کا ارادہ کر لیا، اور اس میں ہولناک حد تک عملی کامیابی بھی حاصل کی۔ اپنے سے — نسلی، مذہبی، لسانی، قبائلی یا کسی اور اعتبار سے — مختلف گروہ کے وجود کو برداشت نہ کر پانے کا غیر انسانی رویہ انسانی ذہن میں صورتِ حال کا نہایت سادہ، حتمی حل (Final Solution) نکالنے کی شدید ترغیب پیدا کرتا رہا ہے: دوسرے گروہ کو روئے زمین سے بالکل مٹا ڈالنے کی ترغیب۔ یہ تماشا تاریخ نے بار بار دیکھا ہے، اور حالیہ برسوں میں اس کی نوعیت پہلے سے کہیں زیادہ ہولناک ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن کامیابی کے درجات سے قطع نظر، ان کوششوں کا حاصل محض یہ سبق بن رہا ہے کہ یہ حتمی حل دراصل کوئی حل نہیں؛ یہ کوششیں مصائب کا ایک سلسلہ شروع کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ ہمارے ہاں بھی عدم رواداری کا شوق بہت سے نسلی، مذہبی، لسانی اور فرقہ وارانہ گروہوں کے ذہنوں اور دلوں میں اپنے مدِمقابل گروہ کے مکمل خاتمے کو ممکن اور معقول خیال کرنے کی کیفیت پیدا کرتا رہتا ہے۔

روانڈا میں جو کچھ ہوا اُسے نہایت بجا طور پر نسل کُشی (genocide) کا نام دیا گیا ہے۔ آئندہ صفحات میں شائع کیے جانے والے دو مضامین اسی صورتِ حال اور اس کے پیدا کردہ نتائج کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ پہلا مضمون برطانوی خبرنگار لنڈسے ہلسم (Lindsey Hilsum) کی تحریر کا ترجمہ ہے جو لندن کے سہ ماہی جریدے "گرانٹا" کے شمارہ ۵۱ (خزاں ۱۹۹۵) میں شائع ہوئی تھی۔ ہلسم فری لانس صحافی ہیں اور اخبار "آبزرور" اور بی بی سی ریڈیو ۴ کے لیے باقاعدگی سے کام کرتی ہیں۔ دوسرے مضمون "[illegible] مٹا دیے گئے" کے مصنف مارک ڈوئل (Mark Doyle) بی بی سی سے وابستہ ہیں۔ وہ جنگ شروع ہونے سے پہلے سے روانڈا کی خبرنگاری کرتے رہے ہیں اور اس دوران ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ روانڈا میں مقیم واحد غیر ملکی صحافی تھے۔ ان کا مضمون "گرانٹا" کے شمارہ ۴۸ (خزاں ۱۹۹۴) سے لیا گیا ہے۔

ان دونوں مضامین کے درمیان صفحہ ۱۹۰ سے ۲۰۰ تک وہ سب کچھ تصویری شکلوں کی صورت میں دکھایا گیا ہے جسے ظاہر کرنے سے الفاظ قاصر ہیں۔ یہ تصویریں بھی "گرانٹا" کے شمارہ ۴۸ میں شائع ہوئی تھیں۔

Scanned with CamScanner

لنڈسے ہلسم

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

کیگالی کہاں ہے؟

۱

ایوارسٹ رات کو چوکیداری کرتا تھا۔ میں اور وہ روانڈا کے صدر مقام کیگالی کے اس مکان میں اکیلے تھے جب قتلِ عام شروع ہوا۔ یہ ۶ اپریل ۱۹۹۴ کی رات کا ذکر ہے۔ ایک جہاز جس میں روانڈا اور اس کی ہمسایہ ریاست برونڈی کے صدر سوار تھے، مار گرایا گیا تھا اور اس میں سوار تمام لوگ ہلاک ہو گئے تھے۔ کیگالی میں ہر طرف الجھن کی کیفیت تھی۔ چاقوؤں، پستولوں اور ڈنڈوں سے مسلح آدمیوں کے گروہ شہر بھر میں گھوم رہے تھے۔ ہمارے مکان کے باغ کی حد بندی کرنے والی سبز باڑھ سے دوسری طرف کیگالی راکٹوں کے چھٹنے اور دستی بموں کے پھٹنے کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔

میں مکان کے پچھلے حصے سے آتی ہوئی ایوارسٹ کی جھاڑو کے فرش پر گھسٹنے کی آواز سن رہی تھی۔ وہ اپنا فالتو وقت صفائی کرنے، چائے بنانے اور ریڈیو سننے کے مشغلوں میں گزرتا تھا۔ میں عموماً فون پر شہر کے دوسرے حصوں میں رہنے والے لوگوں سے بات چیت کر کے یہ پتا چلانے کی کوشش میں رہتی تھی کہ ادھر کیا ہو رہا ہے، اور پھر لندن فون کر کے تازہ ترین حالات کی رپورٹیں دیا کرتی۔

کوئی ایک ایک گھنٹے کے وقفوں سے میں باہر برآمدے میں چلی جاتی اور ہم دونوں گولیوں

Scanned with CamScanner

چلنے کی آوازیں سنتے اور تشویش بھرے کلمات کا باہم تبادلہ کرتے۔

"یہ سب کتنا ہولناک ہے، ہے نا؟"

"ہاں، بہت ہولناک۔"

"لگتا ہے حالات اور خراب ہو رہے ہیں۔"

میں نے سامنے کا پھاٹک کھول کر باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ گلی سڑک پر گشت کرتے ہوئے دو سپاہیوں نے اپنی رائفلوں کی نالوں کو جھٹکا دے کر مجھے واپس گھر میں لوٹنے کی ہدایت کی۔

دن کے وقت اپنی مصروفیت میں مجھے خوف کا احساس نہ ہوتا۔ رات میں بستر میں لیٹ کر مجھے یہی خیال ستاتا رہتا کہ کیا میں یہاں سے کبھی باہر نکل سکوں گی۔ یوریتھے باہر سوتا تھا۔ ہر دن کا آغاز بندوق چلنے کی آوازوں سے ہوتا۔ مگر اس کے انداز سے کسی خوف کا اظہار نہ ہوتا تھا۔

اس سال روانڈا میں کتنے لوگ — مرد، عورتیں اور بچے — قتل ہوئے؟ پانچ لاکھ؟ دس لاکھ؟ مختلف تنظیمیں اور ادارے اپنا اپنا تخمینہ پیش کرتے ہیں، لیکن یقین سے کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یقین سے کچھ کہنے کے قابل ہونے کے لیے لاشوں کی گنتی کرنے والے، قبریں کھود کر دیکھنے والے قابل اعتبار لوگوں اور ہلاک ہونے والوں کی تعداد کو بڑھا یا گھٹا کر دکھانے کی سیاسی ضرورت سے آزاد غیر جانبدار سائنس دانوں کی ٹیموں کی ضرورت ہوگی۔ اور ہلاک ہونے والوں کی تعداد میں مسخ کر دیے گئے لوگ شامل نہیں ہوں گے: بازو کٹے مرد، ٹانگ کٹے بچے۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ قتل عام کا آغاز اس دوران ہوا جب میں یوریتھے کے ساتھ اس مکان میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ میری نوٹ بک ان دنوں کے بارے میں کچھ زیادہ انکشاف نہیں کرتی: چند ایک فقرے، اکا دکا حقائق جنھیں میں نے بی بی سی تک پہنچایا اور جو بعد میں (جیسا کہ وحشت اور الجھاؤ کے زمانے میں آئے ہوئے مقامات سے بھیجے جانے والے حقائق کے ساتھ بالعموم ہوتا ہے) نادرست ثابت ہوئے۔ مجھے اب بھی ان دنوں کے خواب دکھائی دیتے ہیں — اندھیرے گڑھوں اور کرب میں تڑپتے جسموں سے بھرے خواب۔ لندن واپس پہنچنے کے بعد شروع میں میرے دوست بہت فکرمند رہے۔ کیا میں نے کاؤنسلنگ کی خدمات حاصل کیں؟ مجھے یقیناً اس

سلسلے میں کسی سے بات کرنی چاہیے۔ لیکن میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس سے — یعنی لندن سے ایک کنسلٹنگ روم میں کسی دردمند شخص کے ساتھ معالجانہ گفتگو سے کیا فائدہ ہوگا، کیوں کہ معالج کا واحد مناسب ردِعمل بے پناہ دہشت کا ہوگا؛ اس تجربے کو انگیز کرنے، اس کے ساتھ زندہ رہنا سیکھنے کا کوئی طریقہ نکالا نہیں جا سکے گا۔ میں نے روانڈا میں جو کچھ دیکھا وہ نسل کشی تھی — اس لفظ کے استعمال میں پوری احتیاط برتی جانی چاہیے، لیکن میں نے اسے اُن معنوں میں استعمال کیا ہے جو پرائمو لیوی (Primo Levi) نے متعین کیے تھے: لوگوں کے کسی پورے گروہ یا کلچر کو دنیا سے مکمل طور پر مٹا دینے کا جدید عزم۔

روانڈا میں رہتے ہوئے میں اس عمل کے ادنیٰ سے حصے کو بھی وقوع پذیر ہونے سے نہ روک سکی۔ یہ تو میری سمجھ میں ابھی ابھی تھوڑا بہت آنا شروع ہوا ہے۔ اُس وقت تو میرے بس میں فقط اتنا تھا کہ اسے ہوتے ہوئے دیکھتی اور زندہ بچنے کی کوشش کرتی رہوں۔

میں وہاں کیوں موجود تھی؟ کیوں کہ فری لانس خبر نگاری بے حد ناقابلِ اعتبار اور چناں چہ اتنا ہی متنوع پیشہ ہے۔ اس سے پچھلے دس برس میں نے زیادہ تر افریقا سے باہر رپورٹنگ کرنے میں گزارے تھے۔ کبھی کبھار میں امداد فراہم کرنے والے اداروں کے لیے ایسے ملکوں میں بھی کام کرتی ہوں جنھیں وہ ایمرجنسی کی زد میں آئے ہوئے ملک کہتے ہیں، یعنی ایسے ملک جہاں جنگ کے نتیجے میں بدحالی، بھوک اور بیماری پھیل گئی ہو۔ میں روانڈا کبھی نہیں گئی تھی۔ ۱۹۸۰ کے عشرے میں، جب میرا ٹھکانا نیروبی میں تھا، میری جن صحافیوں سے ملاقات ہوتی وہ اسے ایک بیزار کن جگہ بتاتے — ایک ایسا ملک جہاں دہقان کھیتی باڑی میں لگے رہتے ہیں اور حکومت اپنے کاروبار میں۔ یہ افریقا کا سب سے گنجان آباد ملک تھا جہاں ستر لاکھ افراد ایک اتنے سے رقبے میں رہنے کی کوشش کر رہے تھے جو ویلز سے زیادہ نہ تھا۔ اس کی سب سے بڑی برآمد کافی (coffee) تھی۔ روانڈا کے باشندے فرماں بردار تھے — صرف یہوواہ کے گواہ" نامی گروہ بیگار (umuganda) یعنی اس بے معاوضہ اجتماعی مزدوری میں حصہ لینے سے انکار کرتا جس کی بدولت حکومت ملک میں سڑکوں کا نظام تعمیر کرنے، جنگل اگانے اور پہاڑی ڈھلوانوں پر مٹی کے بہاؤ کو روکنے کے لیے پختہ رکاوٹیں بنانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ امدادی ادارے اُن دنوں روانڈا پر خاصے

مہربان تھے۔ صدر جووینال ہیباریمانا کی حکومت کو سخت گیر مگر منصف اور موثر سمجھا جاتا تھا۔ معاشرہ کچھ ایسے خطوط پر استوار تھا کہ بدعنوانی کی گنجائش کم تھی؛ اگر شفاخانے قائم کرنے کے لیے رقم دی جاتی تو شفاخانے ہی قائم ہوتے۔ سوئٹزرلینڈ والوں نے روانڈا میں ایسے نظم و ضبط کے پابند معاشرے کو دیکھ کر روانڈا کو افریقہ کے دوسرے ملکوں کی نسبت کہیں زیادہ امداد دی۔

پچھلے سال مجھے اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ، یونیسیف، کی جانب سے دو مہینے کے معاہدے کی پیش کش ہوئی۔ مجھے روانڈا اور برونڈی میں کام کرنے والی درجنوں امدادی تنظیموں کی سہولت کے لیے ایک رپورٹ تیار کرنا تھا، تاکہ وہ باہمی رابطے کو زیادہ موثر بنا سکیں اور دونوں ملکوں کی سیاست کو سمجھ سکیں۔

اس سے پہلے روانڈا چار سال طویل جنگ ہو چکی تھی۔ لیکن اس کا اختتام امن کے معاہدے پر ہوا تھا اور فروری ۱۹۹۴ میں جب میں کیگالی پہنچی یعنی صدر کے طیارے کے تباہ ہونے سے دو ماہ پہلے، کہیں کہیں کے دستی بم کے دھماکے یا اکا دکا سیاسی قتل کو چھوڑ کر ملک کی صورتِ حال پرامن تھی۔ روانڈا سے باہر ان واقعات کو خطرہ تک نہ سمجھا جاتا تھا۔ روانڈا کے اندر ہر شخص کسی بات کے ہونے کا منتظر تھا: سیاسی معاہدوں پر عمل درآمد، جنگ کا دوبارہ آغاز، کوئی بھی بات۔

کیگالی پہاڑیوں کے ایک سلسلے پر پھیلا ہوا ہے اور جب میں یہاں پہنچی تو تمام رستے فصلوں اور پھولوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور ہر طرف سبزے کی افراط تھی۔ تاہم، شہر خاصا بدوضع تھا۔ کنکریٹ کے مکانوں کی دیواروں پر سے رنگ جھڑ رہا تھا، اور ہر روز ہونے والی موسلادھار بارش ڈھلوان سڑکوں پر ہر طرف کیچڑ پھیلا دیتی۔ شہر میں چلتے پھرتے سر سے ننگے بچے موزنگو موزنگو پکارتے ہوئے دوڑا کرتے، جو ان کی زبان میں گوری چمڑی والوں کا نام ہے، اور ان کی اس عادت سے تہذیب کی اس کمی کا اندازہ ہوتا جو نیروبی یا کمپالا، بلکہ برونڈی کے صدر مقام بوجمبورا تک میں محسوس نہ ہوتی تھی۔ امداد میں آنے والی کھیپ سے چرائی ہوئی چیزیں بازار میں بکتی تھیں، جیسے خوردنی تیل کے چوکور ڈبے جن پر امریکہ کے جھنڈے کا یا یورپی یونین کا ستاروں والا نشان بنا ہوتا۔ اگر درست لوگوں کا نام پتہ معلوم ہو تو آپ تین ڈالر کے عوض ایک دستی بم بھی مول لے سکتے تھے۔

سیاسی طاقت، ایک فرانسیسی سفارت کار نے ایک شام مجھے بتایا، روانڈا میں دولت تک پہنچنے کا واحد راستا ہے۔ یہاں کے زیادہ تر سیاست دانوں کے پاس تو لوٹ کر جانے کے لیے فارم بھی نہیں ہیں۔ اگر ان سے اقتدار چھن جائے تو ان کے پاس کچھ نہیں رہے گا۔

یہ سفارت کار مجھے رات کے کھانے کے لیے ایک ریستوراں میں لے گیا جس کا مالک عفیف نامی ایک مارونی لبنانی تھا جس کا اصل پیشہ عمارت سازی تھا۔ ریستوراں میں ہمارے سوا کوئی نہ تھا۔ چند ایک سازندے، روانڈا کے روایتی لباس کے طور پر لمبے لبادے پہنے، شامی موسیقی بجا رہے تھے۔ موڈ غم انگیز تھا۔ عفیف کی رقم عوامی تعمیرات کی وزارت کی طرف نکلتی تھی اور کسی صورت اس کے ہاتھ نہ آ رہی تھی۔ "جب سے جمہوریت آئی ہے، پائی تک پانا محال ہو گیا ہے،" وہ بولا۔ اس شام اس کا اور سفارت کار کا بیشتر وقت فون پر سیاست دانوں سے باتیں کر کے یہ ٹوہ لگانے میں گزرا کہ حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے کیا کیا سمجھوتے کیے گئے ہیں۔ میں نے عفیف سے اس کے تعلقات کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اکثر وزیروں کو رشوت دے چکا ہے، اور وہ اس سے خوف زدہ ہیں۔

دن کے وقت میری گفتگوئیں اور طرح کی ہوتی تھیں۔ مغربی امدادی اداروں کے کارکن روانڈا کو دوسرے زاویۂ نظر سے دیکھنے کو ترجیح دیتے تھے، یعنی اس نسبتاً نوازشانہ انداز سے جس کا اظہار یوں ہوتا تھا کہ پچھلے ہفتے امداد کے کتنے تھیلے پہنچائے گئے اور کتنے بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگائے گئے۔ سیاست، یا یہ بات کہ روانڈا کے باشندے اپنے حال اور مستقبل کی بابت کیا خیالات رکھتے ہیں، اس دنیا میں کم ہی وجود رکھتی تھی۔ دفتر کی دیوار پر لگے نقشے میں کیمپوں کے جھنڈے ٹکے ہوئے تھے جن میں دو قسم کے پناہ گزیں آباد تھے: شمال میں وہ لوگ جو روانڈا میں ہونے والی جنگ کے باعث بے گھر ہوئے، اور جنوب میں وہ جو برونڈی میں چند ماہ پہلے ہونے والی فوجی بغاوت کی کوشش سے جان بچا کر آ گئے تھے۔ بعض مقامات پر خشک سالی اور قحط کی صورت حال تھی اور ملیریا پھیل رہا تھا۔ شہروں اور قصبوں میں حاملہ عورتوں میں سے نصف ایڈز کے ایچ آئی وی وائرس سے متاثر تھیں۔ آبادی بڑھ رہی تھی؛ زمین کی قلت تھی۔ چنانچہ غذا کے تھیلوں اور حفاظتی ٹیکوں کے موضوعات کیا کیا جانا چاہیے قسم کی بات چیت، یعنی، پالیسی کے، تمام، کو ٹالنے کا ایک ذریعہ تھے۔

روانڈا کے جو باشندے یونیسیف میں کام کرتے تھے وہ سیاست پر بات کرنے کو کسی

Scanned with CamScanner

طرح تیار نہ ہوتے تھے۔ سیکرٹری لڑکیاں مجھے کمپیوٹر کا استعمال سکھلاتیں اور چپے دوری سے متعارف کرانے کا وعدہ کرتیں۔ وہ میرے سوالوں کو کندھے اچکا کر ٹال جاتیں۔ یہاں کے لوگ بڑے خطرناک ہیں، ایک نے کہا، منہ پر جھوٹ بول دیتے ہیں۔

اور تب، ایک دن، مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ یونیسیف کا پہلا نیوز لیٹر تیار کرتے ہوئے میں نے جنگل میں بسنے والے بونے ٹوا (Twa) لوگوں کی چھوٹی سی آبادی کو درپیش مسائل کے بارے میں جنوب مغربی روانڈا کی کیتھولک ریلیف سروس کی ایک اندرونی رپورٹ کا اقتباس دے دیا۔ "خشک سالی کے باعث یہ لوگ کھیتوں پر مزدوری حاصل نہیں کر پا رہے ہیں، اس لیے ان میں چوری چکاری کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ جب یہ لوگ پکڑے جاتے ہیں تو انہیں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔"

یونیسیف نے میری رپورٹ کا مسودہ واپس بھیجا تو اس اقتباس پر لکیر پھیر دی گئی تھی۔ مجھے ہدایت کی گئی کہ اس حوالے کو حذف کر دوں اور آئندہ ٹوا لوگوں کا نام تک لینے سے باز رہوں۔ یا ہوتو قبیلے کے افراد کا۔ یا ٹوتسیوں کا۔ لوگوں کے نسلی گروہ — ان کی ethnic — کی طرف اشارہ کرنا بہت خطرناک ہے، کیوں کہ یہ ایک انتہائی حساس معاملہ ہے۔ اگر کسی تنازعے میں کسی مخصوص گروہ پر حملہ ہو یا اسے پہنچنے والا نقصان غیر متوازن طور پر زیادہ ہو، تو مجھے اس کی طرف توجہ دلانے سے احتراز کرنا چاہیے۔ روانڈا کے تمام رہنے والے صرف روانڈا کے شہری ہیں۔

یہ ایک ایسے سچ سے انکار تھا جو کسی انتہائی ناواقف غیر ملکی پر بھی پوری طرح عیاں تھا، اگرچہ اس انکار کی بنیاد ضرور نیک نیتی پر تھی۔ جب کوئی غیر ملکی افریقا میں آتا ہے اور کسی ملک کے باشندوں کے درمیان کوئی نہایت ظالمانہ اور بے ہودہ سی بات ہوتے دیکھتا ہے، تو اس موقعے پر "قدیم قبائلی نفرتیں" جیسے فقروں میں چھپی آسان ترین توضیح اس کے کام آتی ہے، یا پھر یہ سادہ خیال کہ براعظم افریقا کو قطع کرتی ہوئی سیدھی سرحدیں، جو یورپی باشندوں کی کھینچی ہوئی ہیں، محض نقشہ نویسی کے کام کا نتیجہ ہیں اور ان سرحدوں نے، خود کو ایک جدید قومی ریاست کے پرچم تلے ساتھ رہنے پر مجبور، انسانوں کے مختلف گروہوں — یا، اگر آپ کو یہی لفظ پسند ہے تو قبیلوں — کے مابین زمین یا طاقت ہتھیانے کی قدیم کشمکش کی صرف پردہ پوشی کی ہے، اس

کش مکش کو حل نہیں کیا۔ پھر غیر ملکی کی ملاقات افریقی باشندوں سے ہوتی ہے جو اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ سفید لوگ خود، اپنے باہمی تنازعات کا ذکر کرتے ہوئے قبائلیت کا کوئی حوالہ نہیں دیتے؛ اور یہ کہ ان علاقوں کو اپنی نوآبادی بنانے والے یوروپی باشندے قبائلی امتیازات کو اپنا استعمار قائم رکھنے کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں؛ اور یہ کہ قبائلیت کا تصور افریقی سیاست اور تاریخ کی پیچیدگیوں کو نظر سے اوجھل کر دیتا ہے۔ چناں چہ دردمند غیر ملکی یہ اصطلاح استعمال کرنا ترک کر دیتا ہے: ہم اس لفظ کا سامنا کرنے سے کترانے لگتے ہیں، افریقا میں کسی سے اس کے نسلی گروہ کی بابت دریافت کرنے سے ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے۔ لفظوں سے خوف زدہ ہو کر ہم اس حقیقت ہی کی پردہ پوشی کر دیتے ہیں یہ الفاظ جس کا اظہار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

روانڈا میں قبائلیت کا تصور خاص طور پر نامناسب ہے۔ زبان، رسم و رواج اور علاقوں کے بیش تر امتیازات، جو افریقا کے کسی اور ملک میں ایک قبیلے کو دوسرے سے جدا شناخت کرنے کے کام آتے ہیں، یہاں وجود نہیں رکھتے۔ روانڈا میں رہنے والے تمام لوگ ایک ہی زبان — کینیاروانڈا — بولتے ہیں، ان کا کلچر ایک ہے، اور وہ انھیں پہاڑیوں پر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ اور اس کے باوجود ان کے درمیان تقسیم موجود ہے۔ ایک طرف ہُوتو ہیں جن پر آبادی کی بڑی اکثریت مشتمل ہے (کہا جاتا ہے کہ وہ نوّے فیصد ہیں، گرچہ مردم شماری کے نتائج پر پوری طرح اعتبار نہیں کیا جا سکتا)، اور دوسری طرف تُوتسی۔ ان کے علاوہ ٹوا بھی ہیں۔ بچوں کے لیے کوئی رہنما کتاب لکھی جائے تو اس میں کہا جائے گا کہ تُوتسی بالعموم ہوتو باشندوں کے مقابلے میں دراز قد ہوتے ہیں، اور اس کے بعد ان میں باہم امتیاز کرنے والی کسی اور ظاہری خصوصیت کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔

لیکن روانڈا کے لوگ اس بارے میں بہتر علم رکھتے ہیں۔ وہ خاندان اور حسب نسب کے بارے میں بات کر کے ایک دوسرے کی اصل کا پتا چلا لیتے ہیں۔ غیر ملکی اتنے چابک دست نہیں ہوتے، چناں چہ پوچھنے سے بھی کتراتے ہیں۔ اس کے باوجود 'ایتھنی'، یعنی تاریخ اور نظریات کا ڈھالا ہوا پیچیدہ نسلی احساس، ہی روانڈا کے باشندوں کے لیے شناخت کا تعین کرنے والا بنیادی نقطہ ہے۔ یہ احساس قبائلیت سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ اور شدت آمیز ہے۔ غیر ملکی شاید یہ سمجھتے

Scanned with CamScanner

رہے ہوں کہ نسلی تقسیم کی سیاست کو نظر انداز کرنا ہی محفوظ ترین طریق عمل ہے، لیکن یہ حساس معاملہ ابھی سمجھ میں پوری طرح نہیں آیا، اور اگر آ بھی جائے تو ہم اس کے متوقع نتائج پر کسی یقین نہ کر پاتے۔ کیونکہ بالآخر اس نسلی تقسیم ہی کی بنیاد پر یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ کن لوگوں کو زندہ رہنا ہے اور کنہیں مار دیا جانا ہے۔

۲

میرا خیال ہے کہ مجھے گزشتہ چند برسوں سے کچھ کچھ اندازہ ہوا ہے کہ یہ نسلی تقسیم کیا نتائج پیدا کر سکتی ہے، کیونکہ میں یوگنڈا میں روانڈا کے پناہ گزینوں سے مل چکی تھی۔ وہ اس بات کی شہادت تھے کہ روانڈا، جہاں کی واحد اور حکمران جماعت خود کو ترقی کی تحریک کے طور پر متعارف کراتی ہے، اس سے پہلے بھی تشدد اور سیاسی انتشار کے دور سے گزر چکا ہے۔ یہ پناہ گزین توتسی تھے، یعنی اس اقلیت سے تعلق رکھتے تھے جس نے نوآبادیاتی دور سے پہلے روانڈا پر حکمرانی کی تھی اور نوآبادیاتی زمانے میں بھی اپنی بالادستی برقرار رکھی تھی۔ ۱۹۶۲ میں جب بیلجیئن رخصت ہوئے اور اکثریتی ہوتووں کے پاس اقتدار آیا تو انہیں کھدیڑ کر باہر نکال دیا گیا۔ یہ توتسی روانڈا کی سرحد سے کچھ باہر یوگنڈا میں قائم کیمپوں میں رہ رہے تھے، لیکن وہ ایک کامیاب برادری تھے؛ ان میں بعض اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کی غرض سے یوروپ اور شمالی امریکا کی یونیورسٹیوں میں بھیجتے تھے۔ پھر ۱۹۹۰ میں ان توتسی جلاوطنوں کی ایک فوج نے، جو خود کو روانڈن پیٹریاٹک فرنٹ (RPF) کا نام دیتے تھے، روانڈا پر حملہ کر دیا۔ انہیں تقریباً فوراً ہی پسپا کر دیا گیا لیکن وہ جلد ہی پھر یکجا ہوئے اور جنگ کا آغاز ہو گیا۔ ۱۹۹۳ کے آتے آتے آر پی ایف ایک ترقی یافتہ گوریلا فوج بن چکی تھی جو بڑھتی، پسپا ہوتی اور پھر پیش قدمی کرتی تھی۔

جنگ نے دس لاکھ تک ہوتو لوگوں کو اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان میں سے کئی لاکھ کیگالی شہر کے باہر کیمپوں میں تکلیف دہ حالت میں رہ رہے تھے، لیکن منصوبہ یہ تھا کہ بہت جلد یہ لوگ ـــــ اور گزشتہ عشروں کے بے گھر توتسی پناہ گزین بھی ـــــ اپنے اپنے گھروں کو

لوٹ جائیں گے۔ اگست ۱۹۹۳ میں شمالی تنزانیہ کے شہر آروشا میں امن کے معاہدے پر دستخط ہو چکے تھے جس کی رو سے حکومت اور باغیوں کی اقتدار میں شراکت ہوئی تھی اور اس کی نگرانی کے لیے اقوامِ متحدہ کے سپاہی ملوائے جانے تھے۔ باغی لیڈروں کو عبوری حکومت میں شامل کر کے وزیر بنایا جانا تھا۔ سفارت کار افریقا میں تنازعات کے حل کے ایک قابلِ تقلید نمونے کے طور پر معاہدہ آروشا کا تذکرہ کرنے لگے تھے۔ (اور بلاشبہ حل کرنے کے لیے تنازعات کی کوئی کمی نہ تھی۔ روانڈا میں تقریباً چار لاکھ افراد پر مشتمل ایک اور بے گھر آبادی بھی موجود تھی جو اکتوبر میں یک ناکام فوجی بغاوت کے رونما ہونے کے بعد، جس میں برونڈی کا ہُوتو صدر مارا گیا تھا، روانڈا کی جنوبی سرحد پار کر کے ملک میں داخل ہوئی تھی۔ برونڈی کی فوج میں تُوتسیوں کا غلبہ تھا اور روانڈا میں داخل ہونے والے پناہ گزین ہُوتو تھے۔ وہ قابلِ رحم کیمپوں میں رہ رہے تھے جن کی نشان دہی ہمارے دفتر کی دیوار پر لگے ہوئے نقشے میں کی گئی تھی۔ بین الاقوامی برادری کافی مقدار میں غذا فراہم کرنے سے قاصر رہی تھی؛ ان پناہ گزینوں کے بچوں میں سے بہت سے مر رہے تھے۔)

مارچ میں میں نے یوگنڈا کی سرحد کے قریب آر پی ایف کے ایک جلسے میں شرکت کی۔ آر پی ایف کے حامی، جو تمام توتسی تھے، بسیں بھر بھر کر آنے والے اچھے دنوں کی باتیں کرتے، کیگالی سے وہاں پہنچے۔ اقوامِ متحدہ کے ایک دفتر میں سیکرٹری کے طور پر کام کرنے والی تیریز آر پی ایف کے کارکنوں میں سے اپنے لیے شوہر تلاش کر پانے کے امکان پر پُرجوش تھی "یہ لڑکے بڑے ہینڈسم ہیں۔ آر پی ایف کو شہر میں آلینے دو، پھر اگر تم چاہو تو تمھارے لیے بھی ایک عدد شوہر کا بندوبست ہو سکتا ہے۔"

وہ آر پی ایف سے ہم دردی رکھنے کے شبہے میں ۱۹۹۰ میں چار مہینے کی قید کاٹ چکی تھی۔ اس کی عمر پینتیس برس کے لگ بھگ تھی اور اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس کی وجہ سیاست کو قرار دیتی تھی۔ "ہُوتو مردوں کو، جو سول سروس یا دوسری اچھی ملازمتوں پر ہوں، توتسی عورتوں سے شادی کی اجازت نہیں،" اس نے کہا۔ یہ بات پورے طور پر سچ نہ تھی۔ صرف سپاہی پیشہ مردوں کو توتسی عورتوں سے شادی کی ممانعت تھی۔ ورنہ بااختیار ہوتو مردوں میں توتسی بیوی رکھنا اسٹیٹس کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اصل مسئلہ، میں نے خیال کیا، یہ تھا کہ تیریز جیسی توتسی عورتیں ہُوتو مردوں سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔

میں نے پتہ کرنے کے سلسلے میں سیکھنے کی کوشش شروع کی۔ غیر ملکیوں کی سی مستعدی سے کام لے کر میں نے ایوارسٹے سے اس کے نسلی پس منظر کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا، لیکن وہ دراز قد اور چھریرے بدن کا تھا اور اس کی ناک پتلی تھی، اور یہ تمام جسمانی علامات وہ تھیں جو توتسیوں میں پائی جاتی ہیں، اور مکان کی مالکہ نے مجھ پر یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ وہ توتسی ہے۔

خیر، میں اسے کچھ زیادہ نہ جانتی تھی اور اس کا نسلی پس منظر میرے لیے کوئی اہم مسئلہ نہ تھا۔ وہ محض چوکیدار تھا۔ بر اعظم افریقہ کے دوسرے شہروں کی طرح کیگالی میں آ بسنے والے غیر ملکی، اور مال دار دیسی بھی، اپنے مکانوں کی حفاظت کے لیے زمو (zammu) یا چوکیدار رکھتے ہیں۔ دولت مند لوگ ہمیشہ غریبوں کے نرغے اور پہرے میں رہتے ہیں۔ کیگالی میں جوں جوں جرائم اور دنگوں میں اضافہ ہوتا گیا، یہ زمو لوگ رفتہ رفتہ سیکھ گئے کہ دروازہ صرف گوری رنگت والوں کے لیے کھولا جاتا ہے، یا پھر ان کالوں کے لیے جو امدادی اداروں کے نشان والی گاڑیوں میں آتے ہوں۔

میری اور ایوارسٹے کی بات چیت مالک اور ملازم کے درمیان ہونے والی سلام دعا تک محدود تھی۔ "بون ژور مادام!" "بون ژور ایوارسٹے! کیسے ہو؟" وہ فرانسیسی بولتے ہوئے جھجکتا تھا اور کسی گفتگو خود نہ چھیڑتا۔ اس نے جنریٹر لانے میں ہماری مدد کی۔ صدر کے ہلاک ہونے سے پہلے کے تناؤ زدہ ہفتوں میں، شہر کے اس حصے میں جہاں ہم رہتے تھے، بجلی ہفتے میں دو شاموں تک محدود ہو گئی تھی۔ جنریٹر کی گھڑگھڑاہٹ نے وقفے وقفے سے ہونے والے دستی بموں کے دھماکوں اور بندوقیں چلنے کی آوازوں کو کسی قدر ڈھانپ لیا؛ اس سے پیدا ہونے والی روشنی میں ہم کام کرنے اور پڑھنے کے قابل ہوئے۔ میں رات میں عموماً باہر نہیں جاتی تھی۔

کیگالی میں اپنے قیام کے پہلے چند ہفتے میں نے ایک ہوٹل میں گزارے تھے۔ وہاں میں بار کی چھپر کی چھت کے نیچے لکڑی کی بھدی میزوں میں سے ایک پر بیٹھ کر لوگوں کو دیکھا کرتی۔ ایک شام چمڑے کی جیکٹ پہنے ایک نوجوان آیا اور باتیں کرنے لگا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے بیلجیم کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا ہے لیکن ویزا دینے سے انکار کر دیا گیا ہے۔

میں ایتھنسٹی کے مسئلے کو سمجھنا چاہتی تھی ___ اس موضوع پر کسی اجنبی سے بات کرنا نسبتاً آسان تھا ___ چنانچہ میں نے اس کا شناختی کارڈ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے بٹوے میں

سے اپنا کارڈ نکالا۔ نام، باپ کا نام، مقامِ پیدائش، مقامِ سکونت، ایتھنی۔ اس آخری خانے میں ہوتو، توتسی، ٹوا اور 'نیچرلائزڈ' میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تھا۔ آخرالذکر درجہ روانڈا کی شہریت حاصل کرنے والے غیرملکیوں کے لیے تھا۔

"یہ بیلجیئم والوں کا کیا دھرا ہے،" وہ بولا۔ "انھوں ہی نے ہم پر یہ کارڈ رکھنے کی پابندی لگائی تھی۔"

"لیکن بیلجیئم والوں کو تو رخصت ہوئے تیس برس ہو چکے ہیں! تم لوگوں نے یہ سلسلہ ختم کیوں نہیں کر دیا؟ آخر کینیا والوں نے بھی تو یہی کیا ہے،" میں نے کہا۔

"آپ نہیں جانتیں بیلجیئم والے کس قسم کے لوگ تھے،" اس نے کہا۔ "انھوں نے ہمیں ابھی نوآبادی بنایا اور ہمیں یہ شناختی کارڈ دیے۔ اب وہ مجھے ویزا تک دینے کو تیار نہیں۔ یہ نسل پرستی ہے!"

ایک ستمبر کی رات کو لوگوں کی ایک ٹولی نے بار میں دستی بم پھینکا۔ آٹھ آدمی ہلاک اور بیس زخمی ہوئے۔ ہوٹل ملک کے واحد نمایاں توتسی سیاست داں کی ملکیت تھا۔ چند دن بعد کچھ توتسی گھروں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھرنے والے بم پھینکے گئے۔ اسپتال خبروں اور بم کے نوکدار ٹکڑوں سے زخمی ہونے والوں سے بھر گئے۔ اس کے بعد جلد ہی میں ہوٹل سے اس مکان میں اٹھ آئی۔ میں شامیں گھر ہی پر گزارتی اور 'مڈل مارچ' پڑھتی رہتی۔ اور تب صدر کا طیارہ مار گرایا گیا۔

۳

صدر کے مارے جانے کے فوری بعد کے دنوں میں میں نے اور یوارستے نے ایک معمول طے کر لیا۔ فائرنگ کے مدھم پڑنے پر ہم چند گھنٹوں کے لیے سو جاتی؛ صبح سورج نکلنے کے وقت جب فائرنگ دوبارہ شروع ہوتی تو میں ٹیلیفون کے پاس بیٹھ کر کام کرنے لگتی۔ غیرملکی افراد جلد از جلد وہاں سے نکلنے کی کوششوں میں مصروف تھے، لیکن میں نے اپنا خبرنگار والا کردار دوبارہ اختیار کر لیا اور وہیں رکی رہی۔

قاتل سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کرتے اور گھروں میں گھس گھس کر لوگوں کو ہلاک کرنے میں مشغول تھے۔ دن میں ایک بار یا رستے ہے بلکہ پڑوسی کو فون کر کے پتا لگانے کی کوشش کرتا کہ آیا اس کی بیوی اور دونوں بچے اب تک زندہ ہیں۔

میں سوچتی: وہ توتسیوں کی تلاش میں ہیں۔ کسی بھی لمحے ایوارسنتے پر حملہ کریں گے۔

میں نے اسے مکان کی مالکہ کے بیڈروم میں سونے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، جو گھر میں موجود نہیں تھی۔ میرا خیال تھا وہ وہاں محفوظ رہے گا۔ لیکن اس نے انکار کر دیا، پہلے یہ کہہ کر کہ وہ مالکہ کے بستر میں سونے کی جرأت نہیں کر سکتا، اور بعد میں یہ کہہ کر کہ گشت کے سپاہیوں نے علاقے کے تمام چوکیداروں کو ہدایت کی ہے کہ مکان کے باہر رہ کر صرف اپنے کام، یعنی میرے لوگوں کے مکانوں کی حفاظت، پر توجہ دیں۔ اور سپاہیوں کی ہدایت میری بات سے زیادہ موثر تھی۔

ٹیلی فون پر مجھے خبریں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں وصول ہوتیں جنھیں میں جوڑ کر مکمل کرنے کی کوشش کرتی اور پھر لندن ارسال کرتی۔ مردوں کے ایک گروہ نے ایک امدادی ادارے کے کارکن کے گھر میں داخل ہو کر مطالبہ کیا تھا کہ وہ اپنے توتسی باورچی کو ان کے حوالے کر دے۔ اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا، لیکن انھوں نے کسی نہ کسی طرح باورچی کو ڈھونڈ نکالا اور ہلاک کر دیا۔ وزیراعظم آگاتھے اووی لنگی یمانا، جو ہوتو تھی، اور ہوٹل کا توتسی مالک، دونوں مارے جا چکے تھے۔ اقوام متحدہ کے دس بیلجیم سپاہی بھی ہلاک کر دیے گئے تھے کیوں کہ بیلجیم کو آر پی ایف کا حامی تصور کیا جاتا تھا: ہوتوؤں کا کہنا تھا کہ صدر کا طیارہ مار گرانے کے واقعے میں بیلجیم کا ہاتھ ہے۔ آر پی ایف نے شمال میں اپنے مورچے چھوڑ کر کیگالی کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تھی۔

میں یونیسیف سے تعلق رکھنے والے تین روانڈائی باشندوں سے واقف تھی وہ مجھے شہر کے مضافاتی علاقوں سے فون کرتے۔ ان کا لیے دیے رہنے کا رویہ رخصت ہو چکا تھا، اب ان کی بے تکلفی کی بنیاد ایسی دہشت تھی جیسی دفتر میں ہوا کرتی تھی، اور اب وہ مدد کے طالب تھے۔ میرا ایک ساتھی، ڈرائیور، ہوتو تھا لیکن اس کا بیٹا جس کا قد توتسیوں کی طرح لمبا تھا، اپنا شناختی کارڈ کھو بیٹھا تھا۔ انھوں نے اسے قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔ میں نے انھیں ریڈیو دیا تب اس کی جان بچی۔ اگر وہ دوبارہ آگئے تو میں کیا کروں گا؟

"انھیں تھوڑے تھوڑے کر کے پیسے دو، سب کچھ یک مشت دینا۔" میں نے مشورہ دیا۔

"مگر ایک اور مسئلہ بھی ہے۔ انھوں نے میرے پڑوسی موسیو الیسی [illegible] دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اس کا دوست تھا، مگر یہ غلط ہے، میں تو اسے ٹھیک سے جانتی بھی نہ تھی۔ وہ بیلجیئن تھا۔ میں نے سفارت خانے کو فون کیا ہے لیکن وہ آکر لاش اٹھانے کو تیار نہیں ہیں۔ اب اس میں سے بُو اٹھنے لگی ہے۔"

"اسے دفن کر دو۔" میں نے کہا۔ "یہ تو لوگوں کی صحت کے لیے خطرہ ہے۔"

"لیکن وہ گورا ہے۔ اس کی تدفین مناسب طریقے سے ہونی چاہیے۔"

"اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کی رنگت کیا ہے، اب تو وہ مر چکا ہے۔ بس اسے زمین میں گاڑ کر دعا پڑھ دو۔"

"لیکن سپاہی کہیں گے کہ میں نے اسے اس لیے دفن کیا ہے کہ وہ میرا دوست تھا۔ تب کیا ہوگا؟"

"ان سے کہہ دینا تم اسے نہیں جانتے تھے۔ تم نے اسے اس لیے دفنایا ہے کہ لاش سڑنے لگی تھی۔"

اگلے دن فرانسوا کا پھر فون آیا۔ "شکریہ،" وہ بولا۔ "میں نے تمھاری بات پر عمل کیا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم نے گھر کے سامنے گڑھا کھود کر اسے دفن دیا۔ ممکن ہے جنگ ختم ہونے کے بعد بیلجیئم والے اس کی لاش لینے آئیں۔"

"ہو سکتا ہے،" میں نے کہا، اور سوچا: بس؟ میں صرف اتنا ہی کر سکتی ہوں؟ کہ پڑی ہوئی لاش کو دفنانے کا مشورہ دے دوں؟

فون کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی۔ اس بار دفتر کی ایک اور ساتھی فرانسوز کا فون تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں توتسی تھی ــــ دراز قد، ہلکی رنگت اور چھریرے بدن والی ــــ اور ان عورتوں میں سے ایک تھی جن کے ساتھ جا کر میں نے پچھلے ماہ آر پی ایف کے جلسے میں شرکت کی تھی۔ اب وہ ہسٹیریائی انداز میں سسکیاں لے رہی تھی اور ایک الماری میں چھپی بیٹھی تھی۔ اس کے شوہر کو اس کے گھر کے باہر سڑک پر مار دیا گیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اب اس کے خاندان کی باری ہے۔ "اگر انھیں رقم اور زیورات دے دیے جائیں تو وہ ہلاک نہیں کرتے۔ لیکن ہم انھیں سب کچھ دے چکے ہیں۔ وہ

جا سکتی تھی اور فوج مستعدی سے ان کی جان بچا سکے۔ لیکن فوج مستعدی سے صرف غیر ملکیوں کو باہر نکال رہی تھی۔

آرمی چیف کا ایک دستہ پارلیمنٹ کی بڑی عمارت کی دیوار توڑ کر باہر نکل آیا تھا اور اس نے صدر کی سرکاری رہائش پر حملہ کر دیا تھا۔ ... رنگ سے ایئرپورٹ جانے والی سڑک بند ہو گئی تھی۔ ... وزیروں کی حکومت ... تمام سیاست دان یا تو مارے جا چکے تھے یا روپوش تھے۔ ایک نئی حکومت نے خود اقتدار سنبھال لیا تھا۔

میں نے ... کی کوشش کی کہ کسی طرح ... لوگوں کی جان بچا کر انہیں خطرے والے علاقوں سے نکالا جائے۔ مگر میں خود تو معذور تھی۔ یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ ... لوگوں کو گاڑیوں سے کھینچ کھینچ کر نکالا جاتا اور قتل کیا جا رہا تھا۔ میری گاڑی میں پٹرول تقریباً ختم ہو چکا تھا، اور میں ان مضافاتی علاقوں سے بھی واقف نہ تھی جہاں وہ لوگ رہتے تھے۔

ایک ... باہر ... ریڈ کراس ... کی کالونی آیا ... سینکڑوں، بلکہ شاید ہزاروں لاشیں دیکھ چکا تھا۔ ان ... قتل عام کی داستان ... تصور سے بھی باہر تھا۔ میں ... مجھے دوست ریڈ کراس ... وقت ہو گا۔ کل صبح میں ... گاڑی میں بیٹھ کر ... پہاڑیوں ... گروہ ... پہاڑی راستوں سے گزر کر ریڈ کراس کے ہیڈ کوارٹر ... ایک میڈیکل ٹیم کو ساتھ لے کر مضافات میں واقع ریڈ کراس کے ... دو عورتیں، جو ... زخمی ہوئی تھیں ... پانچ ... پہاڑی کی چوٹی پر ایک مکان ... دو ... عورتوں کی لاشیں ... ان کے چہرے وحشت میں ... ہو چکے تھے ... ایک عورت ... ہاتھ ... سے ریڈ کراس ... صبح کے وقت ... وہاں پہنچے۔ ... لوگوں کو

لوگوں نے موقعے پر قتل، دلہن کو بچے سمیت مار کر اسے پہاڑی کے ویران سے مکان میں لے جا کر مار ڈالا۔

ہم نے عمارت میں داخل ہو کر کانچ کے ٹکڑوں، پھٹے ہوئے کاغذوں، ٹوٹے فرنیچر اور رسّوں کے درمیان سے راستہ بنایا۔ وہاں کی بے ترتیبی سے قتل کی، مجھے وردی پوشوں کی وحشت کا پتا چلتا تھا۔

زخمیوں کو ہم نے فوری اسپتال پہنچایا۔ مرتے ہوئے لوگ ایک ایک بستر پر دو دو اور تین تین اور فرش پر پڑے ہوئے تھے اور وارڈ میں داخل ہونے کا راستہ بند تھا۔ نرسیں ان کے اوپر سے پھلانگ کر ادھر جا رہی تھیں۔ سیڑھیوں پر اور نالیوں میں خون بہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر، جن میں دیر تک لاشیں پڑی رہیں، ایک کے بعد ایک آگے پیچھے جا رہے تھے۔ ایک عورت ایک بچے کو ہاتھوں میں لیے وارڈ میں آئی جس کی ایک ٹانگ آدھی کٹ گئی تھی اور اندر کے عضلات اور نسیں دکھائی دے رہی تھیں۔ زخمیوں کے رشتہ دار قتل کی ایسی کہانیاں سنا رہے تھے، جو سب کی سب ایک جیسی تھیں [illegible] تو پڑوسیوں اور سپاہیوں نے ان کے گھر میں دستی بم پھینک دیا کیوں کہ وہ توتسی تھے۔

اسی رات، ہمارے رخصت ہونے کے بعد، سپاہی وارڈ میں گھس آئے اور انھوں نے زیادہ تر زخمیوں کو ختم کر دیا۔

میں اپنے مکان میں واپس چلی آئی۔ ایوارسٹے اب بھی وہیں تھا۔ اگلی صبح، یعنی اس خوں بار رات کے ختم ہونے پر، میں لونگ روم میں گئی اور بیٹھ کر رونے لگی۔

ایوارسٹے میرے بالکل سامنے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ آخر کار وہ فرانسیسی میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "آپ کیوں رو رہی ہیں، مادام؟"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے،" میں نے جواب دیا۔ وہ منتظر رہا۔

"ڈریے مت،" بہت دیر بعد وہ بولا۔

میں نے اسے بتایا کہ مجھے جانا ہو گا۔ میں اس مکان میں زیادہ عرصے نہیں رہ سکتی کیوں کہ حملہ آور کسی بھی وقت آ جائیں گے۔ دوسروں کے بغیر میں اپنا کام نہیں کر سکتی۔ مجھے یہ مکان چھوڑ کر اس ہوٹل میں جانا ہو گا جہاں دوسرے سفید فام ٹھہرے ہوئے ہیں۔ لیکن میں اسے یہاں نہیں چھوڑنا

چاہئی۔ یورپ کے پاس اس بات کا سیدھا سادہ جواب تھا۔

آپ یورپین ہیں، آپ کو دوسرے یورپینوں کے ساتھ رہنا چاہیے، اس نے کہا۔

اقوامِ متحدہ کا سکیورٹی افسر، فرانس کا ایک ارجنٹین والا سابق سپاہی جسے اس کے ریڈیو کے علامتی نام موستاش (مونچھ) سے جانا جاتا تھا، بڑی گاڑی میں محض ایک مسلح محافظ کو ساتھ لیے، غیرملکیوں کو نرغے سے نکالتا پھر رہا تھا۔ جب اس نے یونیورسٹی میں اپنے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کر کے اپنے روانڈائی ساتھیوں کی جان بچانے کی اجازت طلب کی تو وہاں سے انکار کر دیا گیا۔ اسے اقوامِ متحدہ کی طرف سے سپاہیوں کی بھی مدد حاصل نہ تھی کیونکہ وہ سب بےبس ہو کر بیرکوں میں جا چھپے تھے۔ دو مہینے پہلے جب اقوامِ متحدہ نے تمام عملے کو نقشے پر اپنے اپنے مکان کی نشاندہی کرنے کی ہدایت کی گئی تھی، تاکہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں انہیں وہاں سے نکالا جا سکے، تو میں نے یہ سوچ کر اسے نظر انداز کر دیا تھا کہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں میں یہاں ٹھہرنے کو ترجیح دوں گی۔

اب میں نے موستاش کو فون کیا۔

"آخر کار تمہارا فون آ ہی گیا،" وہ بولا۔ "جلدی بتاؤ تم کہاں ہو، میں ابھی پہنچتا ہوں۔"

وہ مجھے ایک ایسے مکان میں لے گیا جہاں مجھے، یوسف کی پیش گوئی کے عین مطابق، اپنے چاروں طرف یورپی باشندے دکھائی دیے۔ دوسرے دن بیلجیئم کے فوجی آ گئے اور میں ایک ہوٹل میں منتقل ہو گئی۔ چند روز بعد میں کیگالی سے نیروبی روانہ ہو گئی، اور پھر نیروبی سے بروندی، جہاں مجھے سرحد پار جا کر اس مقتل سے، جو روانڈا بن چکا تھا، جنوب کی طرف فرار ہونے والے اولین پناہ گزینوں سے ملنا تھا۔

۳

روانڈا کے صدر جووینال ہیبیاریمانا سے جو ۶ اپریل کو طیارے کے حادثے میں مارا گیا، ہم پہلے بہت سے توتسی نفرت کرتے ہی تھے، لیکن جو ہمسایہ خاندان اس کے اپنے ہوتو خاندان اور اس کی اپنی سیاسی پارٹی سے وابستہ تھے وہ اور زیادہ نفرت کرتے تھے۔

ہابیاریمانا نے معاہدہ اروشا پر عمل درآمد کو ٹالنے کی حتی المقدور پوری کوشش کی تھی۔ معاہدے کے مطابق صدارت کے عہدے سے بیشتر اختیارات لے لیے جانے تھے، اور اس کی پارٹی نیشنل ریپبلکن موومنٹ فار ڈویلپمنٹ اینڈ ڈیموکریسی (MRNDD) کو نہ صرف پورے ملک کی دوسری ہوتو پارٹیوں کے ساتھ مل کر حکومت چلانی پڑتی بلکہ توتسیوں کے غلبے والی پارٹی آر پی ایف کو بھی ساتھ رکھنا پڑتا۔ اس نے نمائندوں کے مذاکرات میں اس کی ناک نیچی کر دی تھی، اور باغیوں نے بڑی سختی سے اپنی باتیں منوائی تھیں۔ بیس برس کی بے روک ٹوک حکمرانی کے بعد اسے ایک ایسی پالیسی کا پابند کر دیا گیا تھا جس سے اس کا اقتدار متزلزل ہو جانے والا تھا۔ اس کی بیوی بھی اس پر خوش نہ تھی۔

روانڈا کی سیاست میں ہر ادارے کا ایک غیر سرکاری متبادل بھی ہوتا ہے۔ حکومت تو صدر کی تھی، لیکن اکازو یعنی گھر بھی موجود تھا۔ یہ لفظ انیسویں صدی سے کوئین بادشاہوں کے دربار کا نام تھا اور اب بھی حکمران سے قربت رکھنے والوں کی مختصر سی جماعت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس اکازو پر صدر کی بیوی ایگنس اور اس کے حامیوں کا تسلط تھا، جہاں پیسہ، دولت اور اقتدار تک ان کی رسائی تھی۔ اور ایک طرف صدر کی پارٹی معاہدہ اروشا کی پابند تھی، تو دوسری طرف کمیٹی فار ڈیفنس آف ڈیموکریسی (CDR)، جسے ہابیاریمانا کی خفیہ حمایت حاصل تھی، انتہاپسند ہوتو نظریات کا پرچار کرتی تھی اور باغیوں سے کسی بھی قسم کے سمجھوتے کی سخت مخالفت تھی۔

تمام پارٹیاں ہوتو ملک کے پردے میں ہی اپنی مسلح ملیشیا میں رکھتی تھیں [illegible] ایم آر این ڈی ڈی کی ملیشیا کو متحد حملہ آور کا نام دیا گیا تھا۔ سی ڈی آر کی ملیشیا [illegible] سے [illegible] سمجھا جاتا تھا۔ یہ ملیشیا میں سیاست دانوں کے حکم پر [illegible] اور [illegible] کی وارداتیں کرتی تھیں جب کہ پارٹی کے رہنما ان کی [illegible] تھے۔ [illegible] تک [illegible] سرکاری ریڈیو سٹیشن تک پر ان کا سایہ موجود تھا۔ ۱۹۹۳ میں [illegible] ایک [illegible] سے فون، مگر [illegible] کاغذی کارروائی کی حد تک، [illegible] کے ذریعے [illegible] ریڈیو ٹیلی ویژن [illegible] نام سے جانے جانے لگے۔ ایک ہوتو [illegible] مسلسل [illegible] رہے۔ اور ایک طرف [illegible] ملکیت کا ریڈیو [illegible] سرکاری [illegible] ساتھی تھا [illegible]

[illegible] دوسری طرف [illegible] شخصیات [illegible]
[illegible] کے کلاسیکی [illegible] موضوعوں سے
[illegible] ہیں۔ [illegible] شخصیات [illegible]
[illegible] کی جاتی ہیں [illegible] قتل کیا جاتا ہے۔

[illegible] اور [illegible] کے [illegible]
[illegible] ہیں [illegible]
[illegible] شخصیات [illegible] پرواری کی تقریب [illegible]
[illegible] لیکن دونوں [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] انہیں [illegible]
[illegible] تبدیلی [illegible] عمل
[illegible] کی باتیں [illegible]۔

[illegible] علاقے سے
[illegible] کرنے [illegible]
[illegible] میں [illegible]
[illegible] لیکن [illegible]
[illegible]۔

۵

[illegible] چھوٹے [illegible] نسل کشی کے عمل کا
[illegible] شخصیتوں [illegible]
[illegible] تفصیلی [illegible] قتل کیا جاتا ہے۔ یہ نسل کشی کے [illegible]

تلاش ہوتی ہے۔ یہ ہوا نظریات پر آسانی سے حملہ کر دیتے ہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے، نسل کشی کے لیے تین قسم کے اداروں کی ضرورت ہوتی ہے: قاتل، منصوبہ ساز اور نظریہ ساز۔ روانڈا کی غیر سرکاری افواج، سیاسی پارٹیوں اور ریڈیو کے نشریوں نے تینوں قسم کے فرائض انجام دے دیے۔ لیکن یہ تمام تیسرے درجے کے تھے: اس قسم کے اداروں کو تاریخ اور اساطیر کا سہارا بھی درکار ہوتا ہے۔

سام-حام مفروضے جیسے اساطیر سے تقویت پاتے ہیں، اور روانڈا میں اساطیر غیر معمولی طور پر طاقتور ہیں۔ ماضی کی کہانیوں میں تاریخ اور داستانیں ایک دوسرے میں مکمل مل جاتی ہیں۔ انہیں بار بار مختلف شکلوں میں ڈھال کر اور بار بار دہرا کر، حکمرانوں کی طاقت یا محکوموں کی بغاوت کو سہارا فراہم کیا جاتا ہے۔ ماضی کے سوالوں کی کھوج — ہم کون ہیں؟ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ — حال میں شامل رہتی ہے: کس ملک کی زمین پر کس کا حق ہے اور کون ملک بدر کر دیے جانے کے لائق ہے؟ ایک مشہور روانڈا کی روایت کچھ یوں بیان کی جاتی ہے:

> وقت کی ابتدا میں روانڈا کا پہلا بادشاہ کیگو آسمان سے اترا اور تین بیٹوں کا باپ بنا: گاٹوا، گاہوتو اور گاتوتسی۔ اس نے ان تینوں کو رات بھر دودھ سے بھری ایک ایک ہانڈی کی نگرانی کرنے کو کہا۔
>
> گاٹوا کو پیاس لگی اور اس نے دودھ پی لیا۔
>
> گاہوتو کو نیند آ گئی اور سوتے میں ٹھوکر لگنے سے ہانڈی الٹ گئی۔
>
> گاتوتسی نے بڑی ہوشیاری سے دودھ کی نگرانی کی اور جب صبح کے وقت بادشاہ کیگو واپس آیا تو اس وقت بھی وہ دودھ کی نگرانی کر رہا تھا۔
>
> کیگو نے اس آزمائش کے نتیجے میں تینوں کے سماجی مقام کا تعین کیا۔ گاتوتسی اس کا جانشین، مویشیوں کا مالک اور جسمانی مشقت سے مبرا ہوگا۔ گاہوتو اور اس کے بچوں کو مویشی رکھنے کی صرف اس صورت میں اجازت ہوگی کہ وہ گاتوتسی کے لیے کام کریں۔ گاٹوا کے لیے مویشی

رکھنا ممنوع ہوگا اور وہ باقی لوگوں سے الگ تھلگ رہے گا۔

توتسیوں کی فوقیت کا تصور روانڈا کے تمام باشندوں کے لاشعور میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس تصور کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے طرزِ عمل کو جھٹلانے کے لیے بڑی وقت کے خلاف شعوری مزاحمت کرنی پڑتی ہے۔ [illegible] نہیں بلکہ [illegible] کے طور پر سے کام [illegible] ہے۔ ہر شخص اپنی پسند کے سیاسی پروپیگنڈے کو تقویت دینے، یا قتل و غارت کا جواز [illegible] کرنے کے لیے تاریخ کی اپنے طور پر تعبیر کرتا ہے۔

دریائے نیل کا منبع تلاش کرنے والے یورپی کھوجی جب انیسویں صدی کے نصف آخر میں روانڈا سے آشنا ہوئے، [illegible] اس خطے میں [illegible] لوگوں کے تین قسم کے گروہ دکھائی دیے [illegible] ان میں سے ہر ایک [illegible] ریاست کی تجسیم بادشاہ [illegible] موامی (mwami) کی صورت میں ہوتی تھی جس کے پاس ایک مقدس ڈھول [illegible] تھا۔ [illegible] مویشیوں کو [illegible] اور زمینیں کاشت کا حق عطا [illegible]۔ [illegible] کوئی ہوتو باشندہ کسی مویشیوں کا مالک [illegible] شادی [illegible] تک پہنچ سکتا تھا [illegible] لیکن [illegible] توتسی بادشاہوں کی [illegible] ان سرحدوں کو [illegible] سوالات اٹھائے جا سکتے تھے: [illegible] عام ہیں [illegible] رشتہ داروں سے [illegible] زیادہ [illegible] کا [illegible] نسلی [illegible] کا [illegible] جسمی، جبلی، [illegible]

— phrenology — craniology — anthropometry سے [illegible] تھا، جہاں [illegible] [illegible] یورپی [illegible] جان ہیننگ سپیک (John Henning Speke) نے ۱۸۶۳ میں دریائے نیل کا منبع دریافت کیا، [illegible] توتسی [illegible] باشندوں کے خلاف ہیں، [illegible]

ایک علیحدہ نسل ہیں جس نے کمتر بانتو نسل کے ہوتو باشندوں کو مغلوب بنایا تھا۔ روانڈا پر ۱۸۹۰ سے ۱۹۱۶ تک جرمنی کے اور اس کے بعد بیلجیم کے نوآبادیاتی تسلط نے مزید نظریوں کو جنم دیا: یہ کہ توتسی مسیحیت کا گمشدہ قبیلہ ہیں، یہ وہ اٹلانٹس کی تباہی سے زندہ بچ جانے والے گروہ ہیں، کہ وہ قدیم مصریوں کی نسل سے ہیں، کہ وہ ایشیائے کوچک سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔ تاہم رفتہ رفتہ اس بات پر اتفاق رائے ہو گیا جو سپیک کے اولین نظریے سے قریب تھی: کہ توتسی باشندے دراصل نائلو ہیمائٹس (Nilo Hamites) ہیں۔ اس اصطلاح میں نائلو کا لفظ دریائے نیل کی اور ہیمائٹ نوح کے بیٹے حام کی نمائندگی کرتا ہے — اور یہ گروہ ایتھوپیا سے سولھویں صدی میں اتر کر جنوب کے علاقے میں پہنچے تھے۔

ایک اولین جرمن کھوجی، ڈیوک آف میکلن برگ، نے سیاحت نامہ میں لکھا تھا: "ان کی بلند پیشانی، نتھنوں کے نازک خم اور چہرے کی نفیس بیضوی ساخت سے ان کے غیر ملکی ہونے کا ناقابل تردید ثبوت ملتا ہے۔ اس کے برعکس ہوتو میانہ قد ہیں جن کے بھدے نقوش مشقت کی زندگی کے عکاس ہیں اور وہ بعد میں آنے والے، حکمران گروہ، یعنی توتسیوں، کے فرماں بردار غلام ہیں۔"

بیلجیئن ماہرین نسلیات نے جسمانی پیمائش کے ایک باقاعدہ پروگرام کی حمایت کی۔ ایک مطالعے میں بتایا گیا تھا کہ ایک اوسط توتسی ناک ۵۵.۸ ملی میٹر لمبی اور ۳۸.۷ ملی میٹر چوڑی ہوتی ہے، جبکہ ایک اوسط ہوتو ناک کی لمبائی ۵۲.۳ ملی میٹر اور چوڑائی ۴۳.۶ ملی میٹر ہوتی ہے۔ قد، وزن، ناک کی پیمائش اور چہرے کی لمبائی اور دوسری پیمائشوں کا پورا حساب لگایا جاتا اور اس کے نتائج مرتب کر کے برآمد کیے جاتے۔ بیسویں صدی کے آخری برسوں کے تناظر میں جسمانی پیمائشوں سے اس شدید شغف کو ہنسی سے مضحکہ خیز سمجھا جا سکتا ہے، لیکن صدر کے طیارے کی تباہی کے کوئی مہینہ بعد روانڈا میں ہوتو باشندوں نے بچوں کے قدموں کی پیمائش کرنے اور ان کی ٹانگیں جو حد سے زیادہ لمبی تھیں کاٹ ڈالی تھیں۔ لمبی ٹانگیں توتسیوں کی نشانی سمجھی جاتی تھیں۔ ہوتو توتسیوں کی ٹانگیں بھی گھٹنوں کے پاس سے کاٹ ڈالتے تھے، تاکہ ان کا قد ہمارے جتنا ہو جائے۔

بیلجیم حاکموں نے نسلی یا لسانی شناخت کا ایک سادہ، قلمی پیمانہ بنایا، جہاں پر ۱۹۳۰ کے عشرے میں ان کی درجہ بندی کو زیادہ باضابطہ بنانے کے لیے شناختی کارڈ جاری کیے گئے۔ اس کے بعد دس مویشیوں سے زائد کے مالک ہر شخص کو توتسی قرار دیا گیا، اور اس سے کم مویشیوں کے مالک ہوتو ٹھہرے۔ ۱۹۵۰ کے عشرے تک چند ایک ہوتو باشندے مشنری سکولوں میں تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ ہوتو اشرافیہ سرکاری نوکریوں کا، اقتدار میں شراکت کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔ افریقہ کے دوسرے حصوں میں نوآبادیاتی تسلط کے خلاف چلنے والی تحریکوں میں لوگوں کے شعور اور قبیلے کی شناخت ... شناختی کارڈوں کا ملاڈ تھیں۔ تاہم روانڈا میں ہوتو سیاسی رہنما شناختی کارڈوں سے منسلک وقائع لکھا جاتے تھے تاکہ توتسیوں کو پہچان سکے اور ان کے سیاسی، معاشی اور سماجی حقوق کا خاتمہ ہو جائے۔

توتسی بادشاہوں کی سرپرستی سے بادشاہی ختم ہو چلا ہے۔ عدم استحکام یورپ میں معاشرتی مسیحیت حاصل کر لی تھی، اور دوسرے مسعود مشنری پادریوں نے ہوتو بادشاہت ... سرداری کے ... حمایت کی ... علاوہ ازیں، ہوتوؤں کی آزادی کی مسلسل ... نوآبادیاتی تسلط کی حمایت سے ... شروع کر دیا ... بیلجیموں نے ... ہمدردی رکھیں، روانڈا میں یا سوویت یونین سے ... روانڈا کو ایک ہی مقصد ... میں جاگیرداری اور ... توتسیوں کی بالادستی کی روشنی ... توتسیوں کے خلاف ہوتوؤں کا ساتھ دینے کی پالیسی ... ۱۹۵۹ میں تشدد کا آغاز ہو گیا، اور بیلجیموں کے ... توتسی ... ہوتو ... قتل کرے، جس سے ... ایک ... کی قیادت میں، ... (muyaga) ... ۱۹۶۳ تک ان طوفانی ہواؤں کے ایک لاکھ ۳۵ ہزار توتسیوں کو روانڈا سے ... توتسی ... ایک انتہا پسند ہوتو نظریہ

مثلاً، لیون موگے سیرا (Leon Mugesera) نے ۱۹۹۲ میں ہوتو لوگوں کے ایک مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ۱۹۵۹ میں ہم سے یہ مہلک غلطی ہوئی تھی کہ ہم نے انھیں نکل جانے دیا تھا۔ ۱۹۹۴ کے آتے آتے ہوتو لیڈر اجتماعی قتل کا پرچار کرنے لگے تھے۔ اس بار ہم ان سب کو مار دیں گے۔ جن لوگوں نے بچوں کو قتل کیا وہ روانڈا کی یہ قدیم کہاوت دہراتے تھے:

چوہوں کا خاتمہ کرنے کے لیے ان کے بچوں کو بھی ٹھکانے لگانا لازمی ہے۔

دریں اثنا، آزادی کے بعد، ایک نیا روانڈا قائم ہوا جس میں پرانے معاشرتی حسب مراتب کو الٹ کر گویا سر کے بل کھڑا کر دیا گیا۔ ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں داخلوں کے لیے کوٹے مقرر کیے گئے: کسی شخص کا ملازمت یا داخلہ حاصل کرنا یا کسی سرکاری عہدے تک پہنچنا اس پر منحصر تھا کہ اس کی نسل کیا ہے ــــ بس فرق یہ تھا کہ اب ہوتو شناخت کو فوقیت حاصل تھی۔ کالنگا یا ڈھول، جو قدیم شاہی دور سے روانڈا کی علامت چلا آ رہا تھا، اب توتسی بالادستی کا نشان قرار دے کر رد کر دیا گیا۔ آزادی کے بعد روانڈا کے پاس علامت نہیں بلکہ ایک نعرہ تھا: ہوتو قوت کا نعرہ، جو فرماں برداری اور نظم و ضبط کے کلچر میں پوری طرح پیوستہ تھا۔ روانڈا کے ہر شہری کو اپنی پیدائش کے دن سے ملک کی واحد سیاسی تنظیم، یعنی صدر ہابیاریمانا کی ریپبلکن موومنٹ فار نیشنل ڈویلپمنٹ، کا رکن تصور کیا جاتا تھا۔ چند گھروں کے ایک گروپ کو سیلول کہا جاتا تھا؛ ہر سیلول کا ایک ترجمان ہوتا جو اپنے سے ایک سیڑھی اوپر، یعنی سیکٹر کے سربراہ کونسلر، کا ماتحت ہوتا۔ کونسلر سے اوپر بورگ میسٹر، یعنی کمیون کے سربراہ، کا درجہ تھا، اور وہ صوبے یا پریفیکچر کے سربراہ کا ماتحت تھا، اور یوں یہ سلسلہ ایک ایک سیڑھی کر کے حکومت کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچتا۔ اگر روانڈا کا کوئی شہری اپنی سکونت کی پہاڑی سے کہیں اور منتقل ہونا چاہتا تو اسے حکام سے اجازت لینی پڑتی۔ دوسرے افریقی دارالحکومتوں کے برخلاف کیگالی کم آبادی والا شہر رہا اور دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی کے سیلاب سے محفوظ رہا؛ اس بارے میں روانڈا کے قوانین جنوبی افریقی قوانین سے بھی زیادہ سخت تھے۔

باہر سے آنے والے لوگ جو کچھ دیکھتے، یا جو کچھ دیکھنا پسند کرتے، وہ محض اس نظام کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ظاہری نظم و ضبط، ترقی اور قدامت پرست مسیحیت تھی جو انھیں زائیر یا سوڈان جیسے ملکوں سے، جہاں سیاسی تعطل اور انتشار کے باعث ترقی کی بابت مغربی

تصورات کے معنی ہو کر رہ گئے تھے، جو شعوری طور پر مختلف محسوس ہوتی۔ جو کچھ باہر سے آنے
والوں کو سیاسی نہ دیتا، یا جسے وہ سیاسی نہ کر دیتے، وہ ایسی تشخص کا تصور تھا جو مقتدر نظریے کو اپنے میں
ڈھالتا رہتا تھا؛ جس کی بنیاد اس خوف پر تھی کہ کہیں یہ نہ ہو، توتسی حسب مراتب کے سابق نظام کی
شکل میں، واپس نہ لوٹ آئے۔ آخر روانڈا کے جنوب کی طرف، برونڈی میں، جہاں توتسی فوج
ہوتوؤں کو قتل کر رہی تھی، یہی سے ثرت کچھ دور نہیں ہو سکے تھے۔

جہاں تک ہوتوؤں کو تاریخ کا وہی سبق پڑھایا گیا جو ہوتو تنظیموں کی تعبیر سے مطابقت رکھتا
تھا۔ ڈیوڈ نیومین نے، جو روانڈا کی نیشنل یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر اور ریڈیو مل کولنز کا
بانی ہے، توتسیوں سے وابستہ مشہور کی روایات کا ابطال کرنے کی کوشش میں وضاحت کی کہ
یورپی محققوں نے توتسی سلطنتوں میں محکوم ہوتوؤں کا تو مطالعہ کیا لیکن ان ہوتو ریاستوں
(principalities) کی طرف توجہ نہ دی جو ۱۹۲۰ کے عشرے تک توتسی جارحیت کی
مزاحمت کرتی رہی تھیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ توتسیوں کی حاکمیت کوئی ناگزیر شے نہیں
ہے، بس شرط یہ ہے کہ توتسیوں کو قابو میں رکھا جا سکے۔ توتسیوں کو نہ صرف شہریت سے محروم
رکھا جانا تھا بلکہ انہیں زندگی سے محروم کیا جانا بھی ضروری تھا، کیونکہ وہ بیگانہ روانڈا، یعنی
روانڈا سے نفرت کرنے والے لوگ تھے۔

لیون موگیسیرا نے، جو شمال مغربی روانڈا کے گسینی صوبے میں اس کی پارٹی کا نائب صدر
تھا، تاریخ کی تعبیر ایک اور حد تک آگے کی جب اس نے اس یورپی خیال سے اتفاق کیا کہ توتسی روانڈا
میں حبشہ سے آنے والوں میں سے ہیں اور کوئی چار صدی پہلے ایتھوپیا سے وہاں پہنچے تھے۔
۱۹۹۲ میں جب کہ ہوتو طاقت کا رجحان ترقی پا چکا تھا، اپنی ایک تقریر میں موگیسیرا نے کہا
کہ توتسیوں کو دریائے نیاباروگو کے ذریعے جس سے وہ آئے تھے ان کے اصل وطن واپس بھیج دیا جانا چاہیے
دو سال بعد قتل عام کے دوران توتسیوں کی لاشیں دریائے نیاباروگو سے ہو کر دریائے کاگیرا میں داخل ہو
رہی تھیں، جہاں جھیل وکٹوریا کی طرف بہتے ہوئے پل کے نیچے سے بہتی ہوئی ان کی لاشوں کی رفتار سے
گنتی ہو سکتی تھی کہ ہر منٹ میں کتنی لاشیں بہہ رہی تھیں اور ان کے ہجوم کے عالم میں گننا مشکل تھا،
جہاں بے شمار لاشیں جھیل وکٹوریا کے کنارے تک پہنچ کر وہیں دھوپ میں سڑنے لگیں۔

۶

کیگالی سے رخصت ہونے کے دو ماہ بعد میں روانڈا کے ایک جنوبی شہر بُوتارے (Butare) واپس آئی جو کبھی اپنی رواداری اور آزادخیالی کے ماحول کے لیے مشہور تھا۔ سڑکوں پر کھڑی کی گئی رکاوٹیں ہوتو مسلح حملہ آور دستوں کے کنٹرول میں تھیں (گو یہ کنٹرول زیادہ عرصے تک برقرار رہنے والا نہیں تھا: آر پی ایف، صدر کی ہلاکت کے بعد خود بخود قائم ہو جانے والی عبوری حکومت کو معزول کرنے کے بعد، جنوب کی طرف پیش قدمی کرتی آ رہی تھی)، اور وہاں ہزاروں توتسی قتل کیے جا چکے تھے۔ قتل ہونے والوں میں یونیورسٹی کے ہوتو طالب علم اور استاد بھی شامل تھے جنھیں آر پی ایف کا ہمدرد خیال کیا جاتا تھا۔

میں بُوتارے سے چند میل مغرب کی طرف پہاڑیوں میں واقع قصبے گیکونگورو (Gikongoro) گئی۔ انسانی ہمدردی کے مشن پر آئے ہوئے فرانسیسی فوجیوں نے اس علاقے کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور وہاں ہوتو پناہ گزین جمع ہوتے جا رہے تھے۔ دو نوجوان، ایک استاد اور ایک ریڈ کراس کا رضاکار، ان میں شامل تھے۔ انھوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ پچھلے دس ہلاکت خیز ہفتوں کے دوران بُوتارے میں کیا ہوتا رہا۔

"توتسیوں نے ایک فہرست بنائی تھی،" استاد نے کہا۔ "وہ تمام ہوتوؤں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ان کے گھروں سے ان منصوبوں کے دستاویزی ثبوت برآمد ہوئے ہیں۔ جب لوگوں کو یہ کاغذات ملے تو وہ اشتعال میں آ گئے۔ لہٰذا انھوں نے توتسیوں کو قتل کر دیا۔"

میں نے یونیورسٹی کے ان ہوتو طالب علموں اور استادوں کے بارے میں دریافت کیا جو دوسرے ہوتوؤں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔

"وہ بھی سازش میں شریک تھے۔"

"تو پھر اس تمام قتل و غارت کا ذمے دار کون ہے؟"

"ذمے دار قتل ہونے والے ہیں۔"

میں نے اپنے سوالوں پر اصرار کیا: "اور وہ بچے جو مار ڈالے گئے، کیا وہ بھی اپنی موت کے خود ذمے دار تھے؟"

یہ حکومت کی جانب سے [illegible] کا معاملہ تھا، ریڈیو [illegible] کے رضاکار نے کہا۔ بہت سے توتسیوں نے اپنے بچوں کو آر پی ایف میں شامل کرنے کے لیے بھیج دیا تھا، لہٰذا لوگوں سے کہا گیا کہ اپنے کسی شخص کے بچوں کو [illegible]، وہ نہیں دیکھنا چاہتے کہ وہ کسی بری حرکات میں ملوث ہو۔

یہ دونوں تعلیم یافتہ تھے اور وہ فرانسیسی زبان روانی سے بول سکتے تھے۔ اور ان کے لہجے میں کسی قسم کا کوئی [illegible] نہیں تھا، مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنی سچائی والی کہانی پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ میں نے ان سے صرف اس وقت [illegible] آخر میں ان سے سوال کیا کہ آیا خود انہوں نے بھی قتل عام میں حصہ لیا تھا۔

"نہیں، میں ذاتی طور پر شامل نہیں تھا،" [illegible] نے کہا، اور دوسرے نے بھی تائید میں سر ہلایا۔ "مگر جو اس میں شامل ہوئے وہ ان لوگوں نے مداخلت کو سمجھتے ہیں۔ یہ [illegible] ہے۔ لوگوں کا مارا جانا بہرحال افسوس کی بات ہے۔"

"کیا آپ کو توتسیوں کے مارے جانے کا افسوس ہے؟" میں نے پوچھا۔

[illegible] نے ایک کہاوت دہرائی: "اگر تمہارے ساتھ ایک ہی بچہ ہو، اور تمہارے [illegible] میں کوئی [illegible] جو تمہارے بیٹے کو مار دے تو تم خوش ہو گے یا نہیں؟ ہم بھی خوش ہیں۔"

۷

اگست میں جب میں روانڈا کے مغربی حصے میں واقع شہر کیبوئے (Kibuye) گیا، تب تک ایک گرجا گھر میں قتل کیے جانے والے [illegible] توتسیوں کو دفن ہوئے بہت دن گزر چکے تھے۔ وہ گرجا گھر جھیل کیوو (Kivu) کے کنارے پانی سے کچھ اوپر بلند زمین پر کھڑے درختوں میں گھرا ہوا ہے۔ توتسیوں نے وہاں پناہ لے رکھی تھی جب کیبوئے کی [illegible] کے [illegible] میں [illegible] ایک [illegible] سے پہلے کھڑکیوں اور دروازوں میں سے دستی بم پھینکے اور پھر اندر گھس کر لاٹھیوں اور چاقوؤں سے [illegible] بچ جانے والوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ یہ عمل تقریباً تین گھنٹے جاری رہا۔ چند

رو. بعد اسی طرح کے منظم گروہ نے مقامی اسپورٹس اسٹیڈیم میں بھی کچھ کیا جہاں صدر کی پارٹی کے صوبائی لیڈر، کلیمنٹ کائی شیما، نے توتسیوں کو اکٹھا ہونے کی ہدایت کی تھی۔ وہاں گیارہ ہزار لوگ جمع تھے۔ ہجوم پہلے دن ان سب کو ہلاک نہ کر سکا، بعد ازاں اگلی صبح ایسا کام مکمل کرنے دوبارہ آیا۔ ایک زمانہ تھا کہ صوبہ کیبوئے میں توتسیوں کی آبادی ساٹھ ہزار تھی اور مقامی آبادی میں ان کا تناسب غیر معمولی طور پر زیادہ، یعنی تقریباً بیس فیصد، تھا۔ اب، فرانسیسی فوجیوں کے لگائے ہوئے تخمینے کے مطابق، ہر دس میں سے نو توتسی ہلاک کیے جا چکے ہیں، اور ہوتو مردوں کی نصف، اور ہوتو عورتوں کی نصف سے کچھ کم، تعداد نے اس قتل عام میں حصہ لیا۔

ایک لوتھرن پادری رینارڈ بیدو تھے، خود ان کے اپنے الفاظ میں، اس قتل عام میں غیر عملی طور پر شریک تھا۔ جب میں کیبوئے میں اس سے ملا تب اس نے ایک مقامی پرائمری اسکول کو یتیم اور بے سہارا ہو جانے والے بچوں کے گھر میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ ایک ڈھلا اور بے چین شخص تھا! اس نے بتایا کہ اسے اس مرکز میں رہنے والے بچوں کے لیے کافی غذا دستیاب نہیں ہو رہی ہے۔ علاوہ ازیں اس کا ضمیر بھی اسے پریشان کر رہا ہے۔ قتل کے دنوں میں مسلح حملہ آور، اپنے چہروں اور اعضائے تناسل کو کیلے کے پتوں سے ڈھانپے سیٹیاں بجاتے اور ڈھول پیٹتے، ہر صبح سویرے کیبوئے سے گزرتے تھے۔ وہ ایک ایک گھر پر جاتے اور کہتے: آؤ، حملے میں ہمارا ساتھ دو۔ توتسی لوگوں کو قتل کرنے چل رہے ہیں۔ ہمیں آر پی ایف کے تمام ساتھیوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔ بیدو نے اپنے گھر میں تین توتسی بچے چھپا دیے، جو اس کے اپنے بچوں کے ساتھ اسکول میں پڑھتے تھے اور جنہیں اس نے چھپا رکھا تھا۔ وہ دونوں بچیوں کو ساتھ لے گئے اور سات سالہ لڑکے کو وہیں ڈنڈے مار مار کر ہلاک کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے آر پی ایف والوں کے بچوں کو پناہ دی تھی اس لیے میں بھی آر پی ایف کا ہمدرد ہوں۔ بعد میں انہوں نے مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے پر مجبور کیا۔ وہ سب لوگوں کو قتل میں اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتے تھے۔ اس نے بتایا۔ جو لوگ مزاحمت کرتے ان کے ساتھ زبردستی کی جاتی۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ آپ آر پی ایف کے حامی نہیں ہیں، آپ کو لاٹھی یا ڈنڈا لے کر چلنا پڑتا۔ ہم حملہ آوروں کے پیچھے پیچھے چلتے اور لاشوں کو دفناتے رہے۔

کیا آپ نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی؟ میں نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

میں نے اسی ناٹک پر بتی، مدد گار بھی ہونے کا بہانہ کیا۔ پادری ہونے کی وجہ سے معافی نہیں مل سکتی تھی کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ آر پی ایف میں بھی پادری موجود ہیں۔ وہ کہتے تھے: مذہب وذہب بعد میں دیکھا جائے گا۔"

میں نے دریافت کیا کہ یہ کیونکر ممکن تھا کہ اتنے سارے لوگوں نے قتل میں حصہ لیا اور خود اس جیسے لوگ بھی انکار نہ کر سکے۔

سیدوتیے نے اپنے ذخیرہ الفاظ میں سے ایسے لفظ ڈھونڈ کر نکالنے کی کوشش کی جو کسی غیر ملکی کی سمجھ میں آسکیں۔

ایسا بھی وقت آتا ہے جب آدمی کا ایمان رخصت ہو جاتا ہے، وہ اپنے قابو میں نہیں رہتا اور شیطان کے اثر میں آجاتا ہے۔

کچھ لوگوں نے وقتی مزاحمت کی تھی۔ اس سال کے آخر میں جب میں کیگالی واپس گئی تو میری ملاقات ایک عمر رسیدہ ہوتو سے ہوئی جس نے سترہ توتسیوں کو پناہ دے کر ان کی جان کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے محلے کا ہیرو تھا۔ وہ اس طرح کی تنہا مثال نہیں تھا، لیکن بچ نکلنے کی ایسی مثالیں بہت کم تھیں۔ لوگوں نے سودے بازی بھی کی ___ اگر وہ دوسری پہاڑی پر رہنے والے توتسیوں کو قتل کرنے میں حصہ لیں تو ان کے توتسی رشتہ داروں کی جان بخشی کر دی جائے گی۔ توتسی مردوں کی ہوتو بیویوں کو مجبور کیا گیا کہ خود اپنے بچوں کو قتل کر دیں، چند ایسی بعض عورتوں نے اپنے پڑوسیوں کے بچوں کو قتل کرنے کے عوض اپنے بچوں کی جان بچالی۔

اس نسل کشی کے دوران مدرسی کے پیشے سے منسلک ایک شخص کے کاغذوں کا ایک دستہ میرے ہاتھ لگا جس پر وزارت دفاع کا نشان بنا ہوا تھا اور نمایاں انداز سے "خفیہ" کی مہر لگائی گئی تھی۔ اس کا عنوان تھا: دشمن کی تعریف اور اس کی شناخت کا طریقہ۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ دستاویز ۱۹۹۲ کے بعد سے روانڈا میں وسیع پیمانے پر گردش کرتی رہی ہے۔ بنیادی دشمن کے ذیل میں کہا گیا تھا: ملک میں اور ملک سے باہر مقیم ایسے توتسی جنہیں اپنے گزشتہ دور حکومت کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ دیگر دشمنوں میں توتسی پناہ گزیں، موجودہ حکومت سے غیر مطمئن ہوتو باشندے، علاقے کے نامعلوم مہاجرین [illegible] اور توتسی عورتوں کے غیر ملکی شوہر شامل تھے۔

آر پی ایف کے جلسے میں جاتے ہوئے، رستے میں مجھے توتسی عورتوں سے جو کچھ پتا چلا اس کے باوجود حقیقت یہ تھی کہ ۱۹۷۰ کے عشرے میں ہابیاریمانا کے دورِ حکومت میں ہوتو اور توتسی باشندوں کے مابین شادیوں، بالخصوص توتسی عورتوں اور ہوتو مردوں کی شادیوں، کی تعداد میں اضافہ ہوا تھا۔ غیر ملکی مرد بھی توتسی عورتوں کو ترجیح دیتے، خصوصاً وہ جو حسن کی مالک، لمبی ٹانگوں والی، پتلی دبلی جوان عورتوں کو۔ غیر ملکی امدادی ادارے بھی توتسیوں کو ملازمت میں فوقیت دیتے کیونکہ ان میں سے بیشتر کامیاب خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور بیرون ملک تعلیم پا چکے تھے۔ ہوتو رسالے کنگورا (Kangura) نے ہوتوؤں کے دس احکام شائع کیے تھے، جن کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی:

> ۱۔ ہر ہوتو کو جاننا چاہیے کہ توتسی عورت، جہاں کہیں بھی ہو، اپنے توتسی گروہ کے مفاد کے لیے کام کرتی ہے۔ لہٰذا ہر اس ہوتو مرد کو، جو کسی توتسی عورت سے شادی یا دوستی کرے گا، یا اسے سیکرٹری یا داشتہ کے طور پر ملازم رکھے گا، غدار تصور کیا جائے گا۔
>
> ۲۔ ہر ہوتو کو جاننا چاہیے کہ ہماری ہوتو بیٹیاں عورت، بیوی اور ماں کے کرداروں کے لیے زیادہ موزوں اور خاندان میں اپنے مقام کا بہتر احساس رکھنے والی ہیں۔ کیا وہ زیادہ حسین، زیادہ اچھی کارکن اور زیادہ دیانت دار نہیں ہیں؟

چوتھے حکم میں ہر ایسے ہوتو کو غدار قرار دیا گیا تھا جو کسی بھی توتسی کے ساتھ کاروبار کرے۔ دسواں حکم یہ تھا:

> ہوتو نظریے کی تعلیم ہر ہوتو کو ہر سطح پر دی جانی چاہیے۔ ہر ہوتو کو چاہیے کہ اس نظریے کو زیادہ سے زیادہ پھیلائے۔ کوئی ہوتو جو اپنے ہوتو بھائی کو اس نظریے کی تعلیم حاصل کرنے، اسے پھیلانے اور اس کی تعلیم دینے کی

بنا پر ملامت کرے گا وہ غدار تصور کیا جائے گا۔

روانڈا کی ریاست اپنے کام میں اتنی مستعد اور موثر تھی کہ یہ پیغام ملک کے کونے کونے تک پہنچ گیا۔ اسی مستعدی کا ۔۔۔ اور اس نظم و ضبط کا، غیر ملکی امدادی کارکن جس کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے ۔۔۔ یہ نتیجہ تھا کہ ۷ اپریل کو جب قتل عام کا آغاز کرنے کا حکم جاری ہوا، تو اس کی عموماً مستعد پابندی کی گئی۔ بہت سے عینی شاہدوں نے بتایا کہ کمیونوں کے سربراہوں، بورگ ماسٹروں، نے کس طرح فوج یا پولیس کے مقامی عہدے داروں کے ساتھ مل کر لوگوں کو قتل عام کی ہدایات دیں۔ خوف ۔۔۔ دشمن کے حملے کا خوف، اپنے پڑوسیوں کے ممکنہ طرزِ عمل کا خوف، حکم نہ ماننے کی صورت میں سر سے موت کا خوف ۔۔۔ قاتلوں کو اپنے راستے پر آگے ہی آگے لے جاتا رہا۔ اگر معاشرے کو قابو میں رکھنے والے اصولوں کی ہر شخص خلاف ورزی کرنے لگے تو یہ اصول غیر موثر ہو جاتے ہیں؛ گروہی تحفظ مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے، احساسِ جرم اجتماعی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

۸

اپریل سے جون تک باقی دنیا نے کوئی قدم نہ اٹھایا۔ اقوامِ متحدہ کی تعداد اس کی فوج واپس لوٹ گئی۔ سفارتی اقدامات گومگو کا شکار اور سخت نقصان دہ ثابت ہوئے۔ اقوامِ متحدہ نے اس وقت جنگ بندی پر زور دیا جب آر پی ایف کی فتح ہی نسل کشی کے عمل کو روکنے کی واحد امید تھی۔ انجام کار جون کے آخر میں مغرب نے اپنے ایلچی بھیجے: امدادی کارکن، جو انفرادی انسانیت اور اقدام اور حق کی طاقت پر یقین رکھتے تھے؛ اور فوجی سپاہی۔

جس وقت فرانسیسی سپاہی پہنچے، تب تک بے روک ٹوک جاری قتل عام کو دس ہفتے سے زیادہ ہو چکے تھے۔ چند ہزار باقی ماندہ اور دہشت زدہ توتسی دو چھتیوں اور گیلے کے ہاتھوں میں ایسی پناہ گاہوں سے نکل کر ان کیمپوں میں جمع ہوئے جن پر فرانسیسی سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ارد گرد کی

پہاڑیوں پر اب تک متحد حملہ آوروں کا راج تھا۔

فرانسیسی مداخلت کے محرکات خاصے پیچیدہ تھے۔ فرانسیسی ایک وسیع تر سٹیج پر مصروفِ عمل تھے، وہ اقوامِ متحدہ کی نا ہی اور فرانس کی، ایک عالمی طاقت کے طور پر، خودمختاری پر زور دے رہے تھے۔ لیکن فرانس کی روانڈا سے ایک وابستگی بھی تھی۔ کئی برسوں سے پیرس کے ایلیزے پیلیس میں صدر متراں کے افریقی یونٹ کا سربراہ اس کا بیٹا، ژاں کرسٹوف، تھا جس نے صدر ہابیاریمانا سے ذاتی دوستی پیدا کر لی تھی۔ جب ہابیاریمانا کا طیارہ ـــ جو فرانس کی طرف سے دیا گیا تحفہ تھا ـــ تباہ ہوا تو اس کی بیوہ اور گھر والوں کو سیدھے پیرس لے جایا گیا۔ فرانسیسی روانڈا کی حکومت کو افریقہ میں فرانسیسی لسانی اقدار (francophonie) کا محافظ اور بڑھتے ہوئے اینگلو سیکسن اثرات کی رو میں ایک دیوار سمجھتے تھے۔ اس طرح برِاعظم یورپ کی قدیم قبائلی رقابت برِاعظم افریقہ کے قلب میں کلچر اور زبان کے ایک تنازعے کی صورت میں جلوہ گر ہو رہی تھی: آر پی ایف کے لوگ، جن کی تعلیم و تربیت یوگنڈا میں ہوئی تھی، انگریزی بولتے تھے جب کہ ہوتو حکومت کی زبان فرانسیسی تھی۔ فرانسیسی ہوتوؤں سے ہمدردی رکھتے تھے: ان کی طرح فرانسیسیوں نے بھی ایک بادشاہت کا تختہ الٹ کر انقلاب برپا کیا تھا۔

تاہم زمین پر متعین فرانسیسی فوجیوں کو ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کی طرف ہیں۔ صدر متراں نے انہیں ایک انسانیت نواز مشن پر وہاں بھیجا تھا، اور وہ توتسیوں کی جانیں بچا رہے تھے جن پر ہوتو قاتلوں کے گروہ حملہ آور تھے۔ لیکن ہوتوؤں کا خیال تھا کہ وہ انہیں آر پی ایف کی پیش قدمی سے بچانے کی غرض سے آئے ہیں۔ سڑکوں کی جن رکاوٹوں پر توتسیوں کو قتل کیا گیا تھا ان پر فرانسیسی ترنگے لہرائے گئے اور زندہ باد فرانس (VIVE LA FRANCE) کے بینر آویزاں کیے گئے؛ ہوتو ملیشیا کے سپاہی پک اپ ٹرکوں میں سوار جھنڈے لہراتے اور خیر مقدمی گیت گاتے پھر رہے۔ فرانسیسی فوج افریقہ سے اور یہاں کی جنگوں سے واقف تھی؛ اس نے فرانسیسی نوآبادیاتی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا تھا، اور وسطی افریقی ریپبلک اور جبوتی میں اب بھی فرانسیسی فوجی اپنے باقاعدہ دوروں پر آیا کرتے تھے۔ لیکن وہ اس صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھے جس کا انہیں روانڈا میں سامنا کرنا پڑا۔ ایک روز میں میرین یونٹ کے کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل ایرک دستابال راف سے اس کے تجربات کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ وہ اپنے

پورے ریجن میں موجود رہا تھا۔ اس کا خاندان سیاہ نسل سے گہرا تعلق رکھتا تھا، اور وہ بوسنیا اور بیروت میں بھی مدافعت جاری دیکھ چکا تھا، لیکن روانڈا میں ہونے والی قتل و غارت گری نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ یہ دنیا کی تاریخ کا بدترین قتل عام تھا، اس لیے کہ، تعداد کے اعتبار سے نہیں، بلکہ جس شدت و تیزی سے اسے انجام دیا گیا اس کے لحاظ سے۔

اس نے ننھے بچوں میں، جسم کی طرح بڑے دلوں کی کئی مردوں کی لاشیں دیکھی تھیں، جیسے کر رکھ دیئے گئے تھے، ان کی دیواروں پر بہے خون کے دھبے عرصے تک ان کی صفائی سے مٹ نہیں سکے تھے۔ بچ جانے والوں کی سنائی جانے والی کہانیاں وحشیانہ واقعات سے کہیں زیادہ ہولناک تھیں: لوگوں کو آریوں سے چیر دیا گیا، بچوں کو ڈنڈوں سے پیٹا گیا، چھوٹے پستولوں سے گولی ماری گئی، [illegible] اور دستی بم مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ اس کا اندازہ تھا کہ پانچ لاکھ [illegible] سے زیادہ [illegible] ہیں، [illegible] کے حساب سے

ایک اور دستی افسر، کرنل بیسر [illegible] میں کمانڈر تھا، اس سے کہیں زیادہ [illegible] ایک جگہ سے دوسرے مقامات پر لوگوں کو کام کرنے کی عادت نہیں۔ وہ تہذیب یافتہ ہیں [illegible] یہاں کے لوگ زیادہ تعلیم یافتہ اور محنتی ہیں۔ [illegible] نہیں جانتے۔ مگر قتل کرتے ہیں

[illegible] آیا اس کے پیش نظر [illegible] آر پی ایف کا ساتھ دے گا۔ نہیں، [illegible] ہمیشہ غلاموں کا ساتھ دے گا۔

۹

آر پی ایف نے، جیسا کہ حکومت کی مخالفت کرنے پر اس کو کبھی معاف نہیں کیا، اور [illegible] بات پر [illegible] سے روانڈا کے کچھ علاقے تو اپنے قبضے میں لے کر آر پی ایف کی مکمل فتح کا [illegible] دیا، اور [illegible] بات پر [illegible] نسل کشی نے کلیدی گروہوں کو روانڈا کی سرحدوں سے باہر [illegible] دیا۔ اس کے باوجود روانڈا کی سرکاری فوج کو جوں ہی آتے آتے یہ احساس ہو چکا

تھا کہ وہ جنگ ہار گئی ہے۔ وسط جولائی میں اس فوج کا کمانڈر چیف جنرل آگسٹین بیزیموگنو اپنی فوج کے ساتھ فرار ہو کر زئیر کی سرحد کے اندر گوما (Goma) پہنچ چکا تھا۔ اس فوج کی شکست ہوئی تھی کیونکہ اس کی بیشتر قوت مفلوج رہی تھی۔

بہت سی ہوتو لین آبادی بھی ان کے ساتھ فرار ہوئی۔ یہ ایک عجیب و غریب اجتماعی فرار تھا جس کا مشاہدہ سینکڑوں خبر نگاروں اور درجنوں ٹیلی وژن سٹیشنوں کے نمائندوں نے کیا، جن کی زبان پر ہموار یہ الفاظ تھے کہ یہ انسانی تاریخ میں ریکارڈ ہونے والا سب سے بڑا خروج ہے، جس میں دس لاکھ افراد نے صرف ایک مقام سے صرف تین دن کے عرصے میں بین الاقوامی سرحد پار کی۔

اسے فراموش کرنا نہایت دشوار ہے: گرد و غبار، ماں باپ سے بچھڑے اور روتے ہوئے بچے، ریلے کے قدموں تلے کچلے جاتے کمزور لوگ۔ وہ ایک خوف کے زیر اثر بھاگ رہے تھے — وہ اس بات سے دہشت زدہ تھے کہ اگر وہ روانڈا میں رکے رہے تو اقلیت ہوتو آبادی سے اس عمل کا انتقام لے گی جو توتسیوں کے ساتھ روا رکھا گیا (اور ان کا یہ خوف، جیسا کہ مجھے اور دوسرے لوگوں کو بعد میں معلوم ہوا، بے بنیاد نہیں تھا۔)

گوما کی جانب فرار بظاہر انتشار کا شکار ضرور تھا، لیکن دوسری طرف منصوبہ بند بھی تھا۔ پوری کی پوری برادریوں نے ایک ساتھ ہجرت کی۔ وہ اب بھی اپنے مقامی رہنماؤں کے پیرو تھے اور ان کی ہدایات پر عمل کرتے تھے: ریڈیو مل کولنز نے اور بورگ ماسٹروں نے انہیں زئیر کی طرف فرار ہونے کی ہدایت کی تھی، جیسا کہ چند ہفتے پہلے ان کی جانب سے توتسیوں کو قتل کرنے کی ہدایات جاری کی گئی تھیں۔ تاہم ان میں سے بہت سے روانڈا سے فرار ہو کر بھی موت سے نہ بچ سکے کیونکہ گوما کی طرف فرار اجتماعی خودکشی ثابت ہوا۔ انسانی فضلے سے تمام گٹر بری طرح اٹ گئے، اور تھکن سے گر کر مرنے والوں کی لاشیں کفن دفن کے بغیر سڑکوں پر پڑی رہیں۔ ہیضہ پھیل گیا۔ مردہ افراد آتش فشاں چٹانوں سے بنے میدان پر پڑے رہے جہاں قبریں نہیں کھودی جا سکتی تھیں۔ دفن کرنے کے بجائے لاشوں کو چٹائیوں میں لپیٹ کر دو دو تین تین کی تہوں میں ایئرپورٹ جانے والی سڑک پر رکھ دیا گیا تھا جن میں سے بعض کے قریب بچے بیٹھے رو رہے تھے۔ آخر کار امداد کو پہنچے فرانسیسی سپاہیوں کو مشینوں کی مدد سے ایک بڑا سا گڑھا کھودنا پڑا جس میں ان لاشوں کو بلڈوزروں کے ذریعے دفن کیا گیا۔

Scanned with CamScanner

گویا شاہ گردوں سے یہ ایک چال تھا، لیکن قتل عام نے مجرموں کے لیے فرار کا راستہ ہی
... میں امدادی اداروں نے مسجد محمد آورہاں کو ... کردہ ہولوں سے الگ کرنے کی بات کی
لیکن حرم اور دوسرے دینی ... ریشے سو توں سے ہیں ... کی تک ... بیوست ہیں کہ ان کو الگ
الگ کرنا غیر ملکیوں کے بس کی بات نہیں۔ اس دوران سو تو لیڈروں سے گویا، اور جمیل کیدو کے
دوسرے کنارے پر واقع ... کے ایک اور شہر ... ہوکاو ... میں بڑے بڑے مکان کرائے پر لے لیے
تھے اور اپنے اپنے سیاسی گروہوں کے ڈھانچے دوبارہ کھڑے کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو
چکے تھے۔ میں ... قومی امدادی اداروں کو بھی ان ڈھانچوں کی ضرورت تھی کیونکہ امداد کی تقسیم کا
کوئی اور موثر طریق کار موجود نہیں تھا۔ ہمدردی اتفاق ... جا ... آئی: گر امدادی کارکن لوگوں
کی، خصوصاً مردوں ... تے ہوئے بچوں کی، جانیں بچانا چاہتے تھے تو انہیں اسی نظام کو تقویت دینی
تھی جس نے مسجد محمد آور ... پیدا کیے تھے اور ... انسانوں کو قاتلوں میں تبدیل کیا تھا۔

یہاں ... ان ... حمد ... ہیں، گوما کی ایک مضافاتی سڑک پر واقع ایک دفتر میں ایک
امدادی کارکن سے ... کے لیے انتظار کرتے ہوئے مجھے ایک ... آواز سنائی دی، ... بون ژور
مادام! ... یہ پور ... پیدا ... میں ... ہیں ... اپریل کے آخر میں ہماری فون پر
بات ہوئی تھی، لیکن ... ہی ... گئی تھی ... مجھے یقین ... آیا کہ وہ اب تک زندہ ہے۔ اس نے
بتایا کہ وہ ... کی کہ میں ... رہا ... تک ... آ ... ہی ... سرحد ... میں داخل ہو گئی۔ اس مکان کو ... یہ
پور ... ہو ... کسی نے ... تباہ کیا۔ ... کی بیوی اور بچے بھی محفوظ ... ہے۔

مگر وہ یہاں، ہوتو ... ان کے لیڈروں کے درمیان، کیا کر رہا تھا؟ آخر کار میں نے اس سے
پوچھ ہی لیا: ... سے شناختی کارڈ ہیں ... کسی کے ... ہیں ... لکھ ... ہے؟

"ہوتو،" اس نے جواب دیا۔

... ساہت ... تھی۔ میں نے یہ کیوں ... کر ... ہوتو ... سے ... طور پر
... ن سکتا ہے؟ شاید اس لیے کہ ... ایک امدادی ادارے نے ملازم رکھا ہوا تھا، یا شاید اس لیے
کہ ... کے اس عالم میں ... ہم ... کرنا ... میری ضرورت تھی۔ شاید اس لیے کہ ان دنوں میں بھی
جب قتل عام ... انتہائی شدت پر تھا، میرا غالب ... فرض ... کا تھا ... یہ فرض کر لے کہ وہ
... ہے ... شخص کے مسئلے پر ... کرنے سے ... گریز کر سکتی تھی۔ ... نے اس مکان کی

چابیاں، جو وہ اُن دنوں سے اپنے ساتھ لیے پھر رہا تھا، میرے حوالے کیں۔ میں نے اُسے پیسے دیے۔ پھر وہ ہجوم میں غائب ہو گیا، لاکھوں پناہ گزینوں کی بھیڑ میں ایک اور پناہ گزین، جسے اب، پہلے سے کہیں زیادہ، موت کے شدید خطرے کا سامنا تھا۔

۱۰

دسمبر کے مہینے میں، میں کیگالی میں آکس فیم (Oxfam) نامی ادارے کے دفتر میں اس کے عملے کی ایک رکن، ایستھر متوجاوایو، سے ملنے گئی۔ قتلِ عام کے پہلے چند ہفتوں کے دوران وہ، اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ، اس اسکول میں چھپی رہی تھی جہاں اس کا شوہر فرانسیسی زبان کا استاد تھا؛ اپریل میں، میں کوشش کے باوجود برطانیہ میں اس کے دوستوں کی طرف سے آنے والے پیغامات اس تک پہنچانے میں ناکام رہی تھی۔ مئی کے اوائل میں فوجی اس کے شوہر کو پکڑ کر لے گئے اور گولی مار دی۔ ایستھر اور اس کے بچے مزید دو مہینے روپوش رہے۔

ایستھر کا بات کرنے کا انداز بہت تیز اور شدت بھرا تھا؛ وہ بات کرتے ہوئے آگے کو جھک جاتی تھی جیسے مخاطب کو اپنی بات سمجھانے کی سخت کوشش کر رہی ہو۔ اگر آپ اس سے کہیں تو وہ آپ کو اپنی شادی کی تصویریں دکھانے لگے گی۔ وہ انگلی کے اشاروں سے اپنے باپ، ماں اور خالہ کی نشان دہی کرے گی وہ سب کے سب اُسی گاؤں میں مارے گئے جہاں ایستھر پیدا ہوئی تھی۔ پھر وہ اُسی تصویر میں ان لوگوں کی طرف اشارہ کرے گی جنھوں نے اس کے ان عزیزوں کو قتل کیا — پڑوسی، دوست، وہ سب لوگ جن کی مانوس شکلیں دیکھ دیکھ کر وہ بڑی ہوئی تھی۔

ایستھر کے خاندان کے اکتیس افراد قتل ہوئے۔ اس کی ستتر سالہ پانچ ماں اور اسی سالہ خالہ کو ان کے بستروں میں سے گھسیٹ کر باہر نکالا گیا اور لاشوں کے ایک ڈھیر کے اوپر زندہ پھینک دیا گیا۔ وہاں انھیں دھوپ اور بارش میں پڑے پڑے اپنی جان دینے میں کوئی ایک ہفتے کا وقت لگا اور اس دوران گاؤں کے لڑکے انھیں پتھر مارتے رہے۔ اس کی عم زاد بہن ٹٹیوں کے گڑھے میں مری؛ جب اس نے گڑھے سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو ایک ہوتو نے اس کے ہاتھ کاٹ دیے۔

Scanned with CamScanner

[illegible] سے لوگوں سے مجھے تک [illegible] تھا [illegible] لیکن قتل کرنے [illegible] اس قدر [illegible] طریقے لوگ کیوں کر اختیار کر سکتے ہیں؟

[illegible] کوشش کر سکے کہ دراصل کیا ہوا تھا۔

[illegible] کوئی [illegible] کچھ [illegible] شروع کر دی۔ [illegible] ختم ہو چکے ہیں۔

[illegible] بھی جا سکتی ہوں۔

[illegible] نہیں [illegible] یہاں [illegible] تبدیل ہو [illegible] ایک [illegible] قتل [illegible] مستقل [illegible] ختم ہو چکا تھا۔ وہ بولی، [illegible] بے اختیار نکلتا ہے: ارے، تم زندہ ہو! جیسے یہ کوئی معجزہ ہو! جیسے سب لوگوں کو [illegible] تھا!

مگر [illegible] یہاں [illegible] ۔ [illegible] مہاجرین، جو ۱۹۵۹ کے تشدد سے بچ کر [illegible]

ہوئے تھے — جنہیں عرف عام میں لہوتشمپا کہا جاتا ہے — جیسے بھیم، نیپال، روسی اور یوگنڈا سے وطن لوٹ آئے ہیں۔ ڈنکو کھل گئے ہیں؛ سیدھے پہاڑے ہوٹل کی مرمت ہو چکی ہے۔ شادیوں کی ایک پوری [illegible] اور یوں سالوں کے [illegible] سے بھی کی رونق کا [illegible] دیہات میں سے آنے والوں سے ان فصلوں کی کاشت ہوئی اور انہوں نے شروع کر دی ہے جنہیں مرنے والے، یہ زمیں یا تو نیلام کر دی گئی یا چھوڑ کے گئے۔ معاہدہ آزوٹ میں کہا گیا تھا کہ ۱۹۵۹ میں ملک چھوڑنے والوں کو وطن واپس لوٹنے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن ان کو لوٹنے سے روکنے والا کون باقی بچا ہے؟

۱۱

اور اب، ۱۹۹۵ کے موسم گرما میں، روانڈا نیپالی مہاجروں کی صنعت کا مرکز بن چکا ہے۔ یہاں ایک سو بیس غیر سرکاری تنظیمیں (NGOs) کام کر رہی ہیں؛ اقوام متحدہ کے بے شمار دیگر ادارے ان کے علاوہ ہیں۔ یورپ اور شمالی امریکا سے بہت خوش پوش نوجوان سفید ٹویوٹا کاروں میں سوار ادھر ادھر آتے جاتے ہیں جن کے دروازوں پر ان کے اداروں اور تنظیموں کے شناختی نشان بنے ہیں اور جن پر لکھے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ریسٹ، کوٹوں جیسے موٹے، جو جیب پر جھولتے رہتے ہیں۔ ان کی بات چیت میں مختلف اداروں کے مخفف نام بار بار آتے ہیں، اور ان کی گفتگو کی بحث میں داخلی بندش رہتی ہے۔

یہاں آنے والے غیر ملکی کو اقوام متحدہ کی عالمی کمیشن کی جانب سے پلاسٹک کی تہہ چڑھا سفید کارڈ دیا جاتا ہے — یہ وہی ادارہ ہے جو نسل کشی کو روکنے سے قاصر رہی، وہ اب بھی نسل در نسل تجارت کرنے کو روکنے سے قاصر ہے۔ کارڈ پر روانڈا کا نقشہ بنا ہوا ہے اور اقوام متحدہ کے سلامتی کے نظام — گرین الرٹ، یلو الرٹ، ریڈ الرٹ — کی تفصیلات درج ہیں۔ کچھ کارآمد فقروں کے مقامی زبان سے ترجمے بھی دیے گئے ہیں: ہاں، نہیں، شکریہ، ہیلو، میرا نام [illegible] ہے، نیپال کہاں ہے؟، تلاش کرنا!

مئی ۱۹۹۵ کے آخر تک زائرے نے صوبہ مغربی حصے میں واقع سابق [...] زون تک محدود تھی جہاں ڈھائی لاکھ سو تو پناہ گزین اب تک کیمپوں میں رہ رہے تھے۔ ملک کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کی نسبت پناہ گزینوں کو مدد کرنا زیادہ آسان ہے، اور اس کی فوری ضرورت بھی تھی۔

لیکن نئی آر پی ایف حکومت ان کیمپوں کو مستقبل حملہ آوروں اور [...] سے مکمل کیے جانے والے منصوبوں کا ایک نقاب سمجھتی تھی۔ مئی میں اس نے فوج کو ان کیمپوں کو تباہ کرنے کی ہدایت کی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۳۳۸ افراد ہلاک ہوئے، جن میں سے اکثریت بھگدڑ میں کچلے جانے والوں کی تھی۔ غیر ملکی ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ انھوں نے چار ہزار لاشیں اور [...] دیکھیں جن میں سے بیشتر کو پشت کی طرف سے آر پی ایف کے سپاہیوں کی گولیاں لگی تھیں۔ غیر ملکیوں کے لیے حکومت کا یہ موقف تھا کہ قومی سلامتی انسانیت نوازی کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ ہوتوؤں کے لیے بھی اس کا یہ مطلب بالکل ٹھیک سمجھ میں آتا ہے۔

حل کی تلاش میں بات ہو تو غیر ملکیوں کے منہ سے عموماً مفاہمت کا لفظ نکلتا ہے۔ [...] موجود ہوتے مجھے بتایا کہ اس تصور کو سمجھنے کے لیے [...] دشوار ہے۔ مجھے اس لفظ سے نفرت ہے، کیونکہ اس کے معنی میری سمجھ میں نہیں آتے، اس نے کہا۔ فرض کیا میں مفاہمت کرنے کو تیار بھی ہو جاؤں تو کس کے ساتھ؟ میں ابھی ایسے کسی شخص سے نہیں ملا جسے احساس جرم ہو، جس نے اپنے فعل کی معذرت کی ہو۔ مجھ سے معافی مانگ کون رہا ہے؟

جب تک نسل کشی کے مجرم [...] کارروائی کرنے والے ارکان، [...] کے منتظمین، ایسے میں خود کو [...] قرار دینے والی حکومت کے وزرا آزاد گھوم رہے ہیں، تب تک کوئی شخص [...] سے یا کسی اور زندہ بچ جانے والے سے معافی کا خواستگار نہیں ہوگا۔ یہ تمام لوگ [...] کینیا، مغربی افریقہ اور یورپ میں آزادی سے اڑتے پھر رہے ہیں، اپنے لیے حمایت کا بندوبست کر رہے ہیں، ہتھیاروں کے سودے کر رہے ہیں، [...] کے منصوبے تیار کر رہے ہیں، اور روانڈا میں جو کچھ ہوا اس کی [...] پھیلا رہے ہیں۔ ان لوگوں میں جنرل [...] شامل ہے اور [...] عبوری حکومت کا وزیراعظم ژاں کمباندا بھی۔

کمبانڈا اب خود کو جلاوطن حکومت کا وزیر اعظم کہتا ہے اور زائیر کے شہر بوکاوو میں جھیل کے کنارے ایک مکان میں رہتا ہے جہاں سے وہ، جھیل کیوو کے دوسرے کنارے پر، روانڈا کو دیکھ سکتا ہے۔

روانڈا کے باہر رہنے والے ہوتو قتل عام کو ہوتوؤں اور توتسیوں کے درمیان ہونے والی ایک نسلی جنگ کی صورت میں پیش کرتے ہیں، جو لوگوں کے دو گروہوں کے مابین شدید عداوت کا نتیجہ تھی۔ دوسری جانب، آر پی ایف کا کہنا ہے کہ قتل عام ایک ایسی حکومت کے ایما پر کیا گیا جو تمام توتسیوں کو، اور تمام مخالف ہوتوؤں کو بھی، ایک ہی وحشیانہ مہم میں ختم کر دینا چاہتی تھی تاکہ ہمیشہ اقتدار پر فائز رہ سکے۔ آر پی ایف، جو خود کو ایک غیر فرقہ وارانہ قوت کے طور پر پیش کرنا پسند کرتی ہے، کہتی ہے کہ اس کی جنگ ہوتوؤں کے خلاف نہیں بلکہ اس حکومت کے خلاف ہے۔ (آر پی ایف کے نزدیک روانڈا میں ناانصافی اور ظلم کی تمام تر داستان صرف پچھلے تیس برسوں پر محیط ہے جب اقتدار ہوتوؤں کے ہاتھ میں تھا؛ توتسی بالادستی کی صدیوں کو — جب ہوتوؤں کو محکوم بنا کر رکھا گیا تھا — ظلم و ستم سے پاک ماضی خیال کیا جاتا ہے۔) آر پی ایف نے ملک کی جیلیں ایسے افراد سے بھر دی ہیں جنھیں نسل کشی میں حصہ لینے کے شبے میں پکڑا گیا ہے، لیکن لاکھوں کسانوں کو قید کر دینے سے، یا مار ڈالنے سے بھی، اجتماعی جرم کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔

نسل کشی کو جن لوگوں نے منظم کیا تھا وہ بھاگ نکلے ہیں، اور ان کے خلاف شہادتیں بھی دستاویزی طور پر محفوظ ہیں۔ لیکن ان میں سے محض چند گرفتار ہوئے ہیں۔ ایک کمزور اور فنڈ کی کمی کا شکار بین الاقوامی ٹریبونل ابھی اور شہادتیں جمع کرنے میں مصروف ہے۔ اگر گرفتاری کے وارنٹ کبھی جاری کیے جا سکے تب تک ملزموں کو اس قدر وقت مل چکا ہوگا کہ وہ گرفتاری سے بچنے کے لیے افریقا کے زیادہ محفوظ حصوں میں جا چھپیں۔

نسل کشی کی قیادت کرنے والے آج بھی زائیر اور تنزانیا میں ہوتو کسانوں پر بڑی گرفت مستحکم رکھے ہوئے ہیں۔ ان پر کسی طرح کا دباؤ نہیں ہے کہ وہ اپنے کیے ہوئے جرائم کا حساب دیں، تو کجا، ان کو تسلیم ہی کریں۔

اس تمام معاملے میں دولت مند دنیا کا قصور یہ نہیں ہے کہ اسے کوئی پروا نہیں — بلاشبہ

کرتے ہوں اور مدد رکھتے ہوں ... ڈالر حاصل نہیں ہو چکے ہیں ... بلکہ یہ کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ روانڈا اس وقت دنیا کی نظروں میں آیا جب صدر حبیاریمانا کا طیارہ تباہ ہوا، اور جنوں نے ہم اس نسل کشی کی ہانپ سے نکال کر دیتے ہیں جس سے یہ عمل بے معنی سے محروم ہو جاتا ہے۔ ہم کچھ بھی نہیں ہو سکتے تھے، جہاں پہ ہم کچھ بھی نہیں کر سکے۔ ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ نسلی پہ اور کلچر افراد کو اپنے اندر سمیٹ کر ایک طاقت ور ہونے کی شکل دے سکتا ہے، کہ جس میں شناخت ذاتی احساس اور کردار پر حاوی بھی ہو سکتی ہے۔

عبوری حکومت کا کہنا ہے کہ آر پی ایف صدر اور اعتدال پسند ہوتوؤں کو بے ساتھ اقتدار میں شریک کرے، لیکن اعتدال پسند ہوتوؤں کو تو سب سے پہلے مار دیا گیا تھا۔ مجوزہ آر پی ایف حکومت میں کچھ ہوتو بھی شامل ہیں، لیکن ان سے [illegible] کار کردگی فوج کے اعلیٰ عہدے دار ہیں جس نے جنگ جیتی تھی۔

[illegible] ہو رہے کی ... جو میں سرحد سے [illegible] مسلح حملہ آور اور ہوتو سپاہی مشرق کی جانب سے وطن پر لشکری حملے کرتے ہیں۔ وہ وہاں آکر سے مخبروں پر لوگوں کو تربیت دینے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ [illegible] نہیں [illegible] جو قتل ہونے والے توتسیوں کے بچے اور بیٹیاں [illegible] کے خواب [illegible] ہوتے ہیں [illegible] کی سمت سے [illegible] سینگوں والے مویشیوں کے ریوڑ [illegible] گروہ چلے آ رہے ہیں

۱۲

آخری مرتبہ یہاں جا رہے ہیں [illegible] لوگوں کو تلاش کیا جو یہ روایت سے واقف تھے۔ جب تک بستر ہو [illegible] مجھے ایک ڈرائیور سے ملانے لے آئی جس سے یہ روایت کا پتا چل سکتا تھا، تب تک مجھے [illegible] موجود تھا کہ مجھے کی خبر سننے کو ملے گی۔ ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ وہ اس مکان کے قریب [illegible] میں قتل عام کے دنوں میں رہی تھی۔ سڑک کی ایک رکاوٹ کو عبور کر کے دوسری طرف گیا تھا اور اس نے قتل عام شروع ہونے کے ایک ہفتے بعد وہاں یہ روایت کو دیکھا

تھا۔

"وہ کیا کر رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ایک بندوق اٹھائے ہوئے تھا۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ اسے اس کے لیے مجبور کیا گیا ہو؟"

"وہ بندوقیں صرف اُن لوگوں کو دیتے تھے جن پر انھیں پورا بھروسا ہو۔ وہ ان کے ساتھ تھا ــــ اُنھیں میں سے تھا۔ ہم جانتے ہیں۔"

ڈرائیور نے، جو توتسی تھا، سڑک کی اس رکاوٹ کے قریب پہنچتے ہوئے خود کو موت کے نرغے میں آتا محسوس کیا تھا۔ اس نے خود کو سیلیسی ریڈ کراس کا ملازم ظاہر کیا۔ ایوارستے نے میری طرف نہیں دیکھا، اور میں نے بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ میں نے یہی ظاہر کیا کہ اسے نہیں جانتا، مگر میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔"

میں سوچنے لگی کہ کیا ایوارستے نے اپنا کام شروع کرنے سے پہلے میرے نکل جانے کا انتظار کیا ہوگا، یا اس نے یہ کام انھیں راتوں میں شروع کر دیا تھا جب وہ مکان کے اندر آ کر سونے سے انکار کرتا تھا۔ میں سوچنے لگی کہ اس نے باہر گھومنے والے فوجیوں سے کیا سودے بازی کی ہوگی۔ وہ کیا سوچتا رہا ہوگا، اس نے ایسا کیوں کیا، یہ عمل اس کے لیے کیا معنی رکھتا تھا؟ کیا وہ پہلے سے متشدد حملہ آوروں کے گروہ کا رکن تھا یا انھیں دنوں ان کے ساتھ شامل ہوا؟ کیا اسے زبردستی اپنے ساتھ ملایا گیا یا وہ اس کام پر خود ہی یقین رکھتا تھا؟ میں سوچنے لگی کہ میں اس سے کیوں کر بے خبر رہی۔ میں اپنی حماقت پر، اپنی تکلیف دہ لاعلمی پر، کچھ بھی نہ سمجھ پانے، کچھ بھی نہ دیکھ پانے پر حیران تھی۔ جو دن اس نے اور میں نے کیگالی کے اس مکان میں اکٹھے بسر کیے وہ میری زندگی کے دہشت ناک ترین دن تھے۔ میں اس تمام تجربے سے ایوارستے کے ساتھ گزری تھی، پھر بھی اس کے بارے میں، اس کے لوگوں کے بارے میں کچھ نہ جان سکی، اور نہ اس بارے میں کہ وہ کہاں سے آیا تھا، کیا سوچتا تھا، کیا محسوس کرتا تھا۔

**

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مارک ڈائل

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

کیپٹن مباایے دیا گنے

روانڈا کا قصبہ نیاماتا دارالحکومت کیگالی سے تیس میل جنوب میں واقع ہے۔ جب میں وہاں پہنچا تو گرجا گھر اب بھی سیکڑوں لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ کچھ لاشوں کی باقیات کو کتوں نے چیر پھاڑ دیا تھا اور مجھے سنبھل سنبھل کر چلنا پڑ رہا تھا کہ کہیں میرا پاؤں کسی کا سر یا انسانی جسم کی کسی اور ہڈی پر نہ آ جائے۔ کئی اخبار نویسوں نے ان مناظر کا سامنا ہونے پر اپنی طبیعت کے مالش کرنے کا تذکرہ کیا تھا۔ لیکن نیاماتا میں پھیلی ہوئی بو کچھ ایسی ناقابلِ برداشت نہ تھی — قتلِ عام کو واقع ہوئے تین مہینے گزر چکے تھے اور لاشیں خشک ہو گئی تھیں۔ مجھے قے نہیں ہوئی۔ میں نے گرجا گھر سے بیس گز دور کھڑی ہوئی مستعار لی ہوئی کار میں بیٹھ کر بی بی سی ریڈیو کے لیے اپنا مراسلہ تحریر کیا، جو یوں شروع ہوتا تھا: باغیوں کی جانب سے خبر نگاروں کو قتلِ عام کے موقعِ واردات پر لے جانے کی باتوں کو محض باغیوں کا پروپیگنڈا کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا۔ نسل کشی کا واقعی ارتکاب کیا گیا ہے اور اس کی کچھ شہادت نیاماتا میں موجود ہے۔ بی بی سی "نسل کشی" جیسے لفظوں کے استعمال کے سلسلے میں بہت محتاط رہتا ہے، لیکن میرے مراسلے کو بالکل ویسا ہی نشر کیا گیا جیسا میں نے لکھا تھا۔

قتل و غارت گری کا آغاز ۶ اپریل کو ایک پُراسرار ہوائی حادثے میں صدر جووینال ہابیاریمانا کے ہلاک ہونے کے بعد ہوا تھا۔ چند منٹ کے اندر اندر ہوتوؤں کے موت کے سکواڈ

Scanned with CamScanner

مرحوم صدر نے تمام سیاسی مخالفوں اور مشتبہ مخالفوں کو قتل کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ان میں توتسیوں کے علاوہ، جو روانڈا کے پیٹریاٹک فرنٹ کی حمایت کرنے والا سب سے بڑا قبیلہ ہیں، اعتدال پسند ہوتو باشندے بھی شامل تھے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ کتنے لوگوں کی جان لی گئی۔ ریڈ کراس نے لگ بھگ پانچ لاکھ تک کی گنتی پر پہنچ کر گننا چھوڑ دیا تھا۔

کیگالی میں میری جن دوستوں سے ملاقات ہوئی تھی ان میں کیپٹن مباے دیاے بھی شامل تھا۔ وہ سینیگال سے تعلق رکھنے والا اقوام متحدہ کا ایک فوجی مبصر تھا جو ۱۹۹۲ میں افریقی اتحاد کی تنظیم کے وفد کے ایک رکن کے طور پر روانڈا پہنچا تھا۔ ۱۹۹۳ کے اواخر میں اس وفد کو وسعت دے کر اقوام متحدہ کے مشن میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس مشن کے ارکان کے ذمے، جن میں بیشتر افریقی تھے، جنگ بندی کے نفاذ اور ایک مخلوط حکومت کے قیام کی نگرانی کرنا تھا۔

مباے نے ڈاکار کی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے فوراً بعد سینیگال کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ جب میں اس سے پہلی بار ملا، وہ اخبار نویسوں کی بابت گہرے شک کا رویہ رکھتا تھا۔ ایک موقعے پر تو اسے خاص طور پر سخت غصہ آیا جب ایک فرانسیسی خبر نگار نے یہ (درست) اطلاع دی کہ کیگالی میں باغیوں کے غلبے کے باعث نیم فوجی ملیشیائیں وہاں سے فرار ہو رہی ہیں۔ "آپ میرے کام میں سخت دشواری پیدا کر رہے ہیں،" اس نے فرانسیسی صحافی سے کہا۔ "ملیشیاؤں کے فرار کی خبر چھپنے سے ان کی نا کوشیں لگے گی اور ممکن ہے وہ اور زیادہ لوگوں کو قتل کر ڈالیں۔" جیسا کہ مباے کا دستور تھا، اس بحث کا اختتام مصالحے پر ہوا اور مباے کے وغدار دانت مسکراہٹ میں کھل گئے۔ "اپنا کام ضرور انجام دیجیے۔ لیکن مہربانی کر کے احتیاط کیجیے۔"

مباے دراز قد اور بیشتر سینیگالیوں کی طرح چھریرے بدن کا تھا اور ہر وقت اپنی بے داغ سبز چھاپہ مار وردی میں ملبوس رہتا تھا۔ یہ میرے لیے ہمیشہ ایک معما رہا کہ وہ اپنے چھوٹے سے کمرے، جس میں پانی کا کوئی نل موجود نہیں تھا، اس قدر صاف ستھری حالت میں کیوں کر برآمد ہوتا تھا۔ شاید یہ اس کے بچپن کا ورثہ تھا جو اس نے سینیگال کے دارالحکومت ڈاکار کے ایک مضافاتی علاقے پکائین میں گزارا تھا۔ میں نے وہاں کے چھوٹے مکانات دیکھ رکھے ہیں جن میں پانی کے

قتل نہیں ہوتے، اور جہاں سے مائیں اور بچے صاف سفید شاندار بُوبُو پہنے، جو شمالی سینیگال کا روایتی لباس ہے، ریتیلی گلیوں میں قدم رکھتے ہیں۔

مباے سے میری دوستی ہونے کا سبب شاید یہ تھا کہ میں ڈاکار میں کچھ وقت گزار چکا تھا اور اس کی مادری زبان وولوف کے کچھ لفظ جانتا تھا۔ ہم عموماً فرانسیسی میں بات کرتے تھے، گرچہ وہ، بیشتر افریقیوں کی طرح، کئی زبانیں بول سکتا تھا جن میں انگریزی بھی شامل تھی۔ ہمارا ایک پسندیدہ موضوع خوراک، خصوصاً سینیگال کی مخصوص غذا، تھی۔ افریقی سپاہی ناٹو کے فراہم کیے ہوئے پیک راشن سے خاص طور پر نالاں رہتے تھے؛ وہ ڈبوں میں بند اور مصنوعی طور پر محفوظ کی گئی خوراک کے عادی نہ تھے اور مچھلی اور چاول کے خواب دیکھا کرتے تھے۔

مباے کا کام اقوامِ متحدہ اور روانڈا کی سرکاری فوج کے درمیان رابطہ قائم رکھنا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کا کام کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اپنے دانتوں کے درمیان ایک سگریٹ اٹکائے اور نقشوں کا ایک پلندا بغل میں دبائے وہ ہر وقت ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہا ہوتا۔ ہر جانب سے لڑنے والے سپاہی مباے کو خوب جانتے تھے کیوں کہ وہ سڑک پر کھڑی کی گئی رکاوٹوں پر ٹھہر کر ان سے ایک آدھ بات کر لینے کا وقت ہمیشہ نکال لیتا تھا۔

مباے کو علم تھا کہ اقوامِ متحدہ کی پالیسی صرف اپنے غیر ملکی ملازمین کے تحفظ تک محدود ہے اور اقوامِ متحدہ کے مختلف اداروں کے لیے کام کرنے والے مقامی روانڈائی باشندوں کو محفوظ مقامات پر لے جانا اس ذمے داری میں شامل نہیں ہے۔ جب یہ اعلان کیا گیا کہ بیشتر غیر ملکیوں کو کیگالی سے نکال لیا گیا ہے، تو اس کا مطلب یہ تھا کہ زیادہ تر سفید فام باشندے وہاں سے جا چکے ہیں۔ جس وقت یوروپ کے لیے یہ خبر نشر کی جا رہی تھی، میں نے تقریباً پانچ ہزار زائیری باشندوں کو اپنے ملک کے سفارت خانے کے باہر کھڑے دیکھا جو کیگالی سے نکالے جانے کے لیے بے تاب تھے۔ ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ تھا، انھیں ملیشیا نے گھیر رکھا تھا اور ریڈ کراس کے سوا کوئی ان کی مدد کرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ ان لوگوں کے ترجمان نے جو خالی پڑے سفارتی مشن کے اُجڑے ہوئے خاک آلود لان پر رہ رہے تھے، مجھ سے کہا، "اگر اقوامِ متحدہ ہمیں یہاں سے نہیں نکال سکتی تو ہم جنگ زدہ علاقوں سے پیدل گزر کر زائیر جائیں گے۔" چند روز بعد وہ لوگ جا چکے تھے۔ میں نہیں جانتا ان میں کتنے زائیر پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

پس، اقوام متحدہ کی ذمے داری نبھانے کی سخت محنت کے ساتھ ساتھ مبائیے نے سینیگال اور روانڈا کے زیادہ سے زیادہ باشندوں کو بچانے کی بھی کوشش شروع کر دی۔ اس نے سب سے پہلے جن لوگوں کی جان بچائی ان میں روانڈا کی مقتولہ وزیر اعظم اگاتھے اووِلنگی یمانا کے بچے شامل تھے، جو خود باغیوں کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے کسی حل تک پہنچنے کی حمایت کے جرم میں سرکاری فوج کے ہاتھوں ماری جا چکی تھی۔ کیپٹن مبائیے سرکاری فوج سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ اس کا اگلا نشانہ مقتول وزیر اعظم کے بچے ہوں گے۔ اس نے ان بچوں کو ڈھونڈ کر اپنے کمرے میں چھپا لیا اور پھر کسی نہ کسی طرح انہیں باہر بھجوانے کا بندوبست کر دیا۔

حکومت کے مخالف سرکردہ توتسی اور ہوتو باشندوں نے کیگالی کے ایک حصے میں، جو سرکاری قبضے میں تھا، ایک ہوٹل میں پناہ لے لی تھی؛ یہ ہوٹل ملِ کولنز تھا جو کبھی خاصا پر تعیش سمجھا جاتا تھا۔ ان پناہ گزینوں نے ہوٹل کا سوئمنگ پول جلد ہی خالی کر ڈالا کیوں کہ انہیں پینے اور نہانے دھونے کے لیے پانی کی ضرورت تھی۔ چند ہفتے بعد بجلی کی سپلائی بند ہو گئی۔ ملیشیا کے مسلح جوان خطرناک انداز میں پھاٹک کے آس پاس گھوم رہے تھے۔ اقوام متحدہ کے چند غیر مسلح فوجی علامتی حفاظت کی ایک باریک سی لکیر بنائے کھڑے تھے۔ مبائیے بھی ان سپاہیوں میں شامل تھا۔ مخالف فریق کو مداخلت پر آمادہ کر لینے کی اس کی مہارت تھی جس نے قاتلوں کو اندر داخل ہو کر ایسا ہلاکت خیز کام شروع کر دینے سے باز رکھا تھا۔

طویل مذاکرات کے بعد اقوام متحدہ شہر کے اندرونی حصوں میں، مخالفانہ صف بندی کے ادھر اور ادھر، پھنسے ہوئے چند شہریوں کے باہم تبادلے کا بندوبست کرنے میں کامیاب ہوئی۔ توتسیوں اور حکومت مخالف ہوتوؤں کو ہوٹل ملِ کولنز اور سرکاری قبضے کے دوسرے علاقوں سے محفوظ نکالا جاتا تھا، اور اس کے بدلے میں باغیوں کے زیرِ تسلط علاقے میں واقع فٹ بال اسٹیڈیم سے ہوتوؤں کو سرکاری علاقے میں پہنچایا جاتا تھا۔

اس باہمی تبادلے کی پہلی کوشش تقریباً ایک سانحے پر منتج ہوئی۔ سرکاری ملیشیا نے فیصلہ کیا کہ اس تبادلے میں وہ نقصان میں رہے ہیں، چناں چہ انہوں نے ہوٹل ملِ کولنز سے باہر نکلتے ہوئے اقوام متحدہ کے قافلے پر حملہ کر دیا۔ خنجروں سے مسلح مرد اور ادھوری وردیاں پہنے لڑکے مسافروں کو گھسیٹ کر اور سڑک روک کر کھڑے ہو گئے۔ پہلے قافلے میں شامل ایک شخص نے بعد میں

Scanned with CamScanner

ایک خط میں لکھا: "کیپٹن مبایے دیاگنے نے ہماری جانیں بچائیں۔ وہ نہتا لاری پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے پیروں، اپنے کٹ بیگ، اور کسی بھی چیز کے ذریعے ملیشیا کا سامنا کرنے لگا۔ ہم اسے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔"

ملیشیا کے مخبروں سے کئی افراد کے شدید زخمی ہونے کے بعد اس قافلے کو واپس ہوٹل بھیج دیا گیا۔ لیکن اس کے بعد کے تبادلے ٹھیک طرح انجام پائے۔ دہشت زدہ لوگوں سے بھرے اقوام متحدہ کے سفید ٹرکوں پر مشتمل دو قافلے بیک وقت لڑائی کی صف بندی پر واقع چوراہے پر ایک دوسرے کے برابر سے گزرے۔ یہ ٹرک جنہیں گھانا سے تعلق رکھنے والے اقوام متحدہ کے فوجی چلا رہے تھے، اقوام متحدہ کی وساطت سے طے پانے والی متزلزل جنگ بندیوں میں سے گزر کر ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے؛ یہ جنگ بندیاں بار بار توڑی جاتیں اور کبھی بھی چند گھنٹوں سے زیادہ قائم نہ رہتیں۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے موقعے تھے جب کیپٹن مبایے نے لوگوں کی جانیں بچائیں۔ اقوام متحدہ کے ایک امدادی کارکن کے پاس ان روانڈائی باشندوں کی فہرست تھی جو جنگ شروع ہونے سے پہلے اقوام متحدہ کے مختلف اداروں کے لیے کام کر رہے تھے۔ ان میں سے بعض کے ناموں پر لکیر پھیر دی گئی تھی۔ یہ مر چکے تھے۔ بعض دوسرے لوگوں کے ناموں کے آگے رقمیں لکھی تھیں — ۳۵ ڈالر، ۳۰ ڈالر — یہ وہ رقمیں تھیں جن کے عوض سڑکوں پر بنی ملیشیا کی رکاوٹوں پر ان کی جاں بخشی کرائی گئی تھی؛ ملیشیا والوں سے مذاکرات کرنے والا مبایے ہوتا تھا۔

سرکاری فوج کی ایک بڑی بیس کے ٹھیک سامنے کوئی بیس گز کے فاصلے پر مبایے نے ایک پورے خاندان کی جانیں بچائیں جو ایک بظاہر خالی پڑے مکان میں چھپے بیٹھے تھے۔ یہ لوگ توتسی تھے، لیکن مبایے نے بہت سے ہوتوؤں کو بھی بچایا۔

اور مجھے خیال ہوتا ہے کہ مبایے نے میری بھی جان بچائی تھی۔ میں اس کی گاڑی میں سوار، کیگالی کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ ہمیں اس شہر میں سڑکوں پر جگہ جگہ بنی ہوئی رکاوٹوں میں سے ایک پر روکا گیا اور ملیشیا کا ایک جوان، چینی ساخت کا اسٹک گرینیڈ لیے، اس طرف سے گاڑی کے قریب آیا جدھر میں بیٹھا تھا۔ "کیا تم بیلجیئن ہو؟" اس نے پوچھا۔ سرکاری ریڈیو اسٹیشن نے

Scanned with CamScanner

اعلان کیا تھا کہ صدر کی ملاقات کے دوران ٹیلیمیں ہیں۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مباہیے نے اسے مضبوط لہجے میں مخاطب کیا۔ مجھ سے بات کرو۔ یہ میرے ساتھ ہیں، اس نے فرانسیسی میں کہا۔ مباہیے غیر مسلح تھا، پھر بھی ملیشیا کا جوان شتشن کھڑا ہو گیا۔ وہ گھوم کر گاڑی کے دوسری طرف پہنچا۔ کیا یہ میری مہم شمس ٹیلیمیں ہے؟ اس نے سوال کیا۔ احمق مت ہو! مباہیے کا لہجہ اب بھی مضبوط تھا۔ میرے رنگ صورت سے کچھ زیادہ مضبوط۔ پھر وہ اپنے دوستوں سے مسکرایا۔ یہاں صرف میں ٹیلیمیں ہوں سمجھے! اس نے مذاقاً اپنی سینیگالی تعداد کی طرف شارہ کرتے ہوئے کہا۔ یاد رکھو ٹیلیمیں۔ ملیشیا کا سپاہی پیچھے ہٹا۔ اب ہم، مباہیے ایک بار پھر مضبوط لہجے میں بولا۔ میرا راستہ چھوڑو۔ میں اقوام متحدہ کا فوجی افسر ہوں اور مجھے اس رکاوٹ کے پار جانا ہے۔ تم نے اپنا راستہ نہیں بدلا۔

میں مباہیے کے کام کی بابت بی بی سی کی رپورٹوں کو سنسر کر دیتا تھا۔ اگر یہ خبر پھیل جاتی کہ ایک سینیگالی افسر لوگوں کو بچاتا پھر رہا ہے تو وہ خود اور علاقے میں اب تک موجود حکومت مخالف دشمنوں کے خطرے کی زد میں آ جاتے۔ لیکن اب مباہیے کی سرگرمیوں کے بارے میں کھل کر لکھنا نسبتاً محفوظ ہے۔

میں اقوام متحدہ کے ہیڈکوارٹر کے کار پارک کے نزدیک کھڑا تھا جب ہم سب نے اس دھماکے کی خبر سنی جسے بعد میں فوجی زبان میں حادثے کا نام دیا۔ اقوام متحدہ کا ایک امدادی کارکن جو لوگوں کو خطرے سے نکالنے کی مہموں میں مباہیے کے ساتھ رہا تھا بہت غمزدہ ہو۔ ایک فوجی افسر بھی اسی مورٹر کے گولے کا شکار ہو گیا ہے۔

کون؟ میں نے پوچھا۔

ابھی معلوم نہیں، امدادی کارکن بولا۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے سن لیا تھا کہ یہ کون افسر تھا۔ لیکن وہ خود کو اس امید سے بہلا رہا تھا کہ ممکن ہے یہ خبر غلط ہو۔ پھر اس نے خبردار تاروں کی باڑ میں سے جھانک کر جائے میں نظر ڈالی۔ میں دعا کر رہا ہوں کہ یہ کیپٹن مباہیے نہ ہو۔ دوطرفہ ریڈیو میں سے آواز آئی۔ کیپٹن مباہیے دیا گنے غائب ہو گیا ہے۔ ایک ایمبولینس اس کے آخری معلوم ٹھکانے کی طرف بھیج دی گئی ہے۔

میں لاش کے ہٹائے جانے کے پانچ منٹ بعد جائے واردات پر پہنچا۔ مبایے کی لینڈ کروزر کی سامنے والی سیٹ خون میں لت پت تھی۔ وہ باغیوں کے مورٹر کے ایک گولے کی زد میں آ کر، جو گاڑی کے ڈرائیور والے دروازے سے تین گز دور آ کر گرا تھا، موقعے ہی پر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ ایک چیک پوائنٹ پر، جسے خود اس نے کیگالی نائٹ کلب برج کا نام دیا تھا، سرکاری فوج کے سپاہیوں سے بات چیت کر رہا تھا۔

ایک ہوتو سویلین نے، جو خود بھی اقوام متحدہ کے لیے کام کرتا تھا، مبایے کے جان بچانے کے مشن کا کچھ حصہ اپنے ذمے لینے کی کوشش کی۔ اب اس کی شناخت ہے جسے چھپانا ضروری ہو گیا ہے۔ "مبایے مر گیا،" اس شخص نے کہا۔ "میں اس کا کام جاری رکھنے کی کوشش کروں گا۔ کوئی اور آدمی اس شہر کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتا۔"

کیگالی میں میرے قیام کے آخری دن خبر نگاروں کو اقوام متحدہ کی طرف سے باغیوں کے زیر تسلط علاقے میں واقع اپنے ہیڈ کوارٹرز سے سرکاری فوج کے قبضے کے علاقے میں واقع ریڈ کراس اسپتال تک لے جانے کی پیش کش ہوئی۔ ہمیں کیگالی نائٹ کلب برج سے گزر کر جانا تھا۔ میں اقوام متحدہ کی گاڑی میں سوار ہو کر پہلے بھی کئی بار ادھر سے ادھر آ جا چکا تھا۔ لیکن اس بار پہنی فلیپ جیکٹ اور ٹیپ ریکارڈر اٹھاتے ہوئے مجھے اپنے دوست کا خیال آیا۔ میں اپنے کام کے آخری دن مرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یہ لغو خیال آیا کہ یہ سفر کرنا نادانی ہو گی۔ میں اس سفر پر نہیں گیا۔

**

گابریل گارسیا مارکیز

منتخب تحریریں

("آج" شمارہ ۷ بہار ۱۹۹۱، کتاب کی صورت میں)

[illegible]
کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب

دو مکمل ناول

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا ... ایک پیش گفتہ موت کی روداد

تیرہ منتخب کہانیاں

[illegible]
[illegible]

"کولمبیا کا مستقبل"

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

قیمت: دو سو روپے

آج کی کتابیں
[illegible]، بلاک ۱۵، گلشن اقبال، کراچی [illegible]

انتخاب

نجیب محفوظ

کا ناول

شادیانے

(دوسرا اور آخری حصہ)

انگریزی سے ترجمہ: فہمیدہ ریاض

Scanned with CamScanner

آئندہ صفحات میں مصر کے معروف ادیب نجیب محفوظ کے ناول 'افراح القبہ' کے اردو ترجمے کا دوسرا اور آخری حصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس ترجمے کا پہلا حصہ گزشتہ شمارے میں شامل تھا۔ یہ ترجمہ، جسے اردو میں 'شادیانے' کا عنوان دیا گیا ہے، ناول کے انگریزی ترجمے کو بنیاد بنا کر کیا گیا ہے جو Wedding Song کے عنوان سے پہلی بار ۱۹۸۴ میں شائع ہوا تھا۔ اردو ترجمہ کرتے ہوئے ناول کے اصل عربی متن کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔

ناول کے عنوان کی تھوڑی سی وضاحت کر دینا مناسب ہوگا۔ 'افراح القبہ' کا لغوی مفہوم کسی بزرگ کے مزار پر برپا کیا جانے والا شادی کا جشن ہے۔ لیکن اس ناول میں پیش آنے والے واقعات کا محل وقوع شہر قاہرہ ہے جہاں یہ اصطلاح ایک مخصوص معنی رکھتی ہے۔ 'قبہ' خدیو مصر کے سرکاری محلات میں سے ایک کا نام تھا، اور خود نجیب محفوظ کی وضاحت کے مطابق خدیو کے خاندان کی شادیوں کی خاص بات وہ مغنی تھے جن میں گانے اور رقص کرنے والے پیش ہوتے تھے۔ ان محفلوں میں گائے جانے والے گیتوں کو رفتہ رفتہ 'افراح القبہ' کہا جانے لگا۔

نجیب محفوظ کو عربی زبان کے نمایاں ترین ناول نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی شہرت کی اصل بنیاد ان کے طویل ناول ہیں جو قاہرہ کی زندگی کی پیچیدگی اور رنگینی کو بہت تفصیل سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن مختصر ناولوں اور کہانیوں میں بھی ان کی فنکاری، اعلیٰ مشاقی اور انسانی نفسیات سے گہری شناسائی کسی مختلف ڈھنگ سے ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ 'شادیانے' بھی اس کی ایک بہت عمدہ مثال ہے۔ نجیب محفوظ کے پچیس سے زائد ناول اور کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اور ان میں موضوعات، اسلوب اور نقطۂ نظر کا تنوع ملتا ہے، لیکن جس موضوع سے نجیب محفوظ کو ہمیشہ شدید دلچسپی رہی ہے وہ وقت اور اس کے اثر سے انسانی زندگی میں آنے والی تبدیلی ہے۔ اس ناول میں بھی، جو عربی میں پہلی بار ۱۹۸۱ میں شائع ہوا، پڑھنے والے کی توجہ وقت کے بہاؤ پر مرکوز ہوتی ہے جو محبت کو نفرت میں، حسن کو بدصورتی میں، وفاداری کو خیانت میں اور آدرش پسندی کو بدعنوانی میں بدل دیتا ہے اور ایسا شکستہ نشان کہانی کے تمام کرداروں پر چھوڑ جاتا ہے، اور یہاں تک کہ اس قدیم مکان پر بھی جو ان کرداروں کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ نجیب محفوظ نے کہانی کو چار کرداروں کی زبانی بیان کیا ہے اور اس مقصد کے لیے اندرونی خودکلامی کی تکنیک نہایت کامیابی سے برت کر ان میں سے ہر ایک کی انفرادی شخصیت اور نقطۂ نظر کو اجاگر کیا ہے۔ ناول کی اس ساخت سے یہ نکتہ بھی بڑی خوبی سے واضح ہوتا ہے کہ کس طرح واقعات کی مختلف تفصیلیں لوگوں پر جدا جدا اثر ڈالتی ہیں اور یوں نہ صرف ان کے انفرادی نقطۂ نظر کی تشکیل کرتی ہیں بلکہ ان کی شخصیت کے خدوخال کو متعین کرتی ہیں۔

اس سے قبل 'آج' کے شمارہ ۲ (سرما ۱۹۹۰) میں نجیب محفوظ کی ایک کہانی کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

حلیمہ الکبش

دوسرے حصہ جیل کی کوٹھری سے روے ارض پر... میرے سامنے عباس کا چہرہ۔ عباس کو سینے سے لگائے ہوئے، عار اور خجالت کے بوجھ تلے جھکے ہوئے۔ میں نے عباس کے سینے میں چہرہ چھپا لیا تھا۔ میں نے کہا تھا:

ہم نے تیرے ساتھ کس قدر بدسلوکی کی۔ کاش مجھے موت آجاتی۔ ہم سے تیرا پیچھا تو چھوٹتا۔"

اس نے نرمی سے کہا تھا:

تکلیف تو صرف اب آپ کی باتوں سے ہو رہی ہے۔

میں آنسو ضبط نہیں کر پائی۔

اب تو ہم شکر کریں۔ اب مستقبل کی فکر کرنی چاہیے۔

میں نے گلوگیر آواز میں کہا:

ارے میرے بیٹے، تو کیا رہ گیا۔ اللہ کی پناہ نے تیری روح و اولاد کو چھین لیا... اور ہم تجھے دلاسا دینے کو موجود نہیں تھے۔"

"جو ماضی ہے وہ ماضی ہے۔"

اس نے باپ سے ایک کلمے کا بھی تبادلہ نہ کیا۔ ہم ماضی کی طرح ایک بار پھر اس بیت القدیم کے بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔

اس نے کہا۔ دیکھو اب ماضی کا دوبارہ ذکر نہ کرنا۔ پھر لمحہ بھر توقف کے بعد کہنے لگا:

میں سوچ رہا ہوں کہ کیا کرنا چاہیے۔ کیا آپ تھیٹر میں اپنا پرانا کام دوبارہ شروع کرنا چاہتے ہیں؟"

Scanned with CamScanner

کرم نے کہا:

"ہرگز نہیں... لعنت ہو اُن سب پر!"

"تو پھر میں سامنے والے کمرے میں ایک دکان لگا دیتا ہوں۔ کچھ سامان بیچ دیں گے اور کھانے پینے کی چیزوں کی دکان کھول دیں گے۔ آسان کام ہے، اور منافع اچھا ہوتا ہے۔ آپ دونوں کا کیا خیال ہے؟"

میں نے اطمینان سے کہا:

"جو تیری رائے ہو بیٹا۔ خدا عنقریب تیرے بارے میں اچھی خبر سنوائے۔"

"بادنِ خدا... میرا یقین ہے میں کامیابی کے قریب پہنچ رہا ہوں۔"

میں بار بار اس پر خدا کی رحمت بھیجتی رہی۔ حتیٰ کہ اس نے ہم دونوں کو باری باری دیکھ کر کہا:

"اہم بات یہ ہے کہ آپ ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ اور میں کوئی بھی بات نہ سنوں جس سے مجھے رنج ہو۔"

میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا:

"میرا خواب تھا کہ تیرے ساتھ رہتی۔"

اس نے کہا:

"اگر خدا کی رضا سے کہیں کامیاب ہو جاؤں تو سب کچھ بدل جائے گا۔"

کرم نے سختی سے کہا:

"تم اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟"

"آپ دونوں تعاون سے رہیے۔ آپ دونوں کے اچھی زندگی گزارنے کے لیے مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا وہ میں کروں گا۔ مگر آپ دونوں تعاون سے رہیے"

کیسا تعاون؟ وہ کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ وہ اس درجہ سادہ لوح ہے کہ دلوں کے راز نہیں جانتا، خواہ وہ عین اس کی آنکھوں کے سامنے ہوں۔ وہ کیوں کر جان سکتا ہے کہ اس کے باپ نے کیا حرکتیں کی ہیں جبکہ اس نے خواہش کا ظاہر ہی دیکھا ہے؟ میرا بیٹا جس طرح چاہے قربانیاں دے اور شفقت اور سخاوت کرے، مگر اسے احساس نہیں کہ وہ دو حریفوں کو جیل کی ایک کوٹھری میں بند کر

رہا ہے۔ ایک جیل سے دوسری جیل میں! اس کے سوا میرے لیے دوسرا آسرا نہیں۔ میرے بیٹے کر تو کامیاب ہو اور مجھے بچا لے۔

***

میں اُسے کام کرتے ہوئے دیکھتی ہوں ــــ مونگ پھلیاں، تربوز کے بیج، مکئی کے دانے اور مٹر بیچتے ہوئے۔ وہ وقت کھلی دراز میں پیسے پھینکتا جاتا ہے۔ اتنے طویل عرصے تک رزقِ حرام میں غرق رہا ہے کہ بے شک وہ دوبارہ اُس عادت کی طرف راغب ہونا چاہتا ہوگا جس کا جیل نے علاج کر دیا تھا۔ اگر عباس نے اصرار نہ کیا ہوتا کہ ہم آمدنی آپس میں برابر برابر تقسیم کیا کریں تو ہم دوبارہ برباد ہو چکے ہوتے۔ اس کے چہرے پر مستقل کیسا ملال چھایا رہتا ہے۔ جب کوئی گاہک آ جائے صرف اس وقت ہی یہ حزنیہ نقاب اس کے چہرے سے اُترتا ہے۔ بڑھاپا اس پر اس طرح چھایا ہے کہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڈھا لگنے لگا ہے۔ اور اس کا مطلب ہے کہ میں بھی بڈھی ہو گئی ہوں۔ وہ جیل کے پُر آلام ایام، وہ رات جب چھاپا پڑا تھا اور مخبر میرے منہ پر طمانچے مارے جا رہا تھا۔ آہ! حرام زادے! ان میں سے ایک بھی ہم سے ملنے نہیں آیا۔ المعلی سی طارق رمضان کی مثل حرام زادہ ہے۔ انہیں بس ایک رات حراست میں رکھا گیا اور پھر چھوڑ دیا گیا، اور سزا صرف ہمیں سنائی گئی۔ پڑوسی کہتے ہیں کہ قانون صرف مسکینوں کے واسطے سخت ہے۔ وہ بھی ہمیں مجرم گردانتے ہیں اور ہم پر ہنستے ہیں، مگر ہماری دکان سے سودا خرید لیتے ہیں۔ میرے لیے کوئی راہِ نجات نہیں، مگر اے میرے بیٹے، بس تیری کامیابی۔ وقت گزرتا جاتا ہے اور ہم ایک دوسرے سے ایک کلمہ بھی نہیں کہتے۔ نفرت کی آنچ تندور سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس مکروہ بہت تقدیر کو صاف کرتے ہوئے، پاک بناتے ہوئے مجھے کس قدر کشمکش محسوس ہوتی ہے۔ آخر مجھے اس منحوس زندگی کو بسر کرنے کی سزا کیوں ملی ہے؟ کبھی میں حسین و جمیل تھی، مہذب اور پاک دامن تھی۔ قسمت... قسمت... کون مجھے قسمت کا مطلب سمجھائے گا؟ لیکن خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ میری قسمت تیرے ہاتھ میں ہے اے عباس! سیدی شعرانی کے عرس کی وہ رات مجھے کبھی نہ بھولے گی جب تو نے مجھے کرب سے رہائی دینے والے الفاظ ادا کیے تھے:

"آخر کار، میرا ڈراما منظور کر لیا گیا..."

اس کے بچپن سے لے کر اب تک میں اتنی خوش کبھی نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنے دل شباب کی، مدہوش ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے باپ کا چہرہ بھی مسرت سے روشن ہو گیا تھا۔ کیوں نہیں، تیرا اس سے کیا واسطہ تھا؟ میری تو سمجھ میں نہیں آتا! تُو تو اس سے نفرت کرتا ہے، جیسے وہ سے کرتا ہے۔ ٹھیک ہے، وہ تمہاری خواہشات کے برعکس مصنف بن گیا۔ مگر تم تو اس کے خیالات کو حماقت سمجھتے تھے۔ لیکن حمیر کو شہرت نصیب ہوگی۔ اس کی طاقت و قوت تم جیسے بیوقوفوں کو جھاڑو کی طرح صاف کر دے گی۔

***

مجھے حریف پسند نہیں، مگر اس کے کارناموں کی خبریں نزدیک تر آ رہی ہیں۔ یہ بادل آئے کہاں سے ہیں جن سے روشنی کم ہو جاتی ہے؟ میرے دل پر جو بادل چھائے ہیں کیا وہ کافی نہیں؟ میں مرد کی آواز سنتی ہوں جو کہہ رہا ہے:

وہ دیکھو، سامنے طارق رمضان ہماری طرف لپکے آ رہا ہے جیسے سڑک پر کسی حادثے کی خبر دیا ہو۔ کیا یہ ہمیں مبارک باد دینے آیا ہے یا ہمارا تمسخر اڑانے؟

میں نے کہا:

"بہت خوب... اہلِ وفا کی اوّلین زیارت!"

اس کی بد خوئیوں سے میں نے صرفِ نظر کر دی جب تک اس نے یہ نہ کہا کہ میں ایک بری خبر لایا ہوں۔"

میں نے غصے میں اس سے کہا:

"بری خبر کی اب ہمارے لیے کوئی حقیقت نہیں۔"

"خواہ وہ عباس یونس ہی کے بارے میں کیوں نہ ہو؟"

میرا دل ٹھنڈا پڑ گیا، پھر بھی میں نے پرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے تحمل سے کہا:

"اس کا ڈراما قبول کر لیا گیا ہے۔"

"یہ ایک ذلیل مذاق ہے! معلوم بھی ہے کہ یہ ڈراما ہے کیا؟"

پھر اُس نے پورے ڈرامے کا خلاصہ سنایا، اہم واقعات کی تفصیلات بتائیں، اور بولا:

"پورا حال... پورا حال ہے اس ڈرامے میں۔"

میرا سر چکرا رہا تھا۔ میں نے بڑی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے کہا:

"تیرا کیا مطلب ہے سے عباس کے عدو؟"

"تو خود ڈراما دیکھ لو۔"

"نفرت نے تجھے اندھا کر دیا ہے۔"

"نفرت نے نہیں، جرم نے..."

"مجرم تو تُو خود ہے۔"

"تجھ کے قاتل کو سزا ملنی چاہیے۔"

"تُو خود ایک خسیس مجرم ہے۔ تُو دفع کیوں نہیں ہو جاتا۔"

وہ ہنسا اور بولا:

"کون کہتا ہے کہ جیل میں تادیب اور اصلاح ہو جاتی ہے۔"

میں نے مٹھی بھر زہر کے بیج اٹھا کر اس کے منہ پر مارے۔ وہ خباثت سے ہنستا ہوا چلا گیا۔

عباس نے کیا کر ڈالا؟ یہ اُس نے کیا کیا؟ میرا بیٹا کبھی قتل نہیں کر سکتا، کبھی خائن نہیں ہو سکتا۔ مگر رکھو اپنی ماں سے تو خیانت کبھی نہ کرے گا وہ تو فرشتہ ہے۔

مردے میری نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ مجھے اسی ابدی تنہائی سے خود کو گھسیٹ کر باہر نکالنا پڑے گا۔ میں نے کہا:

"یہ جھوٹ ہے!"

"وہ کیوں جھوٹ بولے گا؟"

"وہ میرے بیٹے سے نفرت کرتا ہے۔"

"مگر ڈراما تو لکھا گیا ہے۔"

"تم عباس کے پاس جاؤ۔"

"اس سے تو مل ہی لوں گا۔"

"مگر تم تو بیٹھے ہوئے ہو۔"

"عجلت کس بات کی ہے؟"

وہ مجھے عاجز کر دیتا ہے۔ طارق کی طرح وہ بھی عباس سے نفرت ہی تو کرتا ہے۔ میں نے کہا:

"اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے پیٹھ پیچھے کیا کہا جا رہا ہے۔"

"اور اگر اس نے اعتراف کر لیا تو؟"

"وہ ہر بات کی وضاحت کر دے گا۔"

"کیا معلوم"

"حقیقی قاتل اپنی فضیحت تھوڑا ہی کرتا ہے۔"

"کیا معلوم"

"تم جا کر اس سے ملو تو سہی۔"

"جا رہا ہوں گا۔"

"تم کہو تو میں چلی جاؤں؟"

"تمہارے پاس مناسب لباس ہی نہیں ہے۔"

"تو پھر [illegible] دو۔"

حرم [illegible] وہ، تھوڑا وہ ہماری [illegible] زندگی سے گریز کرتا تھا [illegible] جرائم [illegible] خود کو مشغول رکھتا تھا! مگر [illegible] اس نے ہمیں دھوکا تو کبھی نہیں دیا اور نجیب کو علاوہ کیوں قتل کرے گا؟"

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔"

"یوں ہی، سوچ رہا تھا۔"

"تمہیں اس جرم زدے کی بات کا یقین آ گیا ہے۔"

"یقین تو تمہیں بھی آ گیا ہے۔"

میں نے ہونٹ بھینچ کر آنسو روکے اور کہا:

"دیکھنا یہ ہے کہ عباس کیا کہتا ہے۔"

سچ تو یہ ہے کہ میرے خیال میں یہ سب جھوٹ ہے۔

"اب ہذیان مت بکو!

لعنت ہو تجھ پر!"

"لعنت تو تب سے جب سے تیرے پلّے پڑی..."

"میرا بھی یہی حال ہے۔"

میں نے طیش میں آ کر کہا:

"میں کبھی حسین تھی... یہ تو میرا نصیب ہے...

تمہارا باپ ڈاکیا تھا۔ میرا باپ تو افشرجی خاندان کی جاگیر پر کام کرتا تھا۔

یعنی خدمت گار تھا۔

میں خاندانی ہوں۔

"اور تمہاری ماں کیا تھی؟"

"تمہاری ہی طرح کی تھی!"

خرافات بکنے والے! تو جانا ہی نہیں چاہتا... یہی بات ہے نا؟"

جب میرا دل چاہے گا تب جاؤں گا۔ پھر اس نے لہجہ بدل کر کہا:

"وہ عصر کے وقت گھر پر ہوگا۔"

کوشش سے میں نے اس کی گالی پر صبر کیا، حالانکہ شک مجھے ہلاک کر رہا تھا۔ میرا سارا بدن مفلوج ہوا جا رہا تھا۔ اچھے لوگوں کے بارے میں وہ کیا کہاوت ہے؟ خرابے میں گلاب جیسے ہوتے ہیں؟ قاتلوں اور ان کے شکاروں کی بستی ہیں۔ اس مرد نے لباس سونے کے لیے مجھے کپڑا خرید کر دیا ہے مگر میں ٹالے جا رہی ہوں۔ اب فوراً قطع کر کے سینے کے لیے دے دوں گی۔ رنڈی کی ولاد، میرے نسب پر حرف رکھتا ہے! مگر عباس اپنی ماں سے خیانت نہیں کر سکتا۔ وہ اور کسی بھی شے کو حقارت سے دیکھتا ہو، مگر اپنی ماں کی محبت کو ہرگز نہیں۔ محبت شر سے زیادہ طاقتور ہے۔

***

بچپن میں میرا پُرمسرت گھر شکستہ میں، جہاں سورج ہمیشہ چمکتا رہتا تھا، سردیوں میں بھی، رات کے وقت بھی۔ جہاں حسین حلیمہ رہتی تھی، حسین ماں کی بیٹی۔ ابا بھی چیزیں لاتے تھے۔ میری ماں کہتی تھی:

"اسے پڑھاؤ۔ تعلیم سے اسے زندگی کے اچھے مواقع ملیں گے۔ کاش ایسا موقع مجھے بھی ملا ہوتا!"

یہ ابا کی وفات سے پہلے کی بات ہے۔ پھر ایک دن ہمارا ایک رشتہ دار عم احمد برجل آیا۔ اس نے امی سے کہا:

"یتیم لڑکی ہے۔ اس کی تعلیم مشکل ہو گئی ہے۔"

"پھر کیا کریں، عم احمد؟"

"اس کے پاس سرٹیفکیٹ ہے۔ ذہین لڑکی ہے۔ اسے ضرور کام مل جائے گا۔ تھیئٹر میں ایک کیشیئر کی ضرورت ہے۔"

امی نے پوچھا تھا:

"کیا یہ کام تمہارے لیے مناسب رہے گا؟"

میں نے جھجکتے ہوئے کہا تھا:

"مشق سے نقص دور ہو جائیں گے۔"

عم احمد نے کہا تھا:

"تھیئٹر جی سلالی کے دوست ہیں۔ وہ ہمارے محسن ہیں۔ ان کا نام لیا تو کام بن جائے گا۔ پھر میں سنبھال لوں گا۔"

اس طرح مجھے اس دنیا کا نیا تجربہ ہوا جب میں نے تھیئٹر کے دروازے پر پہلی بار قدم رکھا۔ وہ عمارت کتنی شاندار تھی۔ اس کی خوشبو تک خاص قسم کی تھی۔ وہاں جا کر عم احمد کی سمیت میری نظر میں کچھ نہ رہی۔ بلاوے جانے پر میں نے پروڈیوسر سے ملنے کے لیے اندرونی کمرے میں قدم رکھا۔ میں پہنے ہوئے تھی وہ سادہ لباس میں ڈرتے ڈرتے قدم اٹھاتی پروڈیوسر کی طرف جا رہی تھی۔ اس کا ملحوظ بالقد، تحکمانہ شان اور آر پار ہو جانے والی نگاہوں کا تاثر کس قدر شدید

تھا۔ اس نے کتنی دیر تک میرا معائنہ کیا تھا کہ میری تقریباً جان نکل گئی تھی۔ آخر اس نے مجھے ایک کاغذ دیا تاکہ رقصیں درج کرنے میں میری استعداد کا امتحان لے۔

"کام شروع کرنے سے پہلے تربیت بھی ہوگی یا ...؟" میں نے شرماتے ہوئے کہا تھا۔

"جیسا الکمش۔" وہ مسکرایا تھا۔ پھر اس نے کہا تھا:

"الکمش؟ خیر کچھ بھی ہو... اس کنسرٹ کی کسی مشقوں سے بڑھ کر قبول صورت ہو۔ تربیت کے بعد تمہارا امتحان لینا چاہوں گا۔"

اور میں جوش و خروش سے کام میں لگ گئی تھی اپنے مستقبل کے لیے نہیں، اس پُرکشش چودھری کو خوش کرنے کے لیے۔ میں نے اپنی امی سے اس کا حلیہ بیان کیا تو انھوں نے بتایا کہ اونچے طبقے کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کی رضا حاصل ہو جائے تو کیسی نعمت ہوگی۔ بعد میں جب میں اس کے سامنے کھڑی تھی تو میرے نفس مضطرب تھے۔ حمیرا، تم تو ہماری کمپنی کا گوہر نایاب ہو۔ اللہ خود جمیل ہے اور جمال سے محبت کرتا ہے۔ اس نے میرا بدن کس وقت سہلانا شروع کیا تھا؟ کھلے دریچے سے سورج کی تیز شعاعیں میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ باہر کوئی دیہاتی بانسری پر رقص کی دھن بجا رہا تھا۔ میں نے اکھڑی اکھڑی سانسوں کے ساتھ اس کا ہاتھ پرے دھکیلا تھا۔ نہیں جناب، میں شریف لڑکی ہوں۔ اس کی ہنسی میرے کانوں میں گھنٹی کی طرح بجی تھی۔ اس وسیع مقفل کمرے میں چھائی خاموشی میں میرے احتجاج نے دم توڑ دیا تھا۔ تیز گرم تنفس اور ہوشیاری سے کی گئی دست درازی، اور میرا عزم صادق شکست کھا گیا۔ یہ ایسا کابوس تھا جس میں شکست ہوتے تو ہیں مگر اس سے کوئی ہمدردی نہیں کرسکتا۔ اس کمرے کے باہر لوگ آتے رہے اور جاتے رہے... امی کا یہ سب کچھ معلوم ہونے سے پہلے انتقال ہو گیا۔

***

آخرکار عصر کے وقت وہ چلا گیا۔ میرے اعصاب کچھ پُرسکون ہوئے۔ میں تنکے کا سہارا ڈھونڈ رہی ہوں۔ مگر میں کیا توقع کرسکتی ہوں؟ کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے یہ لباس ہی تیار کر لوں۔ میرا بیٹا اپنے در مجھے بتائے گا۔ اس کریہہ مرد کو نہیں۔ عباس کے سوا اب میرا کون ہے؟

Scanned with CamScanner

* * *

مایوسی افیون کے ساتھ نہیں، اس سے بھی پہلے آئی تھی۔ میری امیدیں، جو سب مر چکی ہیں یا دفن ہو چکی ہیں، کس قدر سہانی تھیں۔ مجھے یاد ہے، ایک رات جب اس نے گلاس کی تلچھٹ تک پی لی تھی، نشے میں کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دانت نکوس کر کہا تھا:

"میری ماں اس پولیس والے کے ساتھ اسی کمرے میں جایا کرتی تھی!"

یہ انکشاف ایسا سفاک تھا کہ میں ہول کر رہ گئی۔ عباس گھر میں چھوٹا اپنے جھولے میں سو رہا تھا۔ مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔

"تم نشے میں ہو، کرم..."

اس نے سر ہلا کر کہا:

"اور مجھے کبھی کبھی لگا کہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلوں۔"

"یہ تو بہت بری بات تھی..."

اس نے میرا کلام قطع کر کے کہا:

"میں منافقت پسند نہیں کرتا۔ تم منافق ہو حلیمہ!"

"خدا اس کی مغفرت کرے، کیا تم اب بھی اس سے نفرت کرتے ہو؟"

"میں کیوں نفرت کروں گا۔"

"میں بھی نہیں۔"

"تمہارا شوہر اردو میں لکھتا ہے، وہ لوگوں کے ستائے ہوئے کسی دروغ پر یقین نہیں کرتا!"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" وہ شوہر نہیں تھا لیکن ہر شے کا تمسخر اڑاتا تھا۔ ہر مقدس رسم کا، میرے اصولوں کا۔ کیا یہ مرد کسی شے کی تعظیم نہیں کرتا؟ اس قدر بے حیائی سے اپنی ماں کا راز فاش کر دیا!

پھر اس نے کہا:

اور یہ ہم دونوں کے لیے اچھا ہے۔ ورنہ میں شادی کی رات ہی تمہیں طلاق دے دیتا۔

میرے دل پر گھونسا لگا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ یہ میری زندگی کی دوسری کاری ضرب تھی۔ پھر اس نے کہا:

"معذرت یا حلیمہ! تم کب آزاد ہو گی؟"

"تم سفاک اور بد طینت ہو!"

ان کلمات کو استعمال کرنے کی زحمت نہ کرو۔ میرے لیے یہ بے معنی ہیں۔

پھر اس نے مجھے اپنی ماں کے اس پولیس والے سے معاشقے کی داستان سنائی تھی۔ کس طرح وہ کریم کو توجہ سے محروم رکھتی تھی۔ کس طرح، اس کی ماں کے اعمال کے باعث، اس کی پرورش آزادانہ ہوئی۔ آخر میں، نشے کی آخری منزل ہوتے ہوئے، اس نے کہا تھا:

"آج میں جو کچھ ہوں اپنی ماں کی وجہ سے ہوں۔"

وہ ایک طوق کی طرح میرے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ میں ایک ایسی قوت کے ساتھ رہ رہی تھی جس کا کوئی اصول نہ تھا۔ اس کے ساتھ میں کن بنیادوں پر سلوک کروں؟ مایوسی تو افیون سے پہلے ہی آ گئی تھی۔ پھر رہا ہی کیا تھا جسے افیون چھینتی۔

***

جس لمحے میں نے اسے گلی میں آتے دیکھا، نفرت کے باوجود میرا دل دھک سے رہ گیا۔ سڑک پر چلتے ہوئے وہ دکان سے کہیں زیادہ بوڑھا لگ رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا:

"اس نے کیا کہا؟"

اس نے سرد مہری سے کہا:

وہ سوٹ کیس لے کر اس مکان سے کہیں چلا گیا ہے۔

یا عذاب! یا حرماں! کیا میرے نصیب میں غم کی کوئی انتہا نہیں؟

"اس نے ہمیں کیوں نہ بتایا؟"

Scanned with CamScanner

"اسے ہماری کوئی فکر نہیں ہے۔"

میں نے انگلی سے دکان کے چاروں کونوں کی طرف اشارہ کرتے کہا:

"اس نے ہم سے اتنی وفا کی ہے جس کے ہم مستحق نہ تھے۔"

"اب وہ ہمیں بھول جانا چاہتا ہے۔"

"الملالی سے پوچھتے..."

اس نے میری طرف ایسی حقارت سے دیکھا کہ میں نفرت سے کہہ اٹھی:

"تمہیں کوئی کام ٹھیک سے کرنا آتا ہی نہیں۔"

"میں تیرا سر پھاڑنا چاہتا ہوں!"

"تم پھر افیون کھانے لگے ہو؟"

"وہ تو آج کل صرف وہی کر سکتے ہیں۔" پھر اس نے آواز دھیمی کر کے کہا:

"الملالی کو بھی کچھ خبر نہیں کہ وہ کہاں گیا۔"

میں نے بے تابی سے پوچھا:

"تم اس کے پاس گئے تھے؟"

"اسے بھی کچھ نہیں معلوم..."

"یا رب! کیا وہ مکان چھوڑ کر چلا گیا ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر کسی عورت کا قصہ ہوگا۔"

"تم جیسی عورت کی فکر سلیمہ میں ہی آسکتا ہے!"

"تم سے بات کرنا فضول ہے۔ تم اس کی پروا ہی کب کرتے ہو!"

الم سے مغلوب ہو کر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

***

سیالسی جس نے کمزور شانوں پر ایک بڑی شال ڈال کر میں مایوسی کے عالم میں عباس کے

فلیٹ پر گئی۔ وہاں میرا رنج اور بڑھ گیا جب میں نے دروازہ کھلوا کر دربان سے پوچھا:

"تمہیں کچھ علم تو ہوگا کہ ہوا کیا تھا؟"

"بالکل نہیں۔"

مجھ میں تھیٹر جانے کی ہمت نہیں۔ متذبذب قدموں سے واپس لوٹی۔ راستے میں سیندی الشہ...نی کے مزار پر رک کر میں نے ان کی کرامت کی دعا مانگی۔ پھر اپنی قید خانے کی کوٹھری میں واپس لوٹی جہاں وہ مردے فکری سے ایک گاہک کے ساتھ ہنسی مذاق میں لگی تھی۔ میں پست ہو کر بیٹھ رہی۔ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ چلا تھا۔ میں نے کہا:

"کچھ کرو... کیا تمہیں کچھ نہیں سوجھتا؟"

"میں تمہیں قتل کرنا چاہتا ہوں۔ کسی دن قتل کر دوں گا۔"

"پروڈیوسر سے جا کر ملو..."

وہ بات کاٹ کر بولا:

"تم خود چلی جاؤ۔ اپنی کنیزوں پر اس کی خاص عنایت ہوتی ہے۔"

"حق ہے کہ تیری ماں نے مجھ سے دشمنی کی۔ وہ مجھے آج بھی قبر سے اذیت پہنچا رہی ہے۔ اس نے تجھے ایسا جانور بنایا۔"

"بالقیاس، تیرے مقابلے میں تو وہ ایک عفیفہ سیندہ تھی!"

* * *

یہ تھیٹر میرے عذاب اور میری محبت کا شاہد ہے۔ شاہد ہے کہ میں نے عصمت گنوائی اور کسی نے مدد کا ہاتھ نہیں بڑھایا۔ اس کے عالی شان گنبدوں میں نیکی اور خیر کے ملاقات گونجتے ہیں اور اس کی شکست کا حوض پر میرا لہو بہہ رہا ہے میرے اندر کا لہو، جو میرا گلا گھونٹ رہا تھا۔ میں پاگل ہو رہی تھی۔ پاگل... اسے تو میری محبت کا علم تک نہ تھا۔ اس کے لیے کسی شے کی کچھ اہمیت نہ تھی۔ وہ تو شاید میرا نام بھی بھول چکا تھا۔

تم مجھ سے ملنے سے گریز کر رہے ہو۔ اب میں برداشت نہیں کر سکتی۔ میں تم سے بات

کرنا چاہتی ہوں۔"

"تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

[illegible] کچھ [illegible] ہوں

[illegible] پسند نہیں [illegible] جو کچھ ہو [illegible] پر [illegible]

میری آنکھوں میں آنسو [illegible] آئے۔ [illegible] نے کہا:

[illegible] جو کچھ [illegible] کسی [illegible]

[illegible] مت چھوڑو

[illegible] کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔

[illegible] نہیں [illegible] مستقل [illegible]

[illegible] کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

وہ [illegible] تھی جتنی کسی

[illegible] میری [illegible]

[illegible] ہے!

...

[illegible] مجھے [illegible] بہت

[illegible] وہ [illegible] نہیں [illegible] تھا۔ پھر بھی وہ

میرے [illegible] کہا۔

"مجھے [illegible] چاہیے تھا۔ سب مشاغل پر لعنت!"

[illegible] کرتے ہوئے میں نے کہا:

"[illegible] کوئی بھی نہیں [illegible] کیا پڑتا ہے! میں تو [illegible] کے غائب

ہونے سے پریشان ہو کر آئی ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولا:

"اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ صاف بات ہے کہ وہ طبیبوں سے بچ کر بھاگا ہے۔ بے شک اب وہ دوسرے ڈرامے پر کام کر رہا ہوگا۔"

"لیکن ہمیں تو خبر کرتا۔"

"اس کی خطا معاف کرو۔ قلق مت کرو۔ تم اب بھی پہلے کی طرح حسین ہو، حلیمہ! کرم کا کیا حال ہے؟"

"زندہ ہے اور نوعِ انساں کی تباہی کے درپے ہے۔"

اس بات پر وہ یوں قہقہہ لگا کر ہنسا کہ میں ہنس دی اور کافی ہاؤس سے باہر نکل آئی۔ اب میں نے تھیئٹر جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ مجھ میں ہمت سی آ گئی۔ میں نے پروڈیوسر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہی کمرہ، وہی چمڑے کا دیوان۔ وہی مرد... نہیں، مرد وہ نہیں رہا۔ بس اس کی بدچلنی باقی رہ گئی ہے۔ جمیل نے ہمیں تنہا چھوڑ دیا۔ کیا ہوگا جتنا اس کی بے راہ روی نے اسے کر دیا ہے۔ میرے آلام کے لیے ہم میں سے کون زیادہ ذمے دار ہے؟ ..

وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا:

"اہلاً... اہلاً... چلو اچھا ہوا کہ تم خیریت سے ہو۔"

"خیریت ہے؟" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جیسی کہ ایک کامیاب مصنف کی ماں کو ہونا چاہیے۔"

"فی الوقت وہی میرے عذاب کی وجہ ہے۔"

"یہ بے سبب پریشانی ہے۔ میرے پاس تمھارے لیے خوش خبری ہے۔ اس نے مجھے ٹیلی فون کیا تھا۔"

خوشی سے بے قرار ہو کر میں نے اس کی بات کاٹ دی:

"کہاں ہے وہ؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں۔ یہ اس کا راز ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ ایک نئے ڈرامے پر کام کر رہا ہے۔"

"کیا اس نے ملازمت ترک کر دی؟"

"ہاں۔ اس میں خطرہ تو مول لینا پڑتا ہے۔ مگر اسے خود پر بھروسا ہے اور مجھے بھی اس کی

Scanned with CamScanner

کامیابی کا یقین ہے۔"

"اس نے مجھ سے رابطہ کرنے کی زحمت نہیں کی۔"

"وہ اپنے سے ڈرامے کے بارے میں سوالوں سے گریز کرنا چاہتا ہے ۔۔۔ میرا تو یہی خیال ہے۔"

"اس ڈرامے کے بارے میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"تھیٹر فن ہے۔ اور فن حقیقت سے جتنا بھی مستعار لے لے، بالآخر تصوراتی ہی ہوتا ہے۔"

"لیکن لوگوں کے قیاس...؟"

"لوگوں کو اس داستان کا کیا علم؟ ایسا تو سوچنا ہی بے بنیاد ہے۔ اگر طارق کی حماقت نہ ہوتی تو"

میں نے بات کاٹ کر کہا:

"وہ تو عباس کا دشمن ہے، لعنت ہو اس پر..."

"بس اب خوش ہو جاؤ۔"

***

"اسے کرم یونس مہ سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"

"ہاں۔"

"پھر تو تمہاری بات بن جائے گی۔"

"نہیں۔ میں اس طرح کے کذب پر یقین نہیں رکھتی۔"

"اسے سب کچھ بتا دو گی؟"

"یہی راہ راست ہے۔"

"تم ایک غیر معمولی لڑکی ہو! آج کل اصولوں پر کون چلتا ہے... تو کیا قاتل کا نام بھی بتا دو گی؟"

"میرے خیال میں یہ بات اہم نہیں۔"
"بالکل درست کہتی ہو۔ یہی بہتر طریقہ ہے۔"

***

میں تھیسٹر کے کیفے میں پہنچی۔ مجھے دیکھتے ہی محمد احمد برحل نے پکار کر کہا:

"خوش آمدید، عزیزہ!"

میں اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ میرے لیے سینڈوچ اور چائے تیار کرنے لگا۔ ہم نے جتنی کچھ خوشی دیکھی ہے وہ ہمیں دو لوگوں کے باعث ـــ محمد احمد اور ام ہانی۔ یادوں کے سیلاب نے مجھے آ لیا۔ چائے اور سینڈوچ اور رومان۔ ۔ ایک رقص کی دھن جسم سے آتی ہوئی علاطت کے ڈھیر پر گرتے بارش کے قطروں کی طرح...

محمد احمد نے کہا:

عباس کی کامیابی، نیک شگون ہے۔ ماضی کے دکھوں کا ازالہ ہو جائے گا۔

میں نے کہا:

"وہ ایک اچھا کلمہ کہے بغیر چلا گیا۔"

"قلق مت کرو۔ یہاں تو کسی کو قلق نہیں۔"

"اور طارق رمضان؟"

"وہ تو نیم مجنون ہے۔"

***

یہ میرے لیے ایک نیا اور ہولناک تجربہ تھا۔ میں نے اعتراف کرنے کا عزم کر لیا تھا، مگر خوف نے مجھے یہ کرنے نہیں دیا ... آخری لمحے تک نہیں۔ میں شریف تھی، طاہرہ تھی.. ذیب سے نفرت کرتی تھی، مگر خوف نے میری زبان پکڑ لی تھی۔ کرم اس قدر محبت کرنے والا،

Scanned with CamScanner

مثالی نوجوان لگتا تھا۔ کہیں میں اسے کھو نہ بیٹھوں۔ میں خاموش رہ گئی تھی، حتیٰ کہ ہمارے گھر کے کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ اپنی کمزوری پر میں ندامت سے گڑی جا رہی تھی۔ اس لیے سچائی ہمارے سامنے ننگی کھڑی تھی۔

"میں مجرم ہوں... میں تمہیں پہلے نہ بتا سکی..."

اس کی سنجیدہ نگاہوں نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ جس بات کا مجھے ڈر تھا وہی ہو رہی تھی۔ میں نے نگاہیں جھکا لیں۔

میں تمہیں کھو دینے کے خوف سے ہراساں تھی... میری بات کا یقین کرو میرے ساتھ زبردستی ہوئی تھی...

میں نے نظریں فرش پر گاڑ دیں۔ میں نے کچھ کہا اور اس نے کچھ کہا۔ مگر الفاظ ہمارے کرب کی شدید حرارت میں کھوئے جا رہے تھے۔ اس کی آواز میرے شعور پر کندہ ہو گئی جب وہ بولا:

"ماضی کی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں۔"

میں ذرا سی رو لی تھی، مگر مجھے ایک غیر متوقع امید کی کرن سی نظر آ گئی تھی۔ میں نے کہا کہ میں ساری زندگی اس کی خوشی کے لیے وقف کر دوں گی۔ آنسو پونچھتے ہوئے میں نے کہا تھا:

"معصوموں کو لوٹنا کتنا سہل ہے!"

***

ہماری دل کے شہر میں قید خانے کی کوٹھری میں واپس پہنچی۔ میں اسے خود شبلی سے ملاقات سے جو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ کیوں اسے تسکین پہنچاؤں؟ وہ عباس سے محبت نہیں کرتا۔ یوں ظاہر کرتا ہے جیسے اسے دلچسپی ہی نہیں۔ اگر میری طرح دکھ جھیلتا تب پتا چلتا۔ ہم جو کچھ بیچتے ہیں اس سے خریدنے والے اپنا دل بہلا لیتے ہیں، مگر ہمارے دل بہلانے کے لیے صرف گالی گلوچ کا تبادلہ ہے۔

***

درجہ بدرجہ میری مایوسی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ایک سے شر سے گھر کی ساس ملا ڈالی تھی۔

"ٹیلیویژن بہت خراب چیز ہے۔ یہ تمھیں تباہ کر دے گی۔"

"پھر بھی میں اس کے لیے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔"

"تم دنیا سے فرار حاصل کر رہے ہو۔ اور بڑی سرعت سے!"

"اس کے لیے بھی اللہ کا شکر!"

"میں اپنی سی پوری کوشش کرتی ہوں۔ پھر عباس بھی ہے، تمھارا پیارا بیٹا۔"

وہ سیاہ چائے کا ایک اور گھونٹ بھرتا ہے۔ میں کہتی ہوں:

"میری تنخواہ گھر چلانے کے لیے کافی نہیں۔"

"رمضان کے کمرے کا کرایہ بھی تو آتا ہے۔"

"وہ بھی کافی نہیں۔ مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔"

میں اب تمھیں سمجھ گئی ہوں، اور خوف زدہ ہوں۔ اوّل ایام میں میں نے جو تصور کیا تھا تم وہ نہیں ہو۔ تم ہر شے گنوا چکے ہو۔ حتیٰ کہ بدنی مردانہ قوت بھی جس پر تمھیں بڑا ناز تھا۔ اب ہم جدا کمروں میں سوتے ہیں۔ ہمارے درمیان نہ محبت باقی رہی ہے نہ جنسی خواہش۔ یہ عباس، بس تم ہی باقی بچے ہو۔ اپنے باپ کی باتوں پر دھیان مت دو۔ وہ مریض ہے، اس پر اعتبار مت کرو۔ یہ حسن ہے کہ تم زیادہ تر تنہا رہتے ہو۔ اللہ تمھارے ساتھ ہے۔ اللہ کافی ہے۔ تم فرشتہ ہو۔ اپنی کتابوں، مدرسے اور تھیٹر کو اپنا استاد بناؤ۔ تم میری اولاد ہو اور عجیب انسانوں کی اولاد ہو۔ تم اس ظلمت میں ڈوبے قدیم مکان کا واحد نور ہو۔ ہر شے میں واحد ہو۔

***

وہ چوری چھپے مجھ پر نظر ڈالتا ہے کہ میں اسے سب کچھ بتا دوں گی۔ ہیہات! وہ اور بھی مجھ سے نفرت کرے! وہ کہتا ہے:

"سردیاں آ رہی ہیں۔ اس کھلی دکان میں کیسے گزر ہو گی؟

میں وثوق سے کہتی ہوں:

عباس کامیاب ہو جائے تو سب کچھ بدل جائے گا۔

وہ تلخی سے کہتا ہے:

"جب عباس کامیاب ہو جائے!"

میں نے نفرت سے کہا:

میں اس کے ساتھ رہوں گی۔ تمہیں بھی وہ کوئی کمبل یا عبا دے دے گا۔

***

احمد بن کیتھے ٹیبریا ہمیشہ یکساں رہتا تھا ـــ ہر تغیر پر خنداں، سب کی سنتا اور کسی پر یقین نہ کرتا۔ عم احمد برجل نے کہا تھا:

یہ رہے تمہارے سینڈوچ۔ میں چائے تیار کرتا ہوں۔

ایک جواں سال شخص میرے برابر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے پسلیاں اور سینڈوچ طلب کیے تھے۔ وہ تھیٹر میں کام کرنے والوں میں سے تھا، مگر اداکار نہیں تھا۔ وہ پرکشش نوجوان تھا، اس کا سر اور ناک ذرا بڑی تھی۔ عم احمد نے مجھ سے پوچھا تھا:

"آنسہ حلیمہ، کوئی فلیٹ ملا؟"

اجنبی کے سامنے میں نے تکلف سے کہا تھا:

"سونا تلاش کرنا زیادہ آسان ہو گا۔"

اس نوجوان نے اچانک پوچھا:

"کیا فلیٹ کی تلاش ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ عم احمد نے ہمارا تعارف کرایا۔

"کیا شادی کر رہی ہو؟" اس نے جرأت سے کہا تھا۔

"دو روحوں کی جدائی ہو رہی ہے! اس تھیٹر میں کس سرعت سے اس کا آغاز ہوتا ہے، اور گمشدہ تک پہنچنے سے قبل ختم نہیں ہوتا۔ شکار کا قتل، بانسری کی دھن کے ساتھ

"میرے پاس ایک قدیم مکان ہے۔ اس کی دو منزلیں ہیں۔"

"کیا فلیٹ ہیں؟"

"نہیں۔ مکان کو فلیٹوں میں تقسیم نہیں کیا گیا۔"

عمر احمد نے پوچھا تھا کہ کیا ایک منزل پر میں رہ سکتی ہوں۔ اس نے اثبات میں جواب دیا تھا۔ میں نے پوچھا تھا:

"آپ کو اور آپ کے خاندان کو تکلیف تو نہ ہو گی؟"

اس نے جرأت سے اعلان کیا تھا:

"میں وہاں اکیلا رہتا ہوں۔"

جب اس جسارت پر میں نے غصے سے منہ پھیرا تو اس نے عیاری سے کہا تھا:

"آپ اپنے خاندان کے ساتھ وہاں بالکل محفوظ رہیں گی۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے مجھ پر بُرا تاثر نہیں چھوڑا تھا۔ ... وہ چاہتا کیا ہے؟ اسے میرے المیے کے بارے میں کیا علم؟ میری محبت ... انسان ذات پر میری گہری بے اعتباری...

***

میں نے کہا کہ میں محلہ الامام میں ام ہانی کے چھوٹے سے فلیٹ کی طرف جا رہی ہوں جہاں طارق رمضان بھی ٹھہرا ہوا ہے۔ ام ہانی نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا مگر مجھے طارق کے اٹھنے تک انتظار کرنا پڑا۔ وہ اپنے کمرے سے نکلا تو اس کے سر کے بال مثل شیطان کھڑے ہوئے تھے۔

اس نے بھونڈے تمسخر سے طنزیہ کہا:

"خوش آمدید، عزیزہ!"

میں نے فوراً اپنے مطلب کی بات پوچھی:

"تم عباس کے پاس گئے تھے؟"

"ہاں۔"

Scanned with CamScanner

"یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تم نے ایسی باتیں کیں کہ عباس چلا گیا۔"

وہ حقارت سے بولا:

"پھنس گیا تھا تو بھاگ گیا!"

اس کے توہین آمیز انداز کے باعث میری آنکھوں میں غیظ سے آنسو آ گئے۔ ام ہانی نے چیخ کر کہا:

"کیا تمہارے قلب میں ذرا رحم نہیں؟ یہ کیا باتیں کر رہے ہو؟ تحیہ کی وفات کی میں شاہد ہوں۔ میں نے خود دیکھا کہ عباس غم سے جنونی ہو گیا تھا۔"

اس کی بات سن کر میں چونک پڑی۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ کیا حقیقت ان افواہوں کے مطابق ہے جو پھیلائی جا رہی ہیں۔

"تو کیا تم متفق ہو کہ یہ باتیں غلط ہیں؟"

"سب بکواس ہے!" ام ہانی نے کہا۔

"تو کیا وہ تمہارے سامنے اس کو قتل کرتا؟ ... احمق!" طارق نے کہا۔

"عباس کو قاتل تصور کرنا ہی حماقت ہے!"

"تھیٹر میں ہر رات اس کا اعتراف دکھایا جا رہا ہے۔"

ام ہانی نے کہا:

"اس ڈرامے کے طفیل تمہیں اسماعیل سے بڑھ کر دولت مل رہی ہے۔"

"جرم کے طفیل۔ جرم کے جس کی وجہ سے وہ فرار ہوا۔"

میں نے اصرار سے کہا:

"وہ کسی دوسرے مکان میں مقیم ہے اور نئے ڈرامے پر کام کر رہا ہے۔"

وہ تمسخر سے قہقہہ لگا کر بولا:

"نئے ڈرامے پر! کیوں خود کو فریب دیتی ہو یا ام عباس!"

***

آہ! اُس زمانے میں وہ ہر بات کے باوجود معقول اور مقبول ہوتا تھا۔

"تمہاری کیا رائے ہے حلیمہ؟ طارق رمضان ہمارا ایک کمرہ کرائے پر لینا چاہتا ہے۔"

میں نے احتجاج کیا تھا۔

"نہیں... نہیں... وہ جہاں رہتا ہے وہیں رہے!"

"م مانی سے اس کی لڑائی ہو گئی ہے۔ وہ گھر اس نے چھوڑ دیا ہے اور اب بے گھر پھر رہا ہے... اور مہنگائی روز بہ روز بڑھ رہی ہے۔"

"گھر میں اجنبی کو رکھنا خوشگوار نہ ہوگا۔"

"اسے کمرے کی حاجت ہے، اور ہمیں نقدی کی حاجت ہے۔"

"وہ کسی اُٹھائی گیرے سے بہتر نہیں ہے۔"

"اسے امید تھی کہ ہم کرم کریں گے خصوصاً جب ہمارے پاس اتنے خالی کمرے ہیں کہ ایک فوج ٹھہرائی جا سکتی ہے۔"

میں نے بددلی سے رضامندی دے دی تھی۔ میرے نزدیک وہ کسی کام کا نہ تھا ـــ ایک ناکام داکار، جو عورتوں کی خون پسینے کی کمائی کھاتا تھا۔ لیکن میں تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ وہ ہمارے ساتھ یہ کرے گا۔

* * *

میرے م بانی کے گھر جانے کے دوسرے دن وہ اچانک ہماری دکان پر آ پہنچی۔ وہ پنے مرد کی مدسوکی کی معافی مانگنے آئی تھی۔ طارق کی طرح وہ بھی پچاس سے اوپر کی ہے مگر اب بھی حسین ہے اور اس کی مالی حالت ٹھیک ہے۔ اس نے کہا:

"سوسٹر میں ڈر سے کی کامیابی پر ہر شخص رشک کر رہا ہے۔ اس سے پہلے ایسی کامیابی کسی کو نہیں ملی۔"

میں نے اداسی سے کہا:

"مگر مصنف روپوش ہے۔"

مہ انی نے کہا، یا ذر مہ قتل کرے تو قا مہ ہو ہے گا۔ پھر ں نے کہا:

جو ما میں لی با ۔ تی ہیں بالکل غلط ہیں۔ تر قات۔ لیکن طارق مجنون ہے

کرم نے طنز کیا:

"وہ اپنی ماں کو قتل کر دیتا تو بہتر نہ ہوتا؟"

مجھے مہ انی ہمیشہ پسند رہی۔ ں سے مجی ڈرتی ۔ بڑا کہ وہ میرے شوہر کی رشتہ دار ہے۔

* * *

تشخیص میں وہ دونوں سے مد کو رڈنی نو ں میں بیں مد ی سوئی تھی جیسے وہ کوئی سرگ

سو۔ محمد احمد رحمٰن و نہ سے نے لیے میری خالہ نے یک گوشہ صاف کیا اور کہا:

حورونی شبا کو سی ، موش ۔ کر۔ حد مد نے میں کا مد وسا ہے۔

ں نے غیر معمولی اہتمام سے کہا تھا:

"میں اس سے زیادہ اہم بات کے لیے آیا ہوں۔"

"تو پھر میرے پٹاری کھول!"

"بات علیم کے بارے میں ہے۔"

خالہ نے کن کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف۔ میرے رخساروں پر خون دوڑ گیا۔ اس نے

پوچھا:

"کیا؟ ... ڈولھا؟"

"صحیح اندازہ لگایا۔"

ں نے محمد احمد رحمٰن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولا:

"کرم یونس۔"

میری خالہ نے کہا:

"کرم یونس کون ہے؟"

"تھیٹر میں ۔ ایکٹر ہے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"شہنشاہ کا باعزت ملازم ہے۔"

"کیا وہ شادی کے لائق ہے، یا عم احمد؟"

میرا تو یہی خیال ہے۔ مگر دلہن کی رائے جاننا بھی تو ضروری ہے۔

دلہن تو نہایت حسین ہے۔ مگر ہم فقیر ہیں، یا عم احمد۔

اب میری بولنے کی باری تھی۔ میں اپنے جنونی راز کے بوجھ سے چُور تھی۔ ذُوعا سے مجھے الفت نہیں تو نفرت بھی نہیں تھی۔ اچھا خوش شکل جوان تھا۔ شاید وہ مجھے ذہنی سکون دے سکے... کون جانے مسرت بھی دے سکے۔ خالہ کی نظروں کے محاصرے میں میں نے رُک رُک کر کہا کہ میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی۔

ملازم ہے، ملکیت والا ہے، اور طیب شہرت رکھتا ہے۔'

خالہ نے کہا، "حی خیرہ اللہ۔"

وہ مجھ سے محبت تو کرتی تھی مگر مجھ سے جدا پا کر خوش بھی ہوتی۔ میں اس تنگ فلیٹ سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ سرحان السلالی جیسے حرام زادے سے تو کچھ امید نہ تھی۔

***

زندگی دشوار ہو گئی ہے۔ وقت دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

اس نے مجھے حقارت سے دیکھ کر کہا:

تمہاری ضرورت بند کرنے کی ایک ترکیب مل گئی ہے۔

کیا اس حشیشی نیون کی عادت کا علاج ہو گیا؟

السلالی ہمارے گھر میں محفلیں برپا کرنے پر رضامند ہو گیا ہے۔

میں اس کی بات نہیں سمجھی۔ اس نے اضافہ کیا:

ہم ایک کمرہ ان کے تاش کھیلنے کے لیے تیار کر دیں گے۔ بس رزق ہمارے ساتھ سنگی ہو جائے گا۔

Scanned with CamScanner

میں نے طلال سے کہا:

"گھر میں قمار خانہ بناؤ گے؟"

"ہر چیز کا مذموم ترین طریقے سے دفاع کرتی ہو۔ بس کچھ دوست اکٹھے ہو جاتے ہیں گے۔ اور کیا ہو گا؟"

"لیکن..."

اس نے بات قطع کر کے کہا:

"تم اچھی زندگی گزارنا نہیں چاہتیں؟"

"اور صاف ستھری بھی!"

"اچھی ہوگی تو صاف ستھری بھی ہو جائے گی۔ علامت تو صرف موافقت میں ہے۔"

میں مارے قلق کے آہستہ سے بولی:

"اور عباس کا بھی سوچنا ہے۔"

اس نے غیظ سے جواب دیا:

"اس گھر کا مالک میں ہوں، عباس نہیں۔ تمہارا بیٹا مجھ سے ہے! گھر یہ تو تم بھی جا سکتی ہو"

اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا، اور لپٹ کے چلیں۔

* * *

بادلوں کی کثرت سے غروب میں سورج اس طرح بار بار چھپ جاتا ہے کہ میرا دل بھاری رہتا ہے۔ ہر روز گھر کے نزدیک ایک مرد سیدھی اشولی کے دوران سڑک پر چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ مرد جب کاموں سے بات نہ کرتا ہو تو خود کلامی کرنے لگتا ہے۔ میں تو عباس کی خوش سدی کے خواب دیکھتی ہوں، مگر اس کے پاس خواب دیکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔

* * *

ہم مسرت کے لمحات کو کیوں یاد نہیں رکھتے کہ بعد میں ان کی صداقت کا یقین کر سکیں؟ کیا یہ وہی مرد ہے؟ کیا وہ پُرخلوص تھا جب اس نے کہا تھا:

"میں عمر محمد کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے اتنی مسرت دی جو کوئی بشر مشکل سے برداشت کر سکے۔"

میں نے ناز سے سر کو جنبش دے کر کہا تھا، "مبالغہ مت کرو۔"

اس نے یہی آواز میں جو اب ہمیشہ کے لیے غائب ہو چکی ہے، کہا تھا:

"حلیمہ، اس شخص کی خوشی کا کیا عالم ہو گا جس کا دن عشق و محبت کا ہو"

میں اس سے محبت نہیں کرتی تھی مگر اس کی باتوں سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس کی جذبے کی شدت مجھے گرا دیتی تھی۔

***

مقررہ دن آ پہنچا۔ میرے قلب میں وحشت اور خوف کی امواج۔ میں جلدی حمام میں گئی تھی۔ ام ہانی نے مجھے لباس، کوٹ اور جوتے فراہم کر دیے تھے۔ میں ہیر ڈریسر کے پاس سے مدت سے نظر انداز کیے بال جدید انداز میں سنوار کر واپس آئی تھی۔ اس نے حقارت سے مجھے دیکھ کر کہا تھا:

"جی رندی پن کی رگ دبی نہیں! فقر و فاقہ کے اس زمانے میں تم اس کا استعمال کیوں نہیں کرتیں؟"

میں نے اس رات کا سکون کسی بھی قیمت پر غارت نہ کرنے کا مستحکم ارادہ کر رکھا تھا۔ ہم ہوٹل پہنچے تو ہمارا شایانِ شان احترام کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ ہلالی کی ستائش بھری نظریں مجھ پر جم گئیں۔ میں نے کہا:

"مگر مصنف کہاں ہے؟"

"وہ نہیں آیا۔ مگر اس کے بارے میں میں نے تمھیں کافی بتا دیا ہے۔"

میری ولولہ انگیز امیدیں خاک میں مل گئیں۔ تجدیدِ شباب کی باطنی شعاع چانک بجھ گئی۔ ہم عمر

Scanned with CamScanner

احمد رجل سے ملنے چلے گئے۔ اس نے میشا کی طرف ہمیں ہاتھ اور سو سو تالی دیے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا:

ایام ماضی کی طرح...

اے محمد احمد، یہ کیا کہتا ہے! ماضی کاش کسی طور پذیر نہ ہوتا۔ اس کا واحد ایک ڈرامہ جاتا ہے۔ یہ تذکرہ سے اعتماد کو ختم کر دیتی ہے اور میرے حزن میں اضافہ کر دیتی ہے۔ مناسب وقت پر تم ہال میں داخل ہوئے۔ ہال کھچا کھچ بھرا دیکھ کر خوشی میں میرے منہ سے نکلا:

"ڈرامہ کامیاب ہے!"

میں نے اس کا جواب نہیں سنا۔ پردہ اٹھ رہا ہے۔ واقعات تیزی سے ساتھ ساتھ آ رہے ہیں۔ میری حیات کا ہر حادثہ میری آنکھوں کے سامنے ہے — کچھ بھی نہیں چھوڑا گیا، ہونے والے لمحوں کی یادیں۔ ایک بار پھر میں متہم میں ہوں۔ ہر بار سے کہیں بڑھ کر خود کو مجرم ٹھہرا رہی ہوں۔ خود سے کہہ رہی ہوں اس وقت مجھے اس کو چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ اس موقعے پر مجھے انکار کر دینا چاہیے تھا۔ تو میں محض اس کی شکار نہیں ہوں جیسا کہ سمجھتی آئی ہوں۔ لیکن یہ حرام کا کیسا طوفان ہے جس سے کوئی آشنا نہ تھا؟ یہ مجھے کس عجیب صورت میں پیش کیا جا رہا ہے؟ کیا اس کی میرے بارے میں سچ مچ یہی رائے ہے؟ یہ کیا ہے اے میرے بیٹے؟ تو نے تو باپ سے بڑھ کر اپنی ماں کو غلط سمجھا۔ اور اس سے بڑھ کر غلط کر رہا ہے۔ کیا میں ہی بہت دور خود غرضی کے باعث تیری تیرے سے شادی پر معترض تھی؟ کیسی نسبت کیسا حسد؟ میں نہیں۔ یہ فقط متہم ہے۔ تو نے اپنے باپ کو تقریباً میری زیادتی کا شکار ظاہر کیا ہے۔ وہ خود بھی ماں نے ہونے کسی کی زیادتی کا شکار نہیں ہوا۔ کیا تو نے مجھے رنڈی سمجھا؟ بازاری عورت؟ کیا تو نے خیال کیا کہ میں نے ایک ایک کر کے سونے کی طشت میں میری روح کو شیطان کے پاس لے گئی؟ یہ تیرا تخیل ہے کہ متہم ہے؟ یا عباس، تو نے مجھے قتل کر دیا۔ تو نے اپنے ڈرامے میں مجھے زندہ درگور کر دیا۔ لوگ تالیاں بجا رہے ہیں۔ خوشی کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔

میں تمام میت ہوں۔ کیسے میں مشغول ہوں۔ وہ مجھ سے پوچھتا ہے:

"کیا ہم بھی شریک ہوں؟"

یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ مجھے مشتعل کرنے کی، میرا تمسخر اڑانے کی کوشش کر رہا ہے، میں

نے نفرت سے جواب دیا:

"کیوں نہ شریک ہوں؟"

لیکن در حقیقت میں شریک نہیں ہو سکی۔ مجھ پر سکتہ طاری ہے اور غبار سا بڑھا ہو ہے۔ کانوں میں آوازوں کا تلاطم ہے۔ اجنبی شکلیں بلاوجہ قہقہے لگاتی، موجوں کی طرح آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی ہیں۔ میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ یہ قیامت کا دن ہے۔ آنے دو قیامت کو... قیامت آنے دو! اللہ کے سوا میرے ساتھ کوئی حاکم عدل نہیں کرے گا۔ تو نے قتل کیا، خیانت کی، اور خودکشی کر لی۔ میں تجھے کب دیکھوں گی؟ کیا میں تجھے اب کبھی نہ دیکھوں گی؟

ہم قبر کے قریب بہت بعد میں پہنچے۔ میں دیوں پر گر پڑی۔ وہ آتش دان روشن کرنے لگا۔ میں نے سنا کہ پوچھ رہا ہے:

"ڈراما پسند آیا؟"

میں نے سرد مہری سے کہا:

"دیکھنے والوں کو پسند آیا..."

"اور موضوع؟"

"موضوع جاندار تھا!"

"ہم جیسے ہیں ویسا ہی نہیں پیش کیا؟"

"نفرت کرنے والے طارق رمضان کی طرح مت سوچو۔"

"ہر شے حقیقت سے بڑھ کر حقیقی تھی۔"

میں نے غیظ سے کہا:

"ڈرامے میں مجھے جیسا دکھایا گیا اس کا حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں۔"

وہ کرب ہنسی ہنسا۔ میں نے اپنے عذاب کو دباتے ہوئے کہا:

"یہ تخیلاتی کہانی ہے۔"

"ہر کردار اصل زندگی کے مطابق..."

"جدت یہی ہے کہ تخیل کثرت سے ہوتا ہے اور واقعہ محض تھوڑا سا۔"

"پھر تمہیں اس طرح کیوں پیش کیا؟"

Scanned with CamScanner

"مصنف آخر ہماری اولاد ہے۔"

"میرا خیال ہے وہ تم سے محبت کرتا ہے، تمہارا احترام کرتا ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے!"

"مگر تمہاری تلملاتی نظریں تو کچھ اور کہہ رہی ہیں۔"

"میں جانتی ہوں کہ میں صحیح کہہ رہی ہوں۔"

"تم کڑی دل سے ساتھ ہی! سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس قدر گر جاؤ گی!"

میں نے غصے میں کہا:

"ایسے منحوس خیالات کو اپنے پاس رکھو۔

اس ولد نے ہمیں جیل تک پہنچایا۔"

"اس نے اپنے آپ کو نہیں، مجھے پیش کیا ہے۔"

"خود کیسا مثالی بنتا تھا..."

قلبی یاس سے مغلوب ہوتے ہوئے میں نے کہا:

"وہ وہیں آ جائے تو اس کے ساتھ بھی جاؤں گی۔"

میں ساتھ والی ... کمرے میں آ گئی۔ دروازہ بند کیا اور زار و قطار رونے لگی ... تو نے اپنی ماں کو کیوں نہیں جانا، اے عباس...؟

***

وہ سہ حسینوں سے ... میں ... ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا:

"کاؤنٹر ہو گا؟ مجھے چوٹ لگ گئی ہے۔"

میں کمرے میں گئی کہ کچھ لے لوں۔ میں نے کہا، ...

"شکریہ۔ میں پہلے ہی تجاوز کر گیا۔"

"اور آج شام سے تقدیر نے بھی ساتھ نہیں دیا۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے خود کو سنبھالا اور میری طرف دیکھا۔ اس نے دروازے کی کنڈی لگا

دی- میں مدافعت کے لیے تیار ہو گئی- وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولا:

'حلیمہ... تم کتنی حسین ہو... وہ میرے نزدیک آ گیا- چلو اوپر چلیں-'

میں غیظ و غضب سے تیوریاں چڑھا کر پیچھے ہٹی- اس نے کہا:

"کیا تُو اس حیوان سے وفادار رہنا چاہتی ہے؟"

'میں ایک شریف عورت ہوں، اور ایک ماں ہوں-'

میں نے لپک کر دروازہ کھول دیا تھا- لمحہ بھر کے تردّد کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا اور گھر سے بھی چلا گیا تھا-

***

ان میں سے کئی ایک نے مجھے پھانسنے کی کوشش کی تھی مگر منہ کی کھائی تھی- رنڈی؟ یہ سچ ہے کہ ایک مرتبہ میرے ساتھ زنا کیا گیا تھا... اور میں تمھارے باپ کے ساتھ سوئی- گو زیادہ عرصے نہیں- اس کے بعد میری زندگی اور یہ تجرّد... میں رنڈی نہیں راہبہ ہوں میرے بیٹے! کیا میری یہ کاذب تصویر تیرے باپ نے کھینچی تھی؟ مجھ سی بد نصیب، محروم عورت کی؟ تُو کیوں کر ایسا تصور کر سکا؟ میں تجھے ہر بات بتاؤں گی- مگر تُو واپس کب لوٹے گا؟

***

ہر رات وہ رنگ رلیاں منانے اس بیت القدیم میں آ جاتے تھے- ان کے افعال سے سیدی الشعرانی کے مزار کی سمت جانے والی راہ ناپاک ہو رہی تھی- ان کی فاجر نگاہوں کو پڑھ کر میرا دل ڈوب جاتا اور عباس کے لیے فکرمند ہو جاتی جو اپنے کمرے میں موجود ہوتا تھا- مگر تُو تو میرا ہے میرے بیٹے! فقر کی دلدل میں تجھے کیوں کر رکھوں؟ میں ان کے سامنے خوش دلی کا تصنّع کرتی اور انھیں قرض کی رقم سے آراستہ کیے ہوئے کمرے میں لے جاتی- میرا کام ان کی شراب و طعام کے لیے ساقی گری تھا، اور میں جانتی تھی کہ یہ زوال کے پھسلواں راستے پر ہمارے پہلے قدم ہیں-

Scanned with CamScanner

میرے بیٹے، فکر نہ کر۔ یہ تیرے باپ کے دوست ہیں۔ کل مُردوں کے یہی افعال ہیں۔

"لیکن امی، تمھارا وہاں کیا کام؟"

وہ میرے تھیٹر کے دوست ہیں۔ نہیں نظر انداز کرنا میرے لیے مناسب نہیں،

منان سہ دست طیب اور ماسون سے، سرجان السلالی نے میز کے ساتھ اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا جہاں اسماعیل پتے پھینٹ رہا تھا۔ وہ دھس کر بولا:

"طارق اور تمیہ کا ساتھ بیٹھنا ممنوع ہے..."

کرم کھانے کی میز کے پاس نقدی کے صندوقچے کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا۔ طارق نے ہنستے ہوئے کہا:

"نذر کا صندوق، یا سیندی کرم یونس..."

سرجان مذاقاً کہتا ہے:

"معدے کی موت سے علاوہ کوئی موت نہ ہو!"

کرم سیاہ چائے میں الیون گھول رہا ہے۔ آہ وہ ابتدا، جس کی کوئی انتہا نہ تھی!

* * *

میں اپنی کال کوٹھڑی میں لوٹ آئی ہوں، جیسے ہی میں نے وہ لباس بی بی کی ملکہ کو لوٹا دیا ہے جسے پہن کر تھیٹر گئی تھی۔ وہ بیٹھا ہے۔ صورت پر مُردنی طاری کیے... خالی خالی چہرہ لیے۔ مونگ پھلیاں اور تربوز کے بیج بیچتا رہتا ہے، اور رسالے کی شناخت میں ہر گاہک کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ میں چپکے چپکے تقریباً خود کلامی کرتی ہوں:

"ڈراما کامیاب رہا، بس یہ اچھی بات ہے۔"

وہ کہتا ہے:

"کم از کم ایک ہفتے سے پہلے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"دیکھنے والوں کا ردِ عمل ہر شے پر حاوی ہے..."

"السلالی نے اُسے معاوضہ کتنا دیا ہوگا؟"

پہلی تحریر کا معاوضہ سب سے کم ملتا ہے۔ عباس مادی چیزوں سے بے نیاز ہے۔
اس پر وہ تمسخر سے قہقہہ مار کر ہنستا ہے۔ میں اس پر لعنت بھیجتی ہوں۔

***

حجرۂ مت کی وسعت میں شعر کا دیوتا متمکن ہے اور مسکراتے ہوئے ہم پر نظر ڈالتا ہے۔
"خوش آمدید حلیمہ! تو تمہارے بیٹے نے نیا ڈراما لکھا ہے؟"
"ہاں۔"
اس نے عباس سے مخاطب ہو کر کہا:
"پہلا تو قطعی بے کار تھا۔"
عباس نے جواب دیا:
"آپ کا تبصرہ میرے لیے ہمیشہ سودمند ہوتا ہے۔"
"تمہاری والدہ کی خاطر میں ہمیشہ تمہاری ہمت افزائی کروں گا۔"

***

جشنِ اختتام تک پہنچا تو عیاں ہو گیا کہ ڈراما کس درجہ کامیاب ہے۔ اس سے قبل تھیٹر کے ٹکٹ اس طرح کبھی فروخت نہیں ہوئے تھے۔ اور سکے مہینوں میں بدلتے گئے۔ مصنف کب ظاہر ہو گا؟ ... اس کی میرے بارے میں جو بھی رائے ہو۔ میں سب آلام برداشت کر لوں گی... مگر وہ ہے کہاں؟ میں مرد کو سنانے کے لیے زور سے کہتی ہوں:
"بے شک تھیٹر والوں کو علم ہو گیا ہو گا کہ ہمارا غائب ہونے والا کہاں ہے۔"
"آخری بار میں ایک عشرہ پہلے تھیٹر گیا تھا۔"
میں اس سے کسی شے کی طالب نہیں اور اس کی زبان کے حملے سے خائف ہوں۔ وہ اکثر تھیٹر جایا کرتا ہے، جبکہ افتتاحی رات کے بعد میری وہاں جانے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی۔

Scanned with CamScanner

دوسری صبح وہ دوبارہ گیا۔ وہ خوشگوار گرم دن تھا۔ سورج چمک رہا تھا اور میرا دل امید سے لبریز تھا۔

* * *

میں کچھ بھی عجیب و غریب تصور کر سکتی تھی مگر یہ کہ عباس کی شادی کا سین۔ اب عباس چلا جائے گا اور طارق میرے گھر میں مقیم رہے گا۔ اے خدا تیرا انصاف کہاں ہے!

"عباس! یہ تم سے دس سال عمر میں بڑی ہے۔ اس کی شہرت کی ایک تاریخ ہے۔ کیا تم اس کا مطلب نہیں سمجھے؟"

وہ متبسم ہو کر حماقت سے بولا تھا:

"افسوس کہ آپ محبت کے معنی نہیں سمجھتیں۔"

باطنی تلخی میری روح میں سما گئی تھی اور مجھے ساری مدفون مسرتیں یاد آ گئی تھیں۔ اس نے مزید کہا تھا:

"ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔"

"انسان اپنے ماضی سے نجات نہیں پا سکتا۔"

"ہر چیز کے باوجود تحیہ طاہرہ ہے۔"

میں انصاف نہیں کر رہی تھی۔ میں اپنے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مگر میری خواہش تھی کہ عباس کو بہتر زندگی ملے۔ بس یہی کل معاملہ تھا۔ تحیہ میرے پاس آئی تھی۔ اس کے چہرے پر خزاں تھا، مگر عزم بھی۔ اس نے مجھ سے التجا کی تھی:

"میری خوشی کی راہ میں نہ آئیے۔"

میں نے حدت سے کہا تھا:

"تو معصومیت کا سرقہ کر رہی ہے۔"

"میں اس کی وفاشعار بیوی بنوں گی۔"

"مگر؟"

میرے لہجے کی تیزی کے باعث غصے سے اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر کہا تھا:

"قسمت میں ہر عورت کی ابتدا سرحان السلالی ہی سے ہوئی ہے۔

میرا دل ڈوب گیا تھا۔ تو سب لوگ جانتے ہیں؟ یا ظاہر کرتے ہیں کہ جانتے ہیں؟ لگتا تھا جیسے وہ مجھے دھمکی دے رہی ہو۔

بہت خوب! لیکن ہر شے کے باوجود، بیٹا تو وہ میرا ہی رہے گا۔

***

یہ مرد آخر آج اتنی دیر کیوں لگا رہا ہے؟

اس تنگ گلی کی دیواروں سے سورج کی آخری شعاعیں رخصت ہو رہی ہیں۔ آخر بات کیا ہے؟ کیا اسے اس مکان کا پتا چل گیا جہاں عباس روپوش ہے، اور وہ وہاں چلا گیا؟ کیا وہ دونوں ساتھ واپس آئیں گے؟ میں اس کے مہذب اور وجیہہ چہرے کا تصور کر سکتی ہوں جب وہ مجھ سے معذرت کرے گا۔ یہ ممکن نہیں کہ میرا یہ عذاب ابدی ہو۔ اس ڈرامے نے میری کمزوریوں کی جانب اشارہ ضرور کیا ہے مگر میں نے اپنے قلب کو ہمیشہ استغفار کیا ہے۔ کیا میں نے اپنی کمزوریوں کا کافی کفارہ ادا نہیں کر دیا؟ کون تصور کر سکتا تھا کہ طاہرہ اور حسنین حلیمہ ایسی زندگی بسر کریں گی؟ میرے دل میں اب محبت اور برداشت کے سوا کچھ نہیں۔ یا رب! میں تیری عداوت قبول کرتی ہوں۔ حتیٰ کہ کرم کی ابتلا میں اس تنک کی مغفرت کرتی ہوں۔ میں اس کے وحشیانہ سلوک کی مغفرت کرتی ہوں۔ جب وہ میرے روپوش حبیب کا بازو تھامے ہوئے آئے گا تو میں ہر بات معاف کر دوں گی۔ میرا قلب عجیب مسرت سے منور ہو گیا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کیفیت مدھم پڑتی گئی۔ ایک گاہک نے سودے کا لفافہ لے جاتے ہوئے کہا:

"تم کسی دوسری دنیا میں ہو، یا ام عباس...."

مسجد سے عصر کی اذان بلند ہوئی اور خریف کا مختصر دن تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ یہ تاخیر بلاسبب نہیں ہو سکتی۔ وہ اس انتظار کے لائق نہیں، لیکن آخر اب تک کیوں نہیں لوٹا؟ سرد ہوا

میں شمع بجھا کی اور میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب دوبارہ بیٹھنے کا ارادہ نہ تھا۔ میرا قلب متغیر ہو چکا تھا۔ اس نے بے رحمی کے ساتھ مجھے دھوکا دیا ہے۔ اب صبر نہیں ہوتا... میں اسے تلاش کر کے جاؤں گی... تھیٹر کے دروازے کے قریب سب سے پہلے فواد شلبی دکھائی دیا۔ اس نے غیر معمولی نرمی سے میرا استقبال کیا اور کہنے لگا:

"خدا کرے یہ خبر جھوٹی ہو..."

میری امید کی آخری کرن معدوم ہو گئی۔

"کیسی خبر؟"

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ وہ خاموش رہا۔ اس پر میں نے کہا:

"کیا عباس کے متعلق؟"

اس نے خاموشی سے سر ہلا دیا اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ کیفے ٹیریا کے دیوان پر بیٹھی ہوں۔ محمد حمد برجل میری تیمارداری کر رہا تھا۔ فواد شلبی اور طارق رمضان بھی موجود تھے۔ محمد احمد نے مجھے پوری خبر ماتمی آواز میں سنائی اور اس جملے پر اختتام کیا:

"مگر اس بات کا کسی کو یقین نہیں آ رہا..."

فواد اپنی کار میں مجھے گھر چھوڑنے آیا۔ راستے میں وہ سوچتے ہوئے بولا:

"اگر اس نے خودکشی کی ہے تو لاش کہاں ہے؟"

میں نے سوال کیا:

"تو پھر اس نے وہ خط کیوں لکھا؟"

اس نے جواب دیا:

"یہ اس کا راز ہے۔ وقت آنے پر ہمیں معلوم ہو جائے گا۔"

مگر میں جانتی ہوں، میرا دل جانتا ہے... عباس نے خودکشی کر لی ہے، اور عمر بانسری پر ایک دھن بجا رہا ہے۔

عباس کرم یونس

بیت القدیم میری اول عمر کا واحد رفیق تھا۔ مجھے پورے کا پورا حفظ تھا۔ اس کی وسیع قوس دار چوکھٹیں، چھوٹے قبضوں والا سرخ، سبز اور نقشی روغن کاری کے شیشوں والا دروازہ، بیٹھک کی آہنی سلاخوں والی کھڑکی اوپر اور نیچے کی سیڑھیوں کے کمروں کی دوہری چھتیں اور ان میں لگے روغن کیے ہوئے چوبی شہتیر، اور معصرانی سلوں والے فرش، پرانے صوفے، گدّے، چٹائیاں اور قالین۔ اور چوہوں اور لال بیگوں کی فوجیں، اور چھپکلیاں۔ چھت پر دھلائی کے کپڑے ٹانگنے کے لیے ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے تار جیسے ٹرام کے لیے سڑکوں پر لگے ہوتے ہیں۔ وہاں سے دوسری چھتیں نظر آتی تھیں جن پر عورتیں اور بچے ہوتے تھے۔ میں اس گھر میں اکیلا پھرا کرتا تھا، اپنا سبق یاد کرتا ہوا، کوئی شعر پڑھتا ہوا، یا شیکسپئر کا کوئی مکالمہ دہراتا ہوا۔ اس گھر کے درودیوار میں میری اکیلی آواز گونجتی رہتی۔ میں پہروں چھت سے نیچے تنگ گلی میں خلق کو گزرتے دیکھا کرتا۔ میرا دل کسی رفیق کی حسرت کرتا تھا۔ کوئی لڑکا پکارتا:

"نیچے اترو۔"

میں جواب دیتا:

"دروازہ مقفل ہے، اور چابی ابی کے پاس۔"

مجھے دن رات تنہا رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ میں ذرا بھی خوف نہ کھاتا تھا، شیاطین سے بھی نہیں۔

ابی تمسخر سے کہتے:

"ابن آدم سے بڑھ کر کوئی شیطان نہیں۔"

امی جلدی سے اضافہ کرتیں:

تم فرشتے بننا۔

فراغت میں میں چوہوں یا چھپکلیوں کا تعاقب کیا کرتا۔

ایک دن امی نے بتایا تھا:

تم چھوٹے تھے تو ہم تمھیں چمڑے کے گہوارے میں لٹا کر تھیٹر لے جایا کرتے تھے اور ٹکٹ گھر کے پاس ایک لکڑی کی بنچ پر بٹھا دیتے تھے۔ میں نے کتنی ہی بار تمھیں تھیٹر میں دودھ پلایا ہے۔ ظاہر ہے وہ زمانہ تو مجھے یاد نہیں لیکن وہ عرصہ جب میں چار برس سے لگ بھگ رہا ہوں گا، میرے حافظے میں کچھ کچھ موجود ہے۔ میں تھیٹر میں اسٹیج کے آگے پیچھے گھومتا پھرتا تھا جہاں اداکار اپنے مکالمے یاد کر رہے ہوتے تھے۔ میرے کانوں میں خوب صورت ترین اشعار پڑتے اور گراں ترین جنسی فقرے بھی۔ یہ بس تعلیم تھی جو مجھے والدین سے کبھی مل سکتی جو ہمیشہ یا تو سوتے یا کام کرتے رہتے تھے۔ ہر ڈرامے میں افتتاحی شب میں اپنے ابی کے ساتھ تھیٹر میں موجود ہوتا تھا ــــ یا تو تھیٹر کی روشنیوں سے خیرہ، یا سوتا ہوا۔

اسی زمانے میں مجھے میری پہلی کتاب کا تحفہ ملا تھا: ابن سلطان اور ساحرہ۔ یہ کتاب مجھے فواد شلبی نے دی تھی۔ یہ ڈراموں میں خیر اور شر کو بالمقابل پانے کا میرا اولین تجربہ تھا۔ میرے والدین کے پاس میری تربیت کے لیے وقت نہیں تھا۔ میرے باپ کو تو تعلیم اور تربیت میں دل چسپی ہی نہ تھی اور امی یہ کہنے پر قانع تھیں کہ فرشتے بنو۔

وہ مجھے سمجھاتیں کہ فرشتہ بننے کا مطلب خیر سے محبت کرنا، کسی کو ضرر نہ پہنچانا، صاف ستھرے رہنا اور صاف کپڑے پہننا ہے۔ میرے حقیقی استاد سب سے اول تھیٹر، پھر کتابیں، اور پھر ایسے لوگ تھے جن کا میرے والدین سے کوئی رشتہ نہ تھا۔

جب میں نے مدرسے جانا شروع کیا تو گویا مجھ پر جنت کے دروازے کھل گئے۔ مدرسے نے مجھے تنہائی سے نجات دلا دی، گو وہاں مجھے ہر قدم پر خود ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ میں علی الصبح بیدار ہوتا، رات کو تیار کیے گئے اور خوان پوش سے ڈھک کر رکھے اُبلے انڈوں اور پنیر کا ٹھنڈا ناشتہ کرتا، کپڑے پہنتا اور اپنے سوتے ہوئے والدین کی نیند میں خلل ڈالے بغیر خاموشی سے گھر سے نکل جاتا۔ دوپہر کو واپس آتا تو وہ لوگ کام پر جانے کے لیے تیار ہو رہے ہوتے۔ میں گھر میں اکیلا مدرسے کا کام کرتا، کوئی کھیل کھیلتا یا کتابوں سے دل بہلایا کرتا۔ پہلے صرف تصویریں

Scanned with CamScanner

دیکھتا اور پھر لکھے ہوئے حروف کو پڑھتا۔ میں محمد عبدہ کی فیاضی کو کبھی فراموش نہیں کروں گا ـــ وہ پرانی کتابیں بیچنے والا جو مسجد سیدی الشعرانی کے پاس سڑک کے کنارے دکان لگاتا تھا۔ اور پھر رات کے کھانے میں پنیر اور حلوہ کھا کر میں سونے کے لیے لیٹ جاتا۔ اس طرح میں عصر کے وقت سے پہلے دن بھر والدین کی صورت بھی نہیں دیکھ پاتا تھا، اور وہ مختصر وقت بھی ان کی جانے کی تیاریوں میں گزر جاتا تھا۔ مجھے ان کا انس اور توجہ اس قدر کم نصیب ہوتی تھی کہ میں شاید اس باعث ان سے اور بھی زیادہ محبت کرنے لگا تھا۔ میری امی کی خوب صورتی، ان کی نرم مزاجی اور محبت مجھ پر سحر کر دیتی تھی اور ان کے ان مہربان فرشتہ ہونے کے تصور سے میں سرشار ہو جاتا تھا۔ اسی طرح مجھے ابو بھی شاہ دار نظر آتے تھے ـــ اس قدر بذلہ مذاق، ہنس مکھ اور شفیق! وہ جو تھوڑا سا وقت ہمارے ساتھ گزارتے سبھی تنبیہوں اور نصیحتوں کی نذر ہوتا۔ بس کبھی کبھی وہ مجھے یاد دلاتے:

"اکیلے رہنے میں خوش رہو۔ تم گھر بھر کے بادشاہ ہو۔ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے؟ تمھارا باپ بھی تمھاری طرح اکلوتا تھا اور خود ہی پر اعتماد کرتا تھا۔ یہ تھا تمھارا باپ۔ اور تم اس سے بڑھ کر شان دار نکلو گے..."

امی جلدی سے اضافہ کرتیں:

"یہ فرشتہ ہے۔" پھر مجھ سے کہتیں، "فرشتے بننا، یا حبیبی!"

ایک بار میں نے ابا سے پوچھا تھا:

"کیا دادا دادی آپ کو تنہا چھوڑ دیتے تھے؟"

انھوں نے جواب دیا تھا:

"تمھارے دادا؟ وہ تو مجھ سے تعارف ہونے سے پہلے آخرت کو سدھار گئے تھے... لیکن تمھاری دادی، وہ گھر پر کام کرتی تھیں۔"

امی نے ابی کو گھور کر دیکھا تھا اور مجھے احساس ہوا تھا کہ ان الفاظ میں کوئی راز پوشیدہ ہے۔

امی نے کہا تھا:

"تمھارے دادا کا جوانی ہی میں انتقال ہو گیا تھا، اور پھر دادی بھی ان سے جا ملی تھیں۔ اس لیے گھر میں تمھارے ابو تنہا رہ گئے تھے۔"

Scanned with CamScanner

میں نے پوچھا تھا:

"اسی گھر میں؟"

"ہاں۔"

اور ابی نے کہا تھا:

"اگر دیواریں بول سکتیں تو تم سے عجب حکایات بیان کرتیں۔"

وہ تنہائی کا گھر تھا، لیکن ہم تنگی کا شکار نہیں تھے۔ اس وقت بھی ابو اور ابی خوش گوار روحیں تھے۔ گھر آ کر ملے تو وہ ہر شام کے مخصوص پتے میں ایسے ہی دکھائی دیتے تھے۔ وہ آپس میں باتیں کرتے، ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے اور مجھ سے دونوں گہری محبت کرتے تھے۔ ابی اکثر زیادہ کھل کر باتیں کرنے پر مائل رہتے مگر ابو انہیں نظروں ہی نظروں میں تنبیہ کر دیتیں۔ میں اکثر اس بات پر غور کیا کرتا کہ ابو انہیں کیا کہنے سے باز رکھتی ہیں۔ ان سے جدائی کا وقت میرے لیے صبر آزما ہوتا تھا اور میں بے تابی سے تعطیلات کے دن کا انتظار کیا کرتا جب میں شام کو ان کے ساتھ ڈرامہ دیکھنے تھیٹر جا سکتا تھا۔ پڑھنے کی استعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ مجھ میں کتابوں کی شناسائی بڑھتی گئی تھی۔ کتابیں خریدنے کے لیے میں زیادہ جیب خرچ مانگنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے کمرے میں بچوں کی پرانی کتابوں کی ایک چھوٹی سی لائبریری بنا لی تھی۔ ابی مجھ سے پوچھتے:

"تم تھیٹر میں ڈرامہ دیکھنے پر اکتفا نہیں کرتے؟"

لیکن میں ڈرامہ دیکھنے پر مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ میرے خواب مجھے نئے آفاق کی جانب لے جا رہے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے کہہ ہی دیا:

"میں تھیٹر کے لیے ڈرامے لکھنا چاہتا ہوں۔"

ابی نے قہقہہ لگا کر کہا:

"اس سے بہتر ہے ڈاکٹر بنو۔ یہ افضل ہے اور منفعت بخش بھی۔"

میں نے کہا:

"میں نے اپنے ذہن میں ایک کہانی بھی بنا لی ہے۔"

"واقعی؟" ابی نے کہا۔

میں نے انہیں فاؤسٹ کی کہانی کا خلاصہ سنا دیا۔ میں نے اس میں اپنی طرف سے کوئی

Scanned with CamScanner

اضافہ نہیں کیا تھا ماسوا اس فرق کے کہ ہیرو کو اپنے سِن کا لڑکا بنا دیا تھا۔ میں نے پوچھا:

"مگر لڑکے نے شیطان پر کیوں کر فتح پائی؟"

ابی نے کہا:

"آدمی شیطان پر فتح شیطانی وسائل ہی سے حاصل کرتا ہے۔"

امی نے غصے میں چیخ کر کہا:

"ایسے افکار اپنے ہی پاس رکھو۔ دیکھ نہیں رہے تم ایک فرشتے سے بات کر رہے ہو؟"

اوائلِ عمر ہی سے میں فن اور تحریر سے عشق کرنے لگا تھا۔ اپنی تنہائی کی لامتناہی ساعتوں میں، میں ان کے بارے میں بلند آواز سے طویل خود کلامیاں کرتا۔ ان کے بارے میں میں نے اپنے ہم جماعت لڑکوں سے بھی علم حاصل کیا۔ میں اپنے ہم جماعتوں میں خاصا ممتاز تھا۔ ان میں زیادہ تر لچے لفنگے تھے۔ استادوں سے نالاں ہوتا تو چیخ کر کہتا:

"ارے چکلے کی اولادو!"

مگر ان میں ایک گروہ مثالی لڑکوں کا بھی تھا اور میں انہیں سے میل جول رکھتا تھا۔ ہم نے مل کر ایک "جمعیت اخلاقیہ" قائم کر لی تھی اور ہم مبتذل گفتگو کی جم کر مخالفت کرتے تھے۔ ہم مصر الثورۃ الجدیدۃ کا قومی ترانہ گاتے تھے جس پر ہمیں صدقِ دل سے ایمان تھا۔ ہم میں سے بعض نے شجاعت کے جوہر دکھانے کے لیے خود کو عسکری یا سیاسی میدان کے لیے وقف کرنے کی قسم کھائی۔ میرا خیال تھا کہ تھیٹر بھی جوہرِ شجاعت کے جھنڈے گاڑنے کے لیے مناسب میدان ہے اور میرے لیے موزوں بھی، کیوں کہ میں ابتدائی جماعتوں ہی میں نگاہ کمزور ہونے کے باعث چشمہ لگانے لگا تھا۔ ہمارے درمیان اور جو بھی فرق رہے ہوں لیکن ہم سب کے خوابوں میں ایک مثالی دنیا سمائی ہوئی تھی جس کے ہم ممتاز ترین باشندے تھے۔ یہاں تک کہ مصر اسرائیل جنگ نے بھی ہماری مثالی دنیا اور آدرش کا بال بیکا نہ کیا تھا۔ جب نعرے وہی تھے اور ہمارے رہنما وہی تھے تو ہزیمت ہمارا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ لیکن امی کا چہرہ مرجھانے لگا تھا اور وہ زیرِ لب ایسے کلمات کہنے لگی تھیں جو میں سمجھ نہیں پاتا تھا۔ ابی اپنے شانوں کو جھٹک کر بات ٹالتے رہتے تھے گویا کوئی بات ہی نہ ہو، یا پھر مضحکہ خیز آواز میں چیخ چیخ کر قومی ترانہ گانے لگتے:

بلادی، بلادی، فداک دمی

(اے وطن، اے وطن، تجھ پر اپنا خون بہایا)

جب سٹر چند دنوں کے لیے بند کر دیا گیا تو پہلی بار مجھے دن بھر امی اور ابا کے ساتھ رہنے کی مسرت نصیب ہوئی۔ ابا مجھے ایک دن شارع محیش کے ایک قہوہ خانے میں بھی لے گئے تھے۔ جنگ میں ہر سمت سے کچھ عجیب و غریب نقوش کو سمیٹ رہی تھی، لیکن بہت مختصر عرصے کے لیے۔

•••

امی نے پیالی میں چائے ڈالتے ہوئے کہا:

"عباس، ہمارے یہاں ایک شخص کرائے دار ہے۔"

میں نے جھجکتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ انھوں نے کہا:

"تمھارے ابا کا دوست ہے۔ تم بھی اسے جانتے ہو۔ طارق رمضان۔"

"وہ اداکار؟"

"ہاں۔ اسے اپنا پرانا مکان چھوڑنا پڑا ہے۔ آج کل مکان ملتے نہیں ہیں۔ ابھی تک کوئی مناسب مکان نہیں مل سکا ہے۔"

"وہ بڑا بہت بدکار ہے۔ بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

"لوگوں کو ایک دوسرے کے کام آنا چاہیے۔ اور تم تو فرشتہ ہو یا حبیبی!"

ابا نے کہا:

"وہ ظہر کے وقت آئے گا اور عصر تک سوتا رہا کرے گا۔ اس طرح اس کے واحد کمرے کے سوا گھر تو پھر بھی تمھاری مملکت خاص رہے گا۔"

گھر میں اس کے وجود کا مجھے کبھی کوئی خاص احساس نہیں ہوا۔ عموماً وہ میرے والدین کے ساتھ پان کے فوراً بعد چلا جایا کرتا تھا۔ وہ شکل سے بدتہذیب نظر آتا تھا اور ناشائستہ زبان استعمال کرنے کا عادی تھا۔ میرے والدین کی خوشنودی کی خاطر وہ مجھ میں خصوصی دل چسپی لیتا مگر میرے دل میں اس کے لیے بالکل احترام نہ تھا۔ ایک دن میری کتابیں دیکھ کر کہنے لگا:

"مدرسے کی کتابیں ہیں؟"

امی نے فخر سے کہا:

"ادب اور تھیٹر کی کتابیں ہیں۔ تم مستقبل کے ڈراما نگار سے مخاطب ہو۔"

اس نے کہا:

لعنت ہو تھیٹر پر! اس سے تو میں کباڑی یا قصاب ہوتا تو اچھا تھا۔

اس پر میں نے پوچھا:

"آپ ہمیشہ چھوٹے رول کیوں کرتے ہیں؟"

اس نے اچانک کھانس کر کہا:

"قسمت! ... میری تقدیر تو یہی ہے کہ اگر تمھارے ابی کی مہربانی نہ ہوتی تو عومی بیت الخلا میں سونا پڑتا۔"

امی بولیں:

"ایسی باتوں سے ہمارے پروفیسر کو خوف زدہ مت کرو طارق!"

اس نے ہنس کر کہا:

"ڈراما نگار کو ہر چیز کا علم ہونا چاہیے۔ خاص طور پر شر کا۔ تھیٹر کا مسیح شر ہی ہے۔"

میں نے سادہ لوحی کے جوش سے کہا:

"مگر خیر کو دائمی فتح ملتی ہے۔"

اس نے جواب دیا:

"ہاں... تھیٹر میں..."

***

جس طرح رات اترتی ہے ویسے ایک مبہم سا تغیر ان پر چھاتا جا رہا تھا۔ نہ ان کی خاموشی وہ خاموشی تھی، نہ ان کا کلام وہ کلام تھا۔ نہ میرے ابی وہ ابی رہے نہ میری امی وہ امی تھیں۔ ان کے درمیاں کون سا تاریک راز حائل ہو گیا تھا؟ امی کی بشاشت رخصت ہو گئی تھی اور ابی، جو پہلے اسے خوش مزاج تھے، ہر وقت قہقہے لگاتے رہتے تھے، ہر چیز کا مذاق اڑاتے اور ہر ایک سے خندہ پیشانی

سے ملتے تھے، اب یہ سی ذات میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ امی کے برتاؤ میں یوں تو وہی محبت اور حلیمی تھی مگر اب اس میں ایک یسا طلاں شامل ہو گیا تھا جو وہ مجھ سے چھپا نہیں سکتی تھیں۔ میری روح میں یک انجان خوف اور قلق اتر نے لگا تھا۔ اور ایک دن چائے کے وقت میں نے سنا کہ طارق ابی کو مشورہ دے رہا ہے:

"شیطان سے مغلوب نہ ہو جانا۔"

امی نے تلخی سے کہا:

"تمہارے سوا دوسرا کوئی شیطان نہیں۔"

ابی نے احتجاج کیا:

"میں بچہ نہیں ہوں!"

میں نے اندازہ لگایا کہ میری موجودگی کے باعث امی نے مزید کچھ نہیں کہا۔ ان کے جانے کے بعد مجھ پر ایک عجب اُداسی اور احساسِ زیاں چھا گیا۔

یہ بات تکلیف دہ حد تک صاف تھی کہ کچھ نہ کچھ ہو گیا ہے۔ میں نے امی سے پوچھنا چاہا لیکن وہ ہر بار ٹال گئیں۔ وہ اور ابی جب بھی بڑے کمرے میں تنہا ہوتے، ان کے درمیان تلخ و ترش گفتگو ہونے لگتی۔ میں کھلے دروازے کے پیچھے دبک کر سنتا۔

"تمہارا اب بھی علاج ہو سکتا ہے۔"

"میرے ذاتی معاملات میں دخل مت دو!"

"لیکن تمہارے فعل کا اثر ہم سب پر پڑتا ہے، تمہیں اس کا احساس نہیں؟"

"مجھے وعظ سننے سے نفرت ہے۔"

"افیون نے میری خالہ کے زوج کو ہلاک کر دیا تھا۔"

"ثابت ہوا کہ اس کے فائدے بھی ہیں!"

"تمہاری شخصیت میں تغیر آ گیا ہے۔ ناقابلِ برداشت ہو گئے ہو تم!"

مجھے خوف نے جکڑ لیا۔ میں جانتا تھا افیون کیا ہوتی ہے۔ میں نے اس کے بارے میں ایک ڈراما شکار دیکھ رکھا تھا۔ افیون کھانے والوں کی خراب حالت کے مناظر مجھے پہروں پریشان کرتے رہے تھے۔ کیا ابی اُن جیسے ہو جائیں گے؟ کیا میرے پیارے ابی فنا ہو جائیں گے؟ ابی اور طارق

رمضان کے لوٹنے سے پہلے میں ابی کے ساتھ تنہا ہوا تو میں نے انہیں افسردگی سے دیکھا۔

انھوں نے پوچھا:

"کیا بات ہے عباس؟"

میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

"میں سب جانتا ہوں۔ یہ بہت خطرناک چیز ہے۔ مجھے وہ ڈراما شکار ٹھوڑا شور ہی ہے۔"

کیسے جانتے ہو؟ نہیں نہیں بیٹا، جو تمھارا خیال ہے وہ بات نہیں۔

اسی وقت ابی داخل ہوئے۔ وہ غصے میں تھے اور صاف ظاہر تھا کہ انھوں نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔ انھوں نے چیخ کر کہا:

"اے ولد! اپنی حد میں رہ!"

میں نے کہا:

"میں آپ کے لیے خوف زدہ ہوں۔"

اس بات پر وہ اس قدر خوفناک آواز میں چیخے جو میں زندگی میں پہلی بار سن رہا تھا۔

"خاموش! ورنہ میں تیرا سر توڑ دوں گا!"

اس لمحے میرے نزدیک وہ ایک جانور میں تبدیل ہو گئے۔ میرا طویل سہانا خواب چکنا چور ہو گیا۔ میں اپنے کمرے میں پلٹ آیا اور ایک ایسا ڈراما سوچنے لگا جس کا آغاز طارق رمضان کے گھر سے نکالے جانے سے اور انجام میرے ابی کے توبہ کرنے پر ہوتا تھا، جس میں ظاہر ہے میری کوششوں کا دخل تھا۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ خیر کو فتح یقیناً نصیب ہو گی، بس کوئی ابی کی مدد کر دے۔ لیکن حالات اور بھی بگڑتے گئے۔ ابی ہم سے دور ہوتے چلے گئے۔ میں پہچان بھی نہ سکتا تھا کہ یہ وہی پہلے والے ابی ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو ہم سے بالکل علیحدہ کر لیا۔ صرف ہم پر گرجنے برسنے کے وقت وہ ہم سے کلام کرتے۔ میں ان سے ڈرنے اور دور دور رہنے لگا۔ امی ملول رہتی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ ایک بار انھوں نے ابی سے کہا:

"گھر چلانے کے لیے میری اکیلی کی تنخواہ کافی نہیں۔"

"تو جاؤ دیوار سے سر پھوڑ لو!" ابی نے جواب دیا۔

حقیقت یہی تھی کہ ہمارے رہن سہن میں فرق آ گیا تھا۔ اخراجات بہت کم کر دیے گئے

تھے اور کم ناپیدا حد درجہ معمولی ہو گیا تھا۔ کھانے پینے کی تو مجھے پروا نہ تھی، مگر میں کتابیں کہاں سے خریدتا؟ افسوس کہ روح کی خوراک بھی رقم خرچ کیے بغیر حاصل نہیں کی جا سکتی۔ لیکن سب سے بڑا سانحہ یہ تھا کہ میں نے ایسا باپ کھو دیا تھا۔ میرے جیسے والے ہی کہاں تھے؟ مجھ سے نگاہ ملتے ہی انھیں طیش آنے لگا تھا۔ وہ مجھ سے کہتے:

تو کم سے کار ہو رہے! حیات کے لیے صالح نہیں ہے۔'

امی اور ابی کے تعلقات اس حد تک خراب ہو گئے کہ دونوں علیحدہ کمروں میں رہنے لگے۔ سارا گھر بکھر رہا تھا۔ ہم ایک چھت تلے اجنبیوں کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ امی کا غم مجھ سے برداشت نہیں ہو پاتا تھا۔ میرے ذہن نے ایک ایسے منظر کا تصور کیا جس میں میرے ابی اور طارق رمضان ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ ابی طارق کو قتل کر دیتے ہیں۔ انھیں گرفتار کر لیا جاتا ہے، اور رخصت ہوتے وقت وہ مجھ سے کہتے ہیں:

"کاش میں نے تمھاری بات سن لی ہوتی!'

جس کے بعد بیت المقدس پہلے کی طرح طہارت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ بعد میں اپنے تخیل کی سفاکی پر مجھے ظاہر ہے ندامت ہوئی۔ میں نے ایک بار امی سے پوچھا:

"آپ تن تنہا کیوں کر گھر چلا لیتی ہیں؟"

میں چھوٹی موٹی چیزیں بیچ دیتی ہوں۔ بیٹا تم ابھی پڑھائی میں دل لگاؤ

میرا دل آپ کے ساتھ ہے۔"

جانتی ہوں۔ مگر فی الوقت تم ہمارے بوجھ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ تم پڑھ لکھ کر اچھی سی ملازمت کر لو، پھر ہم۔'

"میں تھیٹر کے لیے ڈرامے لکھوں گا۔"

"اس میں نہ روزگار کی ضمانت ہے نہ ثروت۔"

"میں مادہ پرست نہیں ہوں۔ آپ جانتی ہیں میں مادی چیزوں کی پروا نہیں کرتا۔"

مادہ پرست بھلے نہ بنو، مگر سے یکسر فراموش بھی نہ کرو۔"

اور میں نے جوش و خروش سے انھیں یقین دلایا:

"فتح آخر کار خیر ہی کی ہو گی امی!"

مجھے اپنے خوابوں کی ویسی ہی لت پڑ چکی تھی جیسے میرے ابی کو افیون کی۔ میں چپے چپے طراف کی ہر چیز کو بدل ڈالنے کے خواب دیکھتا تھا ــــ میں بجری کے بازار میں جھاڑو دلواتا، پرانے مکان مسمار کر کے اونچے اونچے فلیٹ تعمیر کروا دیتا، پولیس والے کی پوشاک خوب صورت بنا دیتا، استادوں اور طالب علموں کا رویہ بہتر کر دیتا، ہوٹلوں سے بہترین طعام اور مشروب منگواتا اور شراب اور افیون کو روئے ارض سے غائب کر دیتا۔

ایک دوپہر دونوں مرد بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ ابی موچنے سے ہی مونچھیں اکھاڑ رہے تھے اور طارق پھٹی جراب رفو کر رہا تھا۔ طارق کہہ رہا تھا:

"فقیروں کے افلاس سے دھوکا نہ کھانا۔ اس ملک میں ایسے بے شمار مالدار لوگ ہیں جن کے بارے میں کسی کو علم نہیں۔"

ابی نے کہا:

"الملالی تو سونا بنا رہا ہے!"

"الملالی کا کیا ذکر! عورتوں اور پیٹرول کی دولت کی بات کرو۔"

"تجویز تو اچھی ہے مگر ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔"

میں نے دخل دیتے ہوئے کہا:

"ابو العلامعری تو ایک دال کھا کر گزارا کیا کرتے تھے۔"

ابی نے چیخ کر کہا:

"یہ حکمت ماں کے سامنے جھاڑ!"

میں خاموش ہو گیا۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ دونوں تو بالکل حیوان ہیں۔

***

تحیہ عین میرے سامنے کھڑی تھی۔ ناقابلِ یقین حد تک پُرجمال۔ اس کی وہ آنکھیں! میں بالکل مدہوش ہو کر اسے تکے جا رہا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ امتحان کے دنوں میں میں رات کو جاگتا اور دن میں سوتا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں کمرے میں ٹہل ٹہل کر سبق

Scanned with CamScanner

یاد کر رہا تھا۔ تحیہ طارق رمضان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ امی ور بی سو چکے تھے۔ میں نے اس سے پہلے تحیہ کو سٹیج پر دیکھا تھا۔ وہ طارق رمضان کی طرح چھوٹے موٹے پارٹ کرتی تھی۔ اس وقت میں سے، اپنے روبرو، پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا:

"تم اس وقت کیوں کر جاگ رہے ہو؟"

محنتی مجاہد ہے! امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔

"شاباش!"

وہ دونوں اوپر طارق کے کمرے میں چلے گئے۔ میرا سر چکرا گیا۔ خون کھول اٹھا۔ میرے والدین کی لاعلمی میں وہ عورت کو اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ کیا اب ہمارا گھر ذلت کے ایسے گڑھے میں جا گرا ہے؟ میں مزید ایک لفظ نہ پڑھ سکا۔ میرے دماغ و دل شباب کی ساری حسرتوں کے شعلوں میں گھر گیا تھا۔ ترغیب نے چوطرفہ حملہ کیا تھا اور میں سراسر مستحکم عزم کے بل پر اس سے نبرد آزما تھا۔ میرے پورے وجود میں طوفان بپا تھا۔ آخرکار نیند نے مجھ پر غلبہ پا لیا۔

دوپہر کو جب وہ بڑے کمرے میں بیٹھے تھے، میں ان کے پاس جا بیٹھا۔ ابی نے زردی سے مجھے دیکھ کر پوچھا:

"کیا بات ہے؟ تمہیں کیا ہوا؟"

میں نے کہا:

جو کچھ ہوا وہ تصور سے بعید ہے۔ رات طارق تحیہ کو اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔

ابی کی بھاری آنکھیں میری جانب اٹھیں اور مجھے دیکھتی رہیں۔ میں سمجھا کہ انھیں یقین نہیں آ رہا۔ میں نے کہا:

میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

انھوں نے سرد مہری سے سوال کیا:

تم آخر چاہتے کیا ہو؟

میں نے کہا:

میں آپ کو اطلاع دینا چاہتا تھا۔ آپ انھیں سیدھا کریں۔ انھیں سمجھا دیں کہ یہ باعزت گھر ہے۔ آپ ان کو فوراً نکال دیں۔"

Scanned with CamScanner

"تم پڑھائی میں دھیان لگاؤ اور گھر کی باتیں گھر کے مالک پر چھوڑ دو۔" انھوں نے تیزی سے کہا۔

امی نے مری ہوئی آواز میں کہا:

"ان کی منگنی ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا:

"مگر ابھی شادی تو نہیں ہوئی۔"

ابّی نے انگلی سے میری طرف اشارہ کر کے غیظ سے کہا:

"یہ بھوکوں مرنا چاہتا ہے..."

میں غصّے سے پھٹ پڑا۔ میں نے کہا:

"ہمارے افلاس کے ذمّے دار آپ ہیں..."

اس پر ابّی نے چائے کی پیالی گھما کر مجھ پر دے مارنی چاہی مگر امی لپک کر درمیان میں آ گئیں۔ وہ مجھے میرے کمرے میں لے آئیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے والے لگ رہے تھے۔ میں نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا:

"ان سے کوئی توقع رکھنا بے سود ہے۔ بس اب ان سے کوئی تعلق مت رکھیے۔ ہم دونوں کیوں نہ کہیں چلے جائیں۔ لیکن کہاں؟ ہم رہیں گے کہاں؟ اور ہمارے پاس پیسا کہاں سے آئے گا؟"

ان سوالوں کا خود میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مگر وہ سچائی میرے سامنے برہنہ ہو گئی تھی۔ امی کی مدافعت نے حالات کی یورش کے سامنے دم توڑ دیا تھا — حالات جو میرے باپ کی لت نے پیدا کیے، جن کا وہ یقینی طور پر ذمے دار تھا لیکن جن سے بچ نکلنے سے معذور تھا۔ لیکن اس بری عادت کے علاوہ بھی وہ اکثر مجھے ایک بے اصول انسان معلوم ہوتا تھا۔ میں اسے حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور ایسے شخص کو مسترد کرتا تھا۔ اس نے ہمارے گھر کو چکلا بنا دیا تھا۔ لیکن میں خود بھی کمزور تھا۔ میں صرف رو سکتا تھا۔

***

Scanned with CamScanner

میں امتحان میں کامیاب ہو گیا لیکن مجھے وہ خوشی نہ ہوئی جو ہونی چاہیے تھی۔ میں شرم سے گڑا جا رہا تھا اور مستقل اداس رہنے لگا تھا۔ طویل چھٹیوں میں میں زیادہ تر وقت لائبریری میں گزارتا رہا۔ وہاں میں نے ایک ڈراما لکھا۔ میں نے امی سے التجا کی کہ وہ اسے سرحان الہلالی کے پاس لے جائیں مگر انھوں نے بس اتنا کہا:

"ہمارا تھیٹر بچوں کا نہیں ہے۔"

آخر امی میرا ڈراما لے گئیں۔ دو ہفتے بعد وہ اسے واپس لائیں اور مجھ سے کہنے لگیں:

"پہلا ڈراما قبول ہو جانے کی توقع غلط ہوتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم کوششیں کیے جاؤ۔"

مجھے افسوس تو ہوا مگر مایوسی نہیں ہوئی۔ میں مایوس کیسے ہو سکتا تھا جب کہ میری واحد امید ہی تھیٹر تھا۔ ایک دن دارالکتب میں میری فواد شلبی سے ملاقات ہو گئی۔ ہم نے مصافحہ کیا۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ میں کون ہوں۔ اس کے التفات سے مجھے یہ سوال کرنے کی ہمت ہوئی کہ میں تھیٹر کے لیے قابلِ قبول ڈراما کیسے لکھوں۔ اس نے پوچھا:

"تمھاری عمر کیا ہے؟ کون سی کلاس میں ہو؟"

"سیکنڈری اسکول میں ہوں۔"

"کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کر لو؟"

"مجھے لگتا ہے کہ میں اس وقت بھی لکھ سکتا ہوں۔"

"نہیں۔ ابھی تم زندگی کو نہیں سمجھتے۔"

"مجھے خوب معلوم ہے کہ زندگی کیا ہے۔"

وہ مسکرایا۔ اس نے کہا:

"اچھا تو بتاؤ ــــ کیا ہے زندگی؟"

"زندگی، مادے کے خلاف روح کی کش مکش ہے۔"

"اچھا!"

اس کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی۔

"اور اس میں موت کیا کردار ادا کرتی ہے؟"

Scanned with CamScanner

میں نے پورے اعتماد سے کہا:
"موت مادے پر روح کی آخری فتح ہے۔"
اس نے میرا شانہ تھپتھپایا اور کہا:
"کاش یہ اتنا سادہ مسئلہ ہوتا! تمھیں ابھی مزید تجربے کی ضرورت ہے۔ جاؤ اور معلوم کرو کہ لوگوں کو کن مسائل سے دل چسپی ہے، کیا شے تمھیں جوش دلاتی ہے۔ میں تمھیں مشورہ دوں گا کہ زندگی میں چھلانگ لگا دو، اس کا ہر ذائقہ چکھو۔ اور کم از کم دس برس مزید انتظار کرو۔"
اس کی یہ باتیں سن کر میں اور بھی اپنے اندر سمٹ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں ترغیب سے محفوظ ہوں؟ شاید وہ ہمارے گھر کے حالات سے ناواقف تھا؛ اور میرے اوائلِ شباب کی روح میں برپا طوفان سے بھی ناواقف تھا، شہوت اور عظمت کے مابین جان لیوا کش مکش سے بھی، مجنوں اور لیلیٰ کے عشقیہ اشعار اور عمر خیام کے عیش آمیز کلام کے ٹکراؤ سے بھی، اور اس تضاد سے بھی جو اوپر کی منزل کے کمرے میں رہنے والی بدچلن تحیہ اور اس کے اس جاں سوز تصور میں تھا جو میری روح کو پگھلائے دے رہا تھا اور جو زمین پر پڑی غلاظت اور آسمان پر تیرتے دودھیا بادلوں کے تضاد جیسا تھا۔

***

طارق کے کمرے سے متصل کمرے میں عجیب و غریب تبدیلیاں آرہی تھیں۔ پرانا سامان فروخت کر دیا گیا تھا؛ اس کی جگہ نیلام سے خوب صورت سازوسامان خرید کر رکھ دیا گیا تھا۔ مصر فی سیوں والے فرش پر قالین بچھا دیا گیا تھا جس پر سبز بانات سے ڈھکی بڑی سی میز رکھی گئی تھی۔ وسطی دیوار کے ساتھ کھانے کی میز لگی تھی۔ یہ پُراسرار تیاریاں کس لیے کی جارہی تھیں؟ جب میں نے امی سے پوچھا تو انھوں نے گول مول سا جواب دیا:
"تمھارے ابی شام کو یہاں اپنے دوست احباب کے ساتھ تفریح کریں گے، جیسے سب مرد کرتے ہیں۔"
ابی کا نام سنتے ہی میں شک شبہے میں پڑ گیا۔ امی نے اصرار کیا کہ تھوسٹر ختم ہونے کے بعد وہ

لوگ بقیہ شام یہاں گزارا کریں گے۔

مجھے رات بھر کمرے میں چھپ کر جاگتے اور کان لگا کر باتیں سننے کی عادت پڑ گئی۔ ہمارے گھر میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا علم صرف رات ہی کے وقت ہو سکتا تھا۔ یہ تمام ہمدرد دوست ہفت رات سے آنا شروع ہوئے تھے۔ میں ان کی آمد دیکھ سکتا تھا [illegible] پہلے نبی، پھر ہلالی، اسماعیل، سالم الجبرودی، محمود شلبی، تحیہ اور طارق [illegible] پھر میں تاریکی میں اوپر والی منزل میں چلا جاتا اور وہاں سے جھانک کر دیکھتا۔ وہ میز کے گرد بیٹھے ہوتے اور تاش کے پتے بانٹے جا چکے ہوتے۔

وہاں جوا کھیلا جاتا تھا [illegible] بالکل جیسے ڈراموں میں دکھاتے ہیں اسی طرح۔ تھیٹر کے ڈرامے، اپنے اداکاروں سمیت، ہمارے گھر میں در آئے تھے۔ [illegible] اسٹیج پر ان کے کردار خیر اور شر میں منقسم ہوتے تھے جب کہ اس گھر میں یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور صرف شر کی طرف تھے۔ وہ سب اداکار تھے [illegible] حتیٰ کہ تھیٹر کا ناقد بھی [illegible] اور ان کی وہ ہمدردی صرف جھوٹ تھی۔ اگر ایک بار پھر طوفان لوٹ آئے تو کشتی ڈوبنے میں خود پہلے ڈوبنے والے صرف میں اور امی ہوں گے۔ جو کچھ ہو رہا تھا اس میں ہمارا بھلا نہیں تھا۔ لیکن امی ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنے لگی تھیں۔ میں نے احتجاج کیا تھا۔

"آپ ان بدمعاشوں کی مدارات کیوں کرتی ہیں؟"

امی نے صاف بتایا:

"وہ میرے کام کے ساتھی ہوتے ہیں۔ ورنہ میں اس گھر میں تنہا ہوں۔

کہو؟ کیسا گھر؟ اب تو یہ قحبہ خانہ ہے۔ قمار خانہ بن چکا ہے۔"

"میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں یہاں سے نکل چلیں۔ لیکن فی الوقت میں کیا کر سکتی ہوں؟"

میں نے تنگ آ کر کہا:

"اسی لیے میں پیسے سے نفرت کرتا ہوں۔"

"لیکن ہم پیسے کے بغیر جی نہیں سکتے۔ یہی تو مسئلہ ہے [illegible] کچھ بھی ہو، میری آخری اور واحد امید تو ہی ہے، میرے بیٹے!"

***

خیر کیا ہے؟ عمل کے بغیر خیر کا کیا مطلب ہے؟ میں صرف خواب و خیال کی دنیا کا سورما تھا جو تصویروں کی دنیا ہے۔ گھر فحاشی کا اڈا بن رہا تھا اور میری نوعمری اس بات کا کافی بہانہ تھی کہ میں نے اس صورتِ حال کو قبول کر لیا تھا۔ لیکن میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں اپنے ہم جماعتوں کی زندگی میں محض تخیلاتی طور پر شامل ہو سکتا تھا جہاں خوب صورت کلمات عمل کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا رقص الموت تھا جس پر میں باہر کھڑا تالیاں ہی بجا سکتا تھا۔ پھر فواد شبلی اپنے ساتھ دُرِّیہ کو لانے لگا۔ تیسرے کمرے میں میرے دروازے کی نشانی، بسم اللہ کے طغرے، کے نیچے وہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے تھے۔ میں نے امی سے کہا:

شبلی اور دُرِّیہ بھی۔ ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔

انھوں نے سُرخ آنکھوں کے ساتھ جواب دیا:

"تم اس قابل تو ہو جاؤ۔"

"میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

"میرا تم سے زیادہ دم گھٹتا ہے۔"

کیا یہ سب کچھ صرف افیون کے باعث ہو رہا ہے؟

انھوں نے کچھ جواب نہ دیا۔

شاید اصل وجہ افیون نہیں۔ شاید افیون کسی اور سبب کا نتیجہ ہے۔

امی نے آہ بھر کر کم زور آواز میں کہا:

تمھارا باپ مجنون ہے۔ مگر میری ہی خطا ہے کہ اس کے کہنے میں آ گئی ..

"میں اُسے قتل کرنا چاہتا ہوں۔"

امی نے میرا بازو سہلا کر کہا:

خود کو پڑھائی میں غرق کر دو۔ میری واحد امید تم ہو!

***

Scanned with CamScanner

وہ رات جس نے میری آخری خود فریبی کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ اپنے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے مجھے سرحان البحیری سیڑھیوں سے لڑکھڑاتا ہوا نیچے آتا دکھائی دیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھیں نیم مُردہ سی تھیں۔ وہ کوئی دیو نہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ وہ جوئے کی میز سے اس طرح کیوں اٹھ کر آ گیا۔ پھر امی اپنے کمرے سے باہر آئیں۔ یہ دیکھنے کہ کیا بات ہے، وہ آخری سیڑھی پر اس سے ملیں۔ انھوں نے ایک دوسرے سے سرگوشی میں کچھ کہا جو میں نہ سن سکا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ البحیری بھی ان کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلا گیا۔ میں بے اختیار چھلانگ لگا کر کھڑا ہو گیا، لیکن فوراً ہی میرے قدم تھم گئے۔ مجھے احساس ہوا کہ امی کو روکنے سے زیادہ میرے لیے اہم یہ ہے کہ سچائی کا پتہ چلاؤں۔ میری ماں بھی؟ ہو سکتا ہے چند لمحوں کے لیے میں بے ہوش ہو گیا ہوں۔ یہ ایسی ضرب تھی جو میری کل کائنات کو پاش پاش کر دینے والی تھی۔ مجھے اپنے اطراف ہولناک شیاطین کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ میں دوڑتا ہوا بڑے کمرے میں پہنچا اور امی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے بتی جلائی — کمرہ خالی تھا۔ میں نے بتی دوبارہ بجھا دی اور واپس بڑے کمرے میں پہنچا۔ میں نے وہاں کی بتی جلائی اور بیوقوفوں کی طرح کھڑا رہا۔ اسی وقت امی تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے میرے پاس آئیں۔ انھوں نے چھوٹتے ہی پوچھا:

"اس وقت تم کیسے جاگ گئے؟"

مجھے علم نہ تھا کہ کیا کہہ رہا ہوں۔ مگر میں نے کہا:

"میں سو نہیں سکا۔"

"تم نے سرحان البحیری کو تو نہیں دیکھا؟"

"وہ گھر سے چلا گیا ہے۔"

"کب؟"

"کچھ دیر پہلے... مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔"

میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ میرا دماغ دیوانگی کے خیالات سے پھٹا جا رہا تھا۔ مجھے وقت کے گزرنے کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ آخر قدموں کی چاپ سے میرے اوسان بحال ہوئے۔ لوگ جا رہے تھے۔ پھر بڑے کمرے میں میں اور امی تنہا رہ گئے۔

میں کسی کے سوراخ سے کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگا۔ میں نے ابی کا سوال سنا:

"میرے پیٹھ پیچھے کیا ہوا تھا؟"

امی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ابی نے دوسرا سوال پوچھا:

"کیا عباس نے دیکھا تھا؟"

دوبارہ جواب ندارد۔

"ہر ایک جانتا ہے کہ الطاف نے کسی کو نہیں بخشا۔ حتیٰ کہ ام ہانی کو بھی نہیں۔"

امی کی آواز تک نہیں نکل رہی۔ ابی نے کہا:

"ہر شے کی کچھ نہ کچھ قیمت ہوتی ہے۔ اصل بات تو یہ ہے! اور تم؟ میری۔ تم اس قابل نہیں کہ تم پر غیرت کھائی جائے۔"

آخرکار امی بولیں۔

"تم ارذل ترین کیڑے ہو!"

ابی نے قہقہہ لگا کر کہا:

"ماسوا ایک کیڑے کے..."

تو حقیقت یہ تھی! یہ میرا باپ تھا اور یہ میری ماں تھی۔ اشتعال کے شعلے میری روح کو سفاکی سے جلا رہے تھے۔ اپنا خنجر میاں میں رکھ دے کہ قیصر بھی قتل ہو چکا۔ میرا نودی برجراک بھوتوں سے جدال کرتا تھا!

دلال اور رنڈی ـــــ میرا باپ اور میری ماں ـــــ میں دونوں سے ہاتھ دھوتا ہوں۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ ایک بار میں نے دونوں کو فواد شلبی کے ساتھ سرگوشیاں کرتے دیکھا تھا اور اس وقت کچھ نہ سمجھا تھا۔ ایک بار دونوں اکٹھے طارق رمضان سے چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے اور میں نے شک نہ کیا تھا۔ یہ سب۔ بلا استثنیٰ۔ کیوں نہیں؟ یہ عورت میری اوّل عدو ہے۔ میرا باپ تو جنون ہے اور لت کا شکار ہے، لیکن میری ماں میری ماں اس تمام شر کی خالق ہے۔

***

کمرے میں اسی کی آواز گونجی جو مجھے پکار رہی تھیں۔ کیسی عجیب بات تھی کہ انہی کے خلاف میرے جذبات کی واضح صورت تھی لیکن انہی کے خلاف میرے شعور کا تلاطم اور کراہت سے شل تھے۔ وہ جلدی سے میرے کمرے میں داخل ہوئیں اور میرا بازو پکڑ کر بولیں:

تھوڑی دیر کے لیے پڑھنا چھوڑو۔ ہمیں ایک دوسرے سے باتیں کرنے کا موقع کم ملتا ہے۔

وہ مجھے بڑے کمرے میں لے گئیں اور کرسی پر بٹھا کر چائے بنانے لگیں۔ میں نے کہا:

آج کل میں آپ کے بارے میں کچھ خوش نہیں ہوں۔

انھوں نے مجھ پر نظر ڈال کر کہا:

مجھے معلوم ہے تم کیوں حزیں ہو۔ لیکن میرے کام میں مزید اعتماد نہ کرو۔ نجات کی ساعت قریب آ رہی ہے۔ ہم دونوں اکٹھے یہاں سے چلے جائیں گے۔

اُف، کس قدر مکار عورت ہے! میں نے کہا:

یہ گھر صرف آگ میں جل جانے سے پاک ہو سکتا ہے۔

کیا یہ کافی نہیں کہ میں تیری پرستش کرتی ہوں؟

کیا میں چاقو کی نوک اس کے سینے پر دے ماروں؟ کیا میں دفن کر دوں اسے؟ میرے تخیل کے شعلوں نے میرے ہر ردِ عمل کو معطل کر دیا تھا۔ میں انھیں تکتے رہنے کے سوا کچھ نہ کر سکتا تھا۔

انھوں نے سوال کیا:

کیا آج کل کوئی نیا ڈراما لکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا:

ہاں، اس ڈرامے سے آپ کو ڈر لگے گا۔ عورتیں یاد آئے گا۔

یہ گندی زندگی گزارنے والی عورتوں کے بارے میں ایک ڈراما تھا۔

نہیں، میرے حبیب! تم اپنا ڈراما اپنے قلب کے نور سے لکھنا۔

اسی وقت بابا اپنے کمرے سے نکل آئے اور تحیہ اور طارق زینے سے اترے۔ میں اپنے کمرے میں واپس جانا چاہتا تھا مگر تحیہ نے مجھے روک لیا۔

Scanned with CamScanner

"اے مصنف، کچھ دیر ہمارے ساتھ بھی بیٹھو۔"

غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ تیمیہ نے مجھ پر توجہ دی تھی۔ میں بیٹھ گیا۔ طارق نے ہنس کر کہا:

"یہ مصنف تو کوئی المیہ تصنیف کرے گا۔"

میرا باپ بڑبڑایا:

"یہ فضیلت کے مرض میں مبتلا ہے۔"

تیمیہ نے پیالی سے گھونٹ بھرا اور بولی:

"کیسی جمیل بات ہے کہ اس زمانے میں کوئی شخص خیر کا مدعی ہے۔"

امی نے کہا:

"اس کی آنکھیں کمزور ہیں، اس لیے نہیں دیکھ سکتا کہ گردوپیش میں کیا ہو رہا ہے۔"

تیمیہ نے کہا:

"اسے اس کی جنت میں رہنے دو۔ میں بھی نیکی سے پیار کرتی ہوں۔"

طارق ہنس کر بولا:

"تمہاری نیکی سے تو سب کا دل شاد ہوتا ہے۔"

تیمیہ نے چائے پیتے ہوئے کہا:

"ماں کی طرح حسین اور باپ کی طرح قوی ہے۔ یہ تو ڈان ژوان نکلے گا۔"

امی نے حقارت سے کہا:

"اس کا چشمہ تو دیکھو۔ مشکل تو یہی ہے کہ اسے کچھ نظر نہیں آتا۔"

وہ چلے گئے۔ میں اپنے غیظ و غضب میں سلگتا رہا۔ اپنے تخیل میں پھر کچھ ڈھانچے اور کچھ بنانے لگا۔ لیکن جب تیمیہ نے مجھے روکا تھا تب اس کا بدن مجھ سے مَس ہوا تھا۔ اس لمس سے ایک نئے خواب کا آغاز کر دیا تھا۔ تیمیہ میری ماں سے کسی طرح بہتر نہ تھی۔ پھر وہ کیوں کر اس قدر کم قابلِ اعتراض لگتی تھی؟ بعد میں تنہائی میں اس لمس کی یاد نے میرے ذہن کے بھڑکتے جہنم میں ایک نئی کہانی کو جنم دیا تھا۔ کہانی اسی بیتِ قدیم کے گرد گھومتی تھی جو میرے دادا نے اپنے ماتھے کے پسینے سے بنایا تھا، اور پھر کس طرح وہ چکلے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یہی بنیادی خیال تھا۔ اس کے کامیاب ہونے کی میرے پاس اس کے سوا کوئی دلیل نہ تھی کہ یہ خیال بھی میرے تن

بدن میں وحشت کا ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ کیا یہ کامیاب ڈراما ہوگا؟ اور... کیا محبت کے بغیر کامیاب ڈراما بن سکتا ہے؟

***

دروازے پر ہلکی سی دستک... میں نے دروازہ کھولا۔ تحیہ باہر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ یہ چائے کے وقت سے پہلے یہاں کیوں آئی ہے؟ وہ کمرے میں داخل ہوئی اور بولی:

"تمہارے سوا سب لوگ سو رہے ہیں۔"

وہ کمرے کے وسط میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے چاروں طرف نظر ڈال کر کہا:

"کرسی، بستر... یہ صرف کمرہ نہیں پورا گھر ہے۔ اچھا... تمہارے پاس تھوڑا سا حلوہ ہوگا؟"

میں نے معذرت چاہتے ہوئے کہا:

"افسوس... نہیں ہے۔"

کمرے کے وسط میں اس کے گدرائے بدن سے ترغیب کی حرارت پھیل رہی تھی۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ اس کی آنکھوں کی شفاف پتلیاں شہد کے رنگ کی ہیں۔

"تمہارے پاس تو کتابوں کے سوا کچھ نہیں۔ پھر تو مجھے چلا جانا چاہیے۔" تحیہ نے کہا، لیکن جانے کے بجائے مجھ سے مخاطب ہو کر بولی:

"تم سوچ رہے ہو گے اتنی صبح میں کہاں چل پڑی۔ میں شارع الجیش پر اپنے فلیٹ میں جا رہی ہوں۔ جانتے ہو وہ کہاں ہے؟ ٹرام کے راستے پر ہے۔ عتبہ سے ایک اسٹاپ آگے۔ عمارت نمبر ۱۱۷۔"

اس کے سڈول بدن کی خوشبو سے مجھ پر نشہ طاری ہو رہا تھا۔ میں نے بے اختیار کہا:

"رکیے... میں آپ کے لیے باہر سے حلوہ لے آتا ہوں۔"

"نہیں، میں راستے سے لے لوں گی... تم بہت اچھے ہو۔"

اس کی موجودگی کے باعث کچھ دیر کے لیے میں نے اپنے اندر بپھرتے ہوئے طوفان کو فراموش کر دیا تھا۔ میں صرف اتنا کہہ سکا:

"ابھی تو آپ ہیں۔"

اس نے مجھ پر ایسی التفات کی نظر ڈالی جو خوابوں کو جنم دے سکتی تھی۔ پھر وہ آرام سے دروازے کی جانب بڑھی۔ میں نے گھبرا کر کہا:

"جائیے مت! ... میرا مطلب ہے... جلدی کیا ہے؟"

اس نے متبسم ہو کر مجھے دیکھا اور کہا:

"اگلی ملاقات تک..."

وہ چلی گئی ــــ اس پُرسکون کمرے میں ایک پُرمسرت ہیجان چھوڑ کر، ایک انتہائی پُرشوق تلاطم۔ علاوہ بغیر کسی وجہ کے میرے کمرے میں کیوں آئی؟ ورنہ اس طرح باتوں باتوں میں اپنا پتا کیوں بتایا؟ میرا مسرت زدہ، ضدی، سادہ لوح دل کس کس طرح دھڑک رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایک جیتی جاگتی عورت ــــ نہ کہ لیلیٰ و لبنیٰ و میرہ، اوفیلیا و دیسدیمونیا۔ اس کے بعد ہر صبح ہماری نظروں کے تبادلے میں ایک خاص معنی پیدا ہوئے، ایک نیا سرِ حیات۔ ہم ہر شخص سے بے نیاز ایک دوسرے سے گفتگو میں محو ہو جاتے۔ میں حیرت میں خود سے سوال کرتا تھا: کیا میں رفعتوں کی جانب پرواز کر رہا ہوں؟ یا سُرعت سے پستیوں کی جانب گر رہا ہوں؟

***

بشیر* کی چیختی ہوؤں کے باوجود مجھے اوپر کی منزل سے شور صاف سنائی دیا۔ میں لپک کر زینے پر چڑھا۔ میں نے دیکھا کہ بڑے کمرے میں طارق رمضان تحیہ کے رخساروں پر طمانچے مار رہا ہے۔ میں حیرت اور غم سے پتھر ہو کر رہ گیا۔ تحیہ اس کے کمرے میں چلی گئی۔ طارق نے اطمینان سے پوچھا:

"ہم نے تمھیں پریشان تو نہیں کیا؟"

غم اور غصے کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے بمشکل کہا:

"معاف کیجیے گا..."

"یہ ہمارا یومیہ دستور ہے۔ گھبراؤ مت۔ تم بھی لطف اٹھاؤ۔"

اندر سے تحیہ لرزتی ہوئی آواز میں چیخی:

"اب کی بار میں واپس نہیں آؤں گی۔"

طارق کمرے میں چلا گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔

میں واپس نیچے آ گیا۔ ایک درد نے میرا کلیجہ مسل ڈالا۔ آخر یہ کیوں کر ہوا؟ تحیہ جیسی گل بدن تنومند طارق جیسے بدھو سے ظلم و ستم کیوں برداشت کرتی ہے؟ کیا محبت اسی لیے نور بخشتی ہے کہ ایک ایسے کو شکست کرے؟

وہ دو دن تک نہیں لوٹی مگر تیسرے دن واپس آ گئی تو اس کا چہرہ مسرور ہو رہا تھا۔ میرا دل مسل گیا اور میرا غرور اور بھی گہرا ہو گیا۔ میں اس سے طارق کے عمل کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا لیکن میری محبت سے بڑی حقیقت تھی جس سے میں ناواقف تھا۔ شاید میری لاعلمی میں وہ محبت عرصے سے مزید بڑھ چکی تھی اور اب شعور پا کر ایک چھتنار پیڑ بن چکی تھی۔ پھر ایک دن جب وہ دونوں مکان سے باہر جا رہے تھے، وہ مجھ سے درست رہنے کے لیے جھکی اور تہہ کیا ہوا چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ فرش پر گراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں تعجب، خوف سے وہ پرزہ اٹھا لیا میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے ملاقات کا مقام اور وقت پڑھا۔

* * *

وہ چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ کمرے صرف دو تھے لیکن خوب صورت اور صاف ستھرے، اور ان میں عطر کی مہک بسی تھی۔ میز پر ایک بڑی مور کل دان میں گلابوں کا ایک دستہ تھا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی پوشاک میں میرا استقبال کیا اور گلابوں کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"تمہاری ملاقات کی خوشی میں..."

وفور شوق کی طویل ہم آغوشی جس سے دل بے پناہ مسرت سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو علیحدہ ہونے سے قبل ہی اولین بوسے کی لذت میں غرق یہ ہم آغوشی ابد تک تنہا کو پہنچ جاتی۔ لیکن اس نے کمال نرمی سے مجھے خود سے علیحدہ کیا اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے دوسرے کمرے میں لائی جہاں ہم ایک بڑے صوفے پر ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

اس نے مدّھم آواز میں سرگوشی کی:

'ہم نے جرأت تو بہت بڑی کی ہے۔ لیکن یہی درست ہے۔

میں نے جوش و خروش سے دُہرایا:

"یہی درست ہے..."

پھر میں نے ایامِ طفلی کے اختتام کا عزم کر کے کہا:

"میں بہت عرصے سے تم سے محبت کرتا ہوں۔"

واقعی؟ اور میں بھی۔ کیا تم یقین کرو گے۔ یہ میری پہلی محبت ہے۔

میں بے یقینی کے عالم میں خاموش رہا۔ لیکن اس نے پُرحرارت لہجے میں کہا:

'تم نے میرے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہوگا۔ لیکن وہ صرف ٹھوکریں تھیں ___ محبت نہیں تھی۔'

میں نے تاسف سے کہا:

"ایسی زندگی تمہارے لیے مناسب نہیں تھی..."

اس نے کہا:

ہماری اپنے لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ چاہیے اور وہ نہیں چاہیے۔

"اب یہ سب کچھ بدل جانا چاہیے۔"

یعنی؟'

"ہم اب ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔"

اس نے جوش سے کہا:

میں آج تک تم جیسے شخص سے نہیں ملی تھی۔ وہ سب حیوان تھے۔'

میں نے کچھ احتجاجاً کہا:

'سب؟

میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی... سرحان بسلالی، سالم العرودی۔ اور آخر میں... طارق...

میں دم بخود رہ گیا۔ مجھے اسی کا خیال آیا۔ لیکن اس نے کہا:

اگر ہماری کو خلا میں لٹکتے خواب بھی وقت ہے کہ ہم اپنا ارادہ بدل دیں۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ایک داخلی قوت سے سرشار ہو کر کہا:

مجھے صرف تمہاری حقیقی قدر و قیمت سے سروکار ہے۔

میرا دل ہمیشہ کہتا تھا کہ تم میرے گھٹیا خوف سے بہت بڑھ کر ہو۔

"میں بچہ نہیں ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولی:

"مگر تم ابھی طالب علم ہو۔"

یہ سچ ہے۔ مجھے ابھی طویل مرحلہ طے کرنا ہے۔

اس نے خلوص سے کہا:

میرے پاس کچھ رقم جمع ہے۔ میں انتظار کر سکتی ہوں۔

لیکن میں صرف محبت کے دام میں گرفتار نہ تھا۔ میں اس بے مسرت اور منحوس گھر سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ وہ قدم اٹھاؤں جو واپس نہ لیا جا سکے اور ایک نیا راستا کھول دے۔ میں نے کہا:

اس سے پہلے ہمیں فوراً شادی کر لینی چاہیے

اس کا چہرہ یوں گلابی ہو گیا کہ وہ اور بھی حسین لگنے لگی۔ لیکن فرطِ جذبات سے کچھ کہہ نہ سکی۔

"ہمیں یہی کرنا پڑے گا۔"

اچانک اس نے اشتیاق سے بے قابو ہو کر کہا:

میں اپنی زندگی بدلنا چاہتی ہوں۔ میں تھیٹر سے بھی چھٹکارا پانا چاہتی ہوں۔ لیکن کیا تمہارے والد تمہارا خرچ اٹھاتے رہیں گے؟"

میں نے کہا:

وہ ہرگز ایسا نہ کریں گے۔ اور میں ہرگز ان عطیات کو قبول نہ کروں گا۔'

اس نے حیرت سے کہا:

"پھر آخر ہم شادی کیسے کریں گے؟"

میرا ثانوی اسکول اب ختم ہونے کو ہے۔ اور میری کمزور نگاہ کی وجہ سے مجھے فوج میں لازمی

بھرتی سے استثنیٰ مل جائے گا۔ میں یقیناً کوئی نہ کوئی ملازمت تلاش کر لوں گا۔ میری صلاحیت کا انحصار ذاتی درس پر ہے نہ کہ سکول میں جماعتی درس پر۔"

"کیا تمہاری آمدنی ہم دونوں کے لیے کافی ہوگی؟"

"ابی تھیٹر میں پرامپٹر کی ملازمت ترک کرنا چاہتے ہیں۔ قمار اور دوسرے ذرائع سے ان کی خوب آمدنی ہو جاتی ہے۔ میں ان کی جگہ کے لیے درخواست دے دوں گا۔ اس طرح میں تھیٹر میں بھی وقت گزار سکوں گا۔ اس دنیا میں جس سے میرا قلبی تعلق ہے۔ اور یہ فلیٹ تمہاری ملکیت ہے، اس لیے سر چھپانے کی جگہ بھی ہمارے پاس ہوگی۔"

"کیا میں بھی حالات بہتر ہونے تک تھیٹر میں کام جاری رکھوں؟"

"نہیں،" میں نے سختی سے کہا۔ "تم ان لوگوں سے دور رہو۔

میں نے بتایا ہے کہ میرے پاس کچھ رقم جمع ہے لیکن وہ تمہارے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے تک نہ چل پائے گی۔"

میں نے شدت جذبات میں کہا:

"ہم کسی نہ کسی طرح گزارا کر لیں گے۔ جب تک ہمیں ہمارا گوہر مقصود ہے۔"

ہم پھر ہم آغوش ہو گئے اور ہم نے دنیا و مافیہا کو کچھ عرصے کے لیے فراموش کر دیا۔ آخر میں اس نے نرمی سے اپنا بدن چھڑا کر سرگوشی میں کہا:

"میں طارق رمضان سے دور رہنا چاہتی ہوں۔ میں اب واپس نہیں جاؤں گی۔"

میں نے کہا:

"وہ یہاں آ جائے گا۔"

طارق رمضان کا نام سن کر میری طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔

"میں دروازہ نہیں کھولوں گی،" اس نے مجھے یقین دلایا۔

میں نے کہا:

"میں اُسے سب کچھ بتا دوں گا۔"

"عباس،" اس نے کچھ گھبرا کر کہا، "احتیاط رکھنا۔ کہیں بات بڑھ نہ جائے۔"

میں نے شیخی سے کہا:

"میں اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔"

***

جب میں باہر نکلا تو ایک نیا انسان بن چکا تھا۔ پہلی بار میں نے تحیہ کو ایک محبت کی نظر سے لو دیتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ پہلے سے کہیں بڑھ کر حسین اور ہمدردی کی مستحق نظر آئی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا: بہت جلد میں چونے والا ہوں، تماشائیوں کی صف سے اٹھ کر زندگی کے اسٹیج پر کھیلے جانے والے ڈرامے کے عین وسط میں، اس منحوس بیت القدیم سے نکل کر تازہ، پاک صاف ہوا میں سانس لینے کے لیے۔ میں خالی کمرے میں انتظار کر رہا تھا کہ طارق سیڑھیوں سے اتر کر نیچے آیا۔ سلام دعا کے بعد اس سے پوچھا:

"کیا تحیہ نہیں پہنچی؟"

میں اس کا سامنا کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں۔"

"تھیٹر میں تو نظر نہیں آئی۔"

"وہ تھیٹر نہیں جائے گی۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ یہاں نہیں آئے گی اور تھیٹر بھی نہیں جائے گی۔"

"اور یہ سب اسرار تم کو کیوں کر معلوم ہوئے؟"

"ہم شادی کرنے والے ہیں۔"

"ہم؟"

"ہم نے شادی کرنے کا اقرار کر لیا ہے۔"

"ارے بن... کیا تو پاگل ہو گیا ہے؟ کیا بک رہا ہے؟"

"ہم تمہارے ساتھ شرفا کا برتاؤ کرنا چاہتے ہیں۔"

اچانک اس نے میرے منہ پر زور کا طمانچہ مارا۔ غیظ میں آ کر میں نے اسے گھونسا رسید

کیا۔ وہ چکرا کر زمین پر گرنے لگا۔ تنی دیر میں میرے والدین دوڑتے اور چیختے چلاتے آ پہنچے۔ طارق نے کہا:

کیا مسخرا پن ہے۔ یہ ماں کا لاڈلا تمیہ سے شادی کرنے چلا ہے۔

امی چیخ پڑیں:

"تمیہ...؟ وہ تجھ سے دس سال بڑی ہے..."

طارق ہمیں دھمکیاں دینے لگا۔ آخر امی نے اس سے کہا:

"اپنا سامان اٹھا کر رخصت ہو جاؤ۔ والسلام!"

طارق نے جاتے جاتے چیخ کر کہا:

"میں قیامت تک نہ جاؤں گا۔"

تھوڑی دیر سکوت رہا۔ پھر امی نے تمسخر سے ایک پرانے گیت کے بول دہرائے:

"فی العشق یا ما کنت أنوح..."

(آہ تیرے عشق میں میں نے نوحے پڑھے...)

پھر وہ بولیں:

عباس، یہ وقتی جذبات ہیں۔

"نہیں، یہ نئی زندگی ہے۔

"اور تمہارے خواب؟ تمہارا مستقبل؟"

نہیں میں صدقِ دل سے پایۂ تکمیل کو پہنچاؤں گا۔

"تم اُس کے بارے میں جانتے ہی کیا ہو؟"

اس نے مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دیا ہے۔

امی قہقہہ لگا کر بولیں:

بنتِ تمیہ... سب اصولوں سے واقف... مگر تم بھی عجیب ہو۔ اپنی ماں کو جاننے کے بعد تو تمہیں عورت ذات سے نفرت ہو جانی چاہیے تھی۔

پھر وہ مجھے کمرے میں لے آئیں اور کہنے لگیں:

اس کی سیرت اور ماضی کے بارے میں بھی جانتے ہو؟"

Scanned with CamScanner

اس کے پرانے درد سے میرے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ میں نے ان سے نظریں چراتے ہوئے کہا:

میں اپنے اس سے کسی در حاصل نہیں کر سکا۔

تو وہ نہیں جانتیں کہ مجھے ان کے بارے میں کیا علم ہے۔ میں نے کہا:

"ہر شے کے باوجود تم پاک ہے۔"

کاش میں تمھارے بارے میں بھی یہ کہہ سکتا ہے میری ماں!

***

ہائی سکول ختم کرتے ہی میں نے سوہاج صوبے کے قصبے میں اپنی ملازمت کر لی۔ قصبہ دور تھا میں نے فوراً عہد کر لیا۔ کہ اپنے بیت القدیم اور اس کے مکینوں کو ملاقات کی رسم کی ہی طرح الوداع کہہ جیسے میں سکول یا درسگاہ جانے کے لیے نکل رہا ہوں۔ ابی نے نہیں الوداع کیا نہ دعا دی۔ لیکن ناصرہ اور کہا:

اگر قصبے میں ہی ہمیشہ کی نوکری ہی کرنی تھی تو سکول میں اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

امی نے مجھے گلے لگایا اور رونے لگیں۔ انھوں نے کہا:

رب عالم تجھے خوش رکھے اور برے لوگوں کے شر سے تیری حفاظت کرے۔ تو سلامتی سے جائے اور ہم سے ملنے آتا رہے!"

لیکن اس قصبے میں کبھی واپس آنے کا میرا ارادہ نہ تھا۔ میں ایک مختلف زندگی گزارنے کے لیے بے قرار تھا۔ میں نئی، تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتا تھا اور اس قید ذلت کو جہاں میں نے اتنے آرام برداشت کیے تھے، بالکل فراموش کر دینا چاہتا تھا۔ تحیہ میری منتظر تھی ــــ اور محنت بھی۔ دو ہم آہنگ ہستیوں کے وصل سے جو مسرت پیدا ہو سکتی تھی وہ تمام تر اب میری تھی۔ وہ ہر طرح پرکشش تھی ــــ خاموش، باتیں کرتی ہوئی، سنجیدہ یا ہنستی ہوئی۔ حتیٰ کہ کھانا پکاتے اور گھر صاف کرتے ہوئے بھی وہ سادہ مگر دلکش لگتی تھی۔ میری تنخواہ سے جو کچھ پورا نہ پڑتا وہ اس

کی جمع پونجی سے پورا ہو جاتا۔ اس کی رفاقت نے مجھے ایسا سکون بخشا کہ میں ماضی کے تمام غضب اور قلق اور آلام سے آزاد ہو گیا۔ میں رات کو تین بجے گھر لوٹتا اور صبح دس بجے تک سوتا تھا۔ اس کے بعد محبت اور کتابوں کے لیے وقت ہی وقت تھا۔ ہم دونوں نے اپنی تمام امیدیں تھیئٹر میں میرے کسی ڈرامے کی کامیابی سے وابستہ کر لی تھیں۔ اس کامیابی کے حاصل ہونے تک ہم سادگی بلکہ غربت سے بھی زندگی بسر کرنے کو تیار تھے۔ ہم دونوں کی باہمی مسرت نے ہماری کوششوں کو دوچند کر دیا تھا۔ تجربے نے اپنی قوتِ ارادی کو ثابت کر دیا۔ اس نے شراب کا ایک قطرہ بھی کبھی نہ چکھا اور سگریٹ پینا بھی چھوڑ دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ تو افیون کی بھی عادی ہو چاتی لیکن افیون پہلی بار چکھنے پر اس کی جی متلا گیا تھا اور اسے ہمیشہ کے لیے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ اسے گھرداری میں اس قدر مہارت تھی کہ ایک بار میں کہے بغیر نہ رہ سکا:

"تمہارا گھر ہمیشہ صاف ستھرا اور منظم، تمہارے طعام ممتاز، تمہارا سبھاؤ مہذب۔ بھلا تمہیں وہ زندگی کیوں گزارنی..."

میری بات قطع کر کے اس نے کہا:

"میرے ابا مر گئے تھے اور امی نے ایک مہتمم سے دوسری شادی کر لی تھی۔ وہ میرے ساتھ بدسلوکی کرتا تھا اور امی مجھے نظر انداز کرتی تھیں۔ اس لیے مجھے وہاں سے فرار ہونا پڑا۔"

اس کے آگے نہ اس نے کبھی کچھ بتایا، نہ میں نے جاننا چاہا۔ میں تصور کر سکتا تھا کہ کن حالات نے اسے سرحان الہلالی کے تھیئٹر کی مشق بنایا ہو گا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے یاد آیا کہ میری امی نے بھی اسی تھیئٹر میں کام کیا تھا۔ اسی طرح وہ بھی سرحان الہلالی کے رحم و کرم پر رہی تھیں۔ میں ایک ذاتی جنگ لڑ رہا تھا، ہر قسم کی غلامی کے خلاف، جس میں لوگ گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کیا تھیئٹر اس معرکے کا صحیح میدان ثابت ہو سکتا ہے؟ کیا میرا بیت القدیم کا تصور، جو اس درجہ پست ہو چکا تھا کہ چلا بن گیا تھا، اس پلاٹ کا مضبوط سہارا بن سکے گا؟

***

تیمیہ کی شیریں گفتاری، خلوص اور محبت میں کسی کمی نہیں آئی۔ میرے اپنے والدین کے باہمی تعلقات، میرے لڑکپن میں ہی، کبھی اتنے اچھے نہیں رہے تھے۔ تیمیہ بچے کی خواہش مند تھی۔ اس نے اپنے افسردہ ماضی کو کہیں دور پھینک دیا تھا۔ وہ مجھ سے حقیقی محبت کرتی تھی اور اب میرے بچے کی ماں بننا چاہتی تھی۔ لیکن میں بچہ نہیں چاہتا تھا۔ میں ڈرتا تھا کہ ہماری قلیل آمدنی پر مزید بوجھ پڑ جائے گا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر مجھے خوف تھا کہ اس سے میری لکھنے کی زندگی میں خلل پڑے گا اور یہ فن مجھے دنیا میں سب سے پیارا تھا، حتیٰ کہ محبت سے بھی زیادہ۔ حالانکہ مجھے تیمیہ کی خواہش پوری نہ ہونے کا بے حد افسوس تھا، میرا اخلاقی معیار مجھے خود غرضی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن عین اس وقت جب ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں چڑھتے چڑھتے ہماری دسترس سے نکل گئی تھیں، تیمیہ کی ماں بننے کی آرزو پوری ہو گئی۔ تیمیہ حاملہ ہو گئی۔ اب ہمیں نہ صرف حال بلکہ مستقبل کے لیے بھی سوچنا پڑا اور اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے دوسرے وسائل کھوجنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہمارے حالات نے مجھے یہ یقین دلا دیا کہ اگر اس کا اور بھی امکان ہو تو مجھے ایک اور ملازمت کرنی پڑے گی۔

زمانہ تعلیم میں میں نے یہ سیکھ لیا تھا کہ امریکا اور یورپ کے ادیب لکھنے کے لیے قلم کی جگہ ٹائپ رائٹر استعمال کرتے ہیں۔ میں نے بھی ٹائپ کرنا سیکھ لیا تھا۔ تھیٹر جاتے ہوئے راستے میں فیصل روڈ پر ایک ٹائپنگ بیورو پڑتا تھا۔ میں وہاں کام کرنے لگا۔ مجھے کام کے حساب سے معاوضہ ملتا تھا۔ اس دکان پر میں نے صبح آٹھ بجے سے سہ پہر دو بجے تک کام کرنا شروع کر دیا۔

تیمیہ کو معلوم ہوا تو وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ اس نے کہا:

تم تین بجے رات کو سوتے ہو۔ اب دن کے بدلے صبح سات بجے اٹھو گے، پھر کام پر چلے جاؤ گے۔ واپس آ کر دو گھنٹے کی جھپکی لینے کے لیے کم از کم چار سے چھ بجے تک سوؤ گے۔ تمہیں آرام کرنے کا، پڑھنے لکھنے کا وقت کب ملے گا؟

تو پھر میں کیا کروں؟

تمہارے بچے کی ولادت قریب ہے۔

میں نے غصے سے کہا:

تب اس تنخواہ کا ایک پیسہ بھی قبول نہیں کروں گا۔

میں نے اس موضوع پر مزید بات کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ سچ مچ ایک ممتاز عورت تھی لیکن زندگی کے بارے میں عملی سی تھی۔ وہ میرے مال دار باپ سے مدد مانگنے کو اس پر ترجیح دیتی تھی کہ مسلسل کام میرے وقت و فن اور راحت کو سلب کر لے۔ میں نے دو دن کی چھٹی لے کر ایک ڈراما لکھا اور سر حسن اصلاحی کو پڑھنے کے لیے دیا۔ سر حسن اصلاحی نے کہا:

"تو تم نے ارادہ نہیں بدلا؟"

انتظار کا وہ زمانہ میں نے خوب صورت خواب دیکھتے ہوئے گزارا۔ فن میری سب سے گہری آرزوؤں کی تکمیل ہی نہیں، فی نفسہ میری زندگی بن چکا تھا۔ یہ ڈراما میں نے بیت القدیم کے قمارخانے میں تبدیل ہونے کو ڈرامے کے موضوع کے طور پر استعمال کرنے سے بہت پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ پلاٹ میرے ذہن میں ہنوز پوری طرح جم نہیں پایا تھا۔ تاہم میں اس ڈرامے کے رفیع اخلاقی پیغام سے بھی کافی مطمئن تھا۔ سر حسن اصلاحی نے ڈراما واپس لوٹا دیا۔ اس کا تبصرہ بس اتنا تھا:

"ابھی طویل مراحل سے گزرنا ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا:

"اس میں کیا کمی ہے؟"

اس نے عجلت سے کہا:

"یہ کہانی ہے، مگر ڈراما نہیں ہے۔"

اور لکھنا جاری رکھنے کے لیے ہمت افزائی کا ایک کلمہ تک نہیں!

یا اللہ۔ وہ عذاب بھی ساعذاب! حتیٰ کہ بیت القدیم کے عذاب سے بھی بڑھ کر! فن میں ناکامی بذاتِ خود موت ہے۔ ہم کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ اور میری نسبت سے تو فن محض فن ـ تھا! مجھ جیسے خیال پرست انسان کے لیے تو فن اس عمل کا نعم البدل تھا جو میں کر گزرنے سے معذور تھا۔ اگر میں تھیٹر کے میدان میں جہاد نہ کر سکا تو کیا کروں گا؟ میرے نزدیک تو شر کا مقابلہ کرنے کا یہی ایک میدان تھا۔ اور اگر میں جدوجہد جاری رکھنے کی طاقت کھو بیٹھا تو؟ تب کیا ہوگا؟

دن گزرتے گئے اور میں مسلسل کام میں جتا رہا۔ میں مشین بن گیا۔ میں جلد بازی سے ہم بستری کرنے لگا۔ میں اپنے دل سے کٹ گیا۔ نہ پڑھتا تھا نہ لکھتا ـــ زندگی روزمرہ روٹی کی

مصروفیتوں اور غلاظتوں، پھٹے کپڑوں اور شکستہ اور بدنظم ذریعِ آمدورفت کا مقابلہ کرنے تک محدود ہو گئی۔

ایسے حالات میں، تہمینہ کو اپنے پہلو میں لے کر، میں زندگی پر غور کرتا تو مجھے اپنی حیاتِ مسلسل کاموں کا ایک مختصر خیز کیلنڈر لگتی۔ ہم محتاط خواب دیکھتے ہوئے ایک دوسرے سے بوس و کنار کرتے۔ تہمینہ کے بطن میں پلتی ہوئی زندگی میری موعودہ، مستقبل کی کامیابی کی راگنی کے سُر چھیڑتی۔ لیکن کبھی کبھی میرا تخیل مشتعل ہو جاتا۔ وہ اس بیت المقدس اور اس کے جملہ مقدسوں کو آگ کے شعلوں میں جل کر راکھ ہوتا ہوا دیکھتا۔ وہاں نہ اپنے تخیل کی سفاکی پر مجھے بعد میں ہمیشہ ندامت محسوس ہوتی۔ بے شک مجھے اپنے باپ سے زیادہ محبت نہیں رہی تھی، لیکن اس کے لیے میرے دل میں شفقت اور تردد تھا۔ ایک دن میں نے اپنی قلبی کشمکش کا تہمینہ سے ذکر کیا تو اس نے کہا:

قانون کی نظر میں جیسے قمار خانہ چلانا جرم ہے، لیکن بے پناہ مفلسی بھی ایسا ہی جرم ہے۔

میں نے پوچھا:

کیا تم اپنے گھر میں وہ سب کچھ ہونے دو گی؟

لا سمح اللہ! لیکن میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ بعض لوگ مصیبت میں تنکوں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔"

میں نے خود سے کہا کہ میں بھی کسی ڈوبتے ہوئے شخص کی مانند ہوں۔ قانون کی نگاہ میں میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ باعزت روزگار کی خاطر میں نے اپنا سارا وقت بے وقعت کام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ نتیجے میں میری زندگی چوبِ خشک کی مانند ہو گئی تھی۔ کیا یہ بھی ایک قسم کا جرم نہ تھا؟

دن گزرتے گئے اور میرا اضطراب بڑھتا گیا۔ کسی شیطانی قوت نے میری پوشیدہ خواہشوں کو تخیل کا لباس پہنانا شروع کر دیا۔ ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھے بیٹھے، میں اپنی کھوئی ہوئی آزادی، ختم ہوئی ہوئی تخلیقی قوت اور گم شدہ انسانی وجود کی بازیابی کی آرزو سے مغلوب ہو جاتا۔ قیدی اپنی زنجیریں کیسے توڑے؟ میرے تخیل میں ایک مقدس دنیا ہوتی جہاں گناہ نہ تھا، بندش نہ تھی،

Scanned with CamScanner

سرگرمی ذہن سے دوریاں نہ تھیں، بس ہر سمت تخلیقی قوت وحرکت رہی تھی، نئی حیات جنم لے رہی تھی، نئی فکر طلوع ہو رہی تھی، اس کے سوا وہاں کچھ نہ تھا۔ مکمل سچائی تھی — ماں، نہ باپ، نہ بیوی، نہ بچے۔ ایسی دنیا جہاں مکار ہلکا پھلکا، بادلوں کی طرح تیرتا پھرتا ہے! آدمی ہر عیب سے پاک ہے! خیر اور نیکی کے لیے اپنا وجود وقف کر دینے والوں کے دل کے نہاں خانوں میں چھپے شیاطین پوشیدہ ہیں! اپنی فرشتہ جیسی بیوی کا خیال مجھے مشتعل کر دیتا۔ میں اس عورت کے سامنے مجل ہو جاتا جس کے وجود سے میرے لیے محبت اور صبر کے چشمے پھوٹتے تھے۔ وہ میری روح اپنی حفاظت میں رکھے اور میرے والدین کو معاف کرے۔ تبھی اس نے کہا:

کیا سوچ رہے ہو؟ میں جو کہہ رہی ہوں تم سن ہی نہیں رہے۔

میں نے محبت سے اس کا ہاتھ چھوا اور کہا:

میں آنے والے نئے مہمان کے بارے میں سوچ رہا ہوں، کہ اس کے لیے ہمیں کیا تیاریاں کرنی چاہییں۔"

***

ایک روز میں عم احمد کے بار میں بیٹھنے والا تھا کہ اس کے چہرے پر میں نے کسی [illegible] کی اداسی دیکھی۔ میں نے پوچھا:

خیر یا عم احمد؟

"معلوم ہوتا ہے تم نے کچھ نہیں سنا۔"

"میں ابھی پہنچا ہوں۔ کیا ہوا؟"

اس نے افسوس سے کہا:

"فجر کے وقت... مکان پر پولیس کا چھاپا..."

"ابی؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور کیا ہوا؟"

وہی ہوا جیسی صورتوں میں اکثر ہوتا ہے۔ قمار بازوں کو چھوڑ دیا اور تمہارے والدین کو گرفتار کر لیا۔"

میں نے ایک لمحے میں یہ تمام قصہ فراموش کر دیا۔ میرا حال اتنا خراب ہو گیا کہ پریشانی سے مجھے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ بیٹے اور باپ کے ہونے کے مقسوم نے میرے دل پر خنجر کی طرح ایک کاری وار کیا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ سرحان البلالی نے مجھے فوراً بلوا بھیجا۔

میں ان کے لیے شہر کا بہترین وکیل کروں گا۔ پولیس نے نقدی اپنے قبضے میں لے لی ہے۔ انہیں وہاں کافی منشیات بھی ملیں۔ لیکن پھر بھی امید ہے۔

میں نے کہا:

میں ابھی ان کے پاس جانا چاہتا ہوں۔

ضرور، بیٹا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ آج رات میں تمہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ تھیٹر کا پرانا اصول ہے ـــ کھیل چلتا رہنا چاہیے، خواہ ہم میں سے کسی کے عزیز کی موت ہی کیوں نہ ہو جائے۔ مشکل یہ ہے کہ تمہیں سٹیج پر اپنا کردار ادا کرنا ہے، خواہ وہ مزاحیہ کردار ہی کیوں نہ ہو۔

میں شکست خوردہ اس کے کمرے سے نکلا۔ ماں کے خوفناک تخیلات کے احساسِ جرم نے میرے عذاب میں اور بھی اضافہ کر دیا۔

طاہر کی پیدائش مقدمے سے ذرا پہلے ہوئی۔ وہ ایسے دکھ بھرے، توہین آمیز اور افسردہ ماحول میں پیدا ہوا کہ اس کی ماں نے بھی خوشی کا میرے سامنے کبھی اظہار نہیں کیا۔ وہ ایک ماہ کا بھی نہ ہوا تھا کہ اس کے دادا دادی جیل بھیج دیے گئے۔ وہ صحت مند بچہ نہ تھا۔ اس بات پر ہم دونوں پریشان رہتے تھے۔ لیکن میں اپنے کام میں قرار حاصل کر لیتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو دوبارہ کام میں غرق کر دیا تھا۔ لیکن میرے نصیب میں ابھی اس سے بھی ہولناک الم باقی تھا۔ طاہر ایک ماہ کا تھا کہ میری طبیعت خراب ہو گئی۔ ہم دونوں نے سوچا کہ انفلوئنزا ہو گا، اور خود ہی کچھ دوائیں خرید لیں۔ لیکن جب ہفتے بعد بھی میری طبیعت اچھی نہ ہوئی تو میں ڈاکٹر کو گھر لے کر

آیا۔ ڈاکٹر نے کئی قسم کے ٹیسٹ کرنے کے بعد ٹائیفائیڈ کے شبہ میں تحیہ کو اسپتال میں داخل کرنے کا مشورہ دیا۔

میں نے تحیہ کی دیکھ بھال خود کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس لیے اسپتال میں داخل کرنے کے مشورے کو مسترد کر دیا۔ میں نے ٹیکسٹ بک بیورو میں ملازمت ترک کر دی۔ تنخواہ کے نقصان کو پورا کرنے کے لیے میں نے گھر کا ریفریجریٹر فروخت کر دیا۔ میں دن بھر تحیہ اور بچے کی تیمارداری کرنے لگا۔ میں نے اس طرح جان و دل سے ان کی خدمت کی کہ بچے کی حالت میں فرق آیا لیکن تحیہ کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ کرسی پر بیٹھنے کے قابل ہو گئی۔ اس کے چہرے کی شگفتگی رخصت ہو گئی تھی اور بدن میں ذرا طاقت نہ رہی تھی۔ لیکن وہ مستقل بچے کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ تحیہ کی بحالی سے مجھے ذرا فراغت نصیب ہوئی، حالانکہ ظاہر کی طبیعت اب بھی اچھی نہ تھی۔ رات کے وقت جب میں تھک کر سو جاتا تو اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تحیہ جلد بچے کی تیمارداری کرنے کے قابل ہو جائے گی، لیکن اچانک اس کی حالت پھر بگڑنے لگی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اسے اتنی جلد بستر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ میں دوبارہ، پہلے سے دگنے عزم کے ساتھ دونوں کی تیمارداری میں لگ گیا۔ میری نظریں گھر کی دوسری قابلِ فروخت اشیا کو ڈھونڈنے لگیں۔

لیکن ڈاکٹر کی یقین دہانیوں کے باوجود میرا دل ڈوب چکا تھا۔ اب جب میں تحیہ کے زرد چہرے کو دیکھتا تو اس کے ساتھ گزارا ہوا مسرت کا ایک ایک لمحہ اس طرح یاد کرتا جیسے خاموشی سے اسے الوداع کہتا ہوں۔ ام ہانی نے ہمارے صاحب کی خبر سن کر میری غیر موجودگی میں ہمارے گھر رہنے کی پیش کش کر دی تھی۔ جب آخری گھڑی آئی تو میں گھر سے باہر تھا۔ میں نے دروازے پر ام ہانی کے دل دوز نالے سنے۔ بے مقسوم کو تسلیم کرتے ہیں نے آنکھیں بند کر لیں اور دل کے دروازے تاریک ترین غم کے لیے وا کر دیے۔

تحیہ کی موت کے ایک ہفتے کے اندر اندر ظاہر بھی اس سے جا ملا۔ ڈاکٹر نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ نہیں بچے گا۔ مجھے ٹھیک سے باپ بننے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ اس کا کرب زدہ وجود میرے لیے ہمیشہ غم کا باعث رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

اس زمانے کی مجھے کوئی بات یاد نہیں۔ ہاں، طارق رمضان کا گریہ صاف صاف یاد ہے۔ میں تنہائی میں ہی جی بھر کر رو چکا تھا اس لیے جنازے میں شامل دوسرے لوگوں کے سامنے تحمل سے کھڑا تھا۔ اچانک طارق کی آہ و بکا نے تھیٹر سے آئے تمام لوگوں کو اس کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ میں تعجب سے اس گریے کا مطلب سوچتا رہ گیا۔ طارق رمضان، یہ جانور جس نے اب اپنی ہوس کا رخ ام ہانی کے گھر کی جانب کر دیا ہے کیا وہ نعیمہ سے محبت کرتا تھا؟ میں صرف مرنے والی کے شوہر کی حیثیت سے نہیں، ڈرامانگار کی حیثیت سے بھی طارق رمضان کے آنسوؤں کا مطلب معلوم کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی آخری نشانی پر بھی میں پہلے قلم کو نہیں چھوتا تھا۔

* * *

اور اب تنہائی تھی — خالی گھر میں چھائی خاموشی جو یادوں اور صورتوں سے بھری ہوئی تھی۔ اور حزن اور احساسِ جرم سے ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہوا دل تھا، کیوں کہ برف کی سی سرد حقیقت جو میرے سامنے تھی، سرگوشیوں میں کہتی تھی کہ میرا خواب پورا نہیں ہوا۔ اب میں خواب دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنے غم میں پوری طرح غرق ہو جانے کے لیے تیار تھا۔ لیکن غم اپنی انتہا سے گزر کر ایک خمار طاری کر دیتا ہے جس سے ایک انوکھی سی راحت بھی ملنے لگتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جب طارق رمضان گریہ کر رہا تھا تو حقیقت میں وہ ہنس رہا ہو؟ یہ بھی تنہائی ہے — غم اور صبر — اور ایک دعوتِ عمل۔ عمر بھر مجرد رہنے کا عزم، احساسِ خودداری کا سہارا اور آخری سانس تک فن میں ڈوبے رہنے کا ارادہ۔ میں نے ایک ڈرامے کا پلاٹ سوچ لیا تھا۔ اس کا نام تھا بیت القدیم — ایک قحبہ خانہ کہ جو ایک پیشے والی تھی بجلی کی طرح میری نظروں میں کوند گئی — حسین اور پُرشباب، صحت مند بدن والی تھی، زندگی کی مسرت سے بھرپور تھی۔ میرے دماغ میں ایک نیا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ ڈرامے کی جائے وقوع وہی رہے، کردار بھی زندگی پر مبنی ہوں، لیکن کہانی وہ ہو جو میرے تخیل نے تراشی تھی۔ حقیقت میں گھر پر پولیس کا چھاپا پڑا تھا اور مرض الموت نے نعیمہ اور عامر کو چھین لیا تھا۔ لیکن کوئی اور بھی ان کا قاتل تھا — میرا تخیل، جس نے پولیس سے مخبری کی اور نعیمہ اور بچے کو قتل کر دیا۔ یہ ڈراما لکھ کر میں اپنے

باطن کے جرم کا اعتراف کروں گا اور کفارہ ادا کروں گا۔ میں زندگی میں پہلی بار ایک اصلی ڈراما لکھنے والا تھا۔ سرجان ملالی اسے واپس نہیں کر پائے گا۔ گو ہو سکتا ہے کچھ لوگ سمجھیں میں تخیل کے بجائے کسی خارجی حقیقت کے پوشیدہ جرم کا اعتراف کر رہا ہوں، لیکن مجھے پروا نہیں۔ باطنی لحاظ سے فن تطہیر کا وسیلہ ہے، خارجی لحاظ سے فن اس جنگ کی سبیل ہے جو گناہوں میں پیدا ہونے والے اس شخص پر واجب ہے جو ان کے خلاف بغاوت کا عزم کرے۔ بس یہی ایک حقیقت ہے۔

اور تخلیقی عمل نے میرے وجود کو جکڑ لیا۔

***

ڈراما پڑھنے کے لیے ایک ماہ کی میعاد جب ختم ہوئی تو سرجان ملالی سے ملاقات کے لیے تھیئٹر جاتے ہوئے میرا دل دیوانہ وار دھڑک رہا تھا۔ اس بار اگر انکار ہوا تو میں برداشت نہ کر سکوں گا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں پوشیدہ تبسم کی جھلک دیکھی تو میرا افسردہ دل توقع سے مرتعش ہو گیا۔ اس کی انگلی کے اشارے پر میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ تب اس کی گونج دار آواز سنائی دی:

آخرکار تم نے ایک حقیقی ڈراما لکھ ہی ڈالا

پھر وہ میری طرف ایسی سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا گویا پوچھ رہا ہو کہ آخر کیسے؟ لمحہ بھر کے لیے میرے سارے تفکرات ہوا ہو گئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا چہرہ سُرخ پڑ گیا ہے۔ اس نے کہا:

نہایت شاندار، ہولناک، کامیاب! لیکن تم نے اس کا نام افراح القلبہ کیوں رکھا ہے؟"

میں نے حیرت سے کہا:

"نہ معلوم کیوں!"

اس نے زور سے ہنس کر کہا:

"ادیبوں کے یہی انداز تو میری سمجھ سے بعید ہیں۔ شاید تم شہر کے خلاف اخلاقی کشمکش کی فرحت کی طرف اشارہ کر رہے ہو، یا طنزیہ کہہ رہے ہو جیسے ہم کوئی نام برعکس رکھتے ہیں، کسی سیاہ فام کو صباح یا نور کہہ کر پکار دیتے ہیں۔"

میں نے مسکرا کر اس سے اتفاق کیا۔

"میں تمھیں تین سو پاؤنڈ دینے کو تیار ہوں،" اس نے کہا۔ "سخاوت میری وجہ خوبی کہی جا سکتی ہے۔ یہ کسی بھی ڈراما نگار کو دی جانے والی سب سے زیادہ رقم ہے۔

کاش تم آج زندہ ہو سکتیں! کاش میری خوشی میں شریک ہو سکتیں!

پھر کچھ سوچ کر اس نے پوچھا:

"کہیں کچھ لوگ پریشان کن سوالات نہ پوچھیں؟"

"یہ ایک ڈراما ہے۔ اس سے زیادہ کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔"

"حسن! بالکل ٹھیک! لیکن ہمارے جاننے والوں میں یہ شک شبے کا طوفان اٹھا دے گا۔"

میں نے سکون سے کہا:

"اس کی مجھے پروا نہیں۔"

"براوو! اور کیا لکھا ہے؟"

"میں ایک نیا ڈراما لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔"

"واہ! یہ تمھارے لیے موسمِ باراں ہے۔ میں بہت ہی منتظر ہوں۔ احسان ظریف میں یہ ڈراما کمپنی کو متعجب کر دے گا۔"

***

چھوٹے سے گھر میں مجھ پر بار بار حزن کے دورے پڑنے لگے تھے۔ میں گھر بدلنا چاہتا تھا، لیکن کیوں کر؟ سامان کی ترتیب بدلتے ہوئے، پرانا پلنگ بیچ کر نیا خریدتے ہوئے، مجھے احساس ہوتا کہ تحیہ ان چیزوں سے بڑھ کر میرے وجود میں اتر چکی ہے۔ میرا غم ایسا نہ تھا جو زور شور سے شروع ہو کر دھیما پڑتا جائے۔ شروع میں تو میرا غم ایک حد تک قابلِ برداشت تھا — شاید اس لیے کہ میں سکتے کے عالم میں تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ الم میرے اندر اتنا گہرا اترتا گیا کہ میں صرف وقت کے ہاتھوں اس کے نقوش کے مٹنے کی امید کر سکتا تھا۔ ظاہر مجھ پر اس سانحے کا کوئی خاص اثر نہ ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کے باعث لوگ سوچتے ہوں کہ تحیہ کو یقیناً میں نے قتل کیا ہے، لیکن

Scanned with CamScanner

اب وہ تو پوری حقیقت جان گئی ہے۔ خریف سے قبل ہی میرے والدین کی رہائی ہو گئی۔ مجھ پر ان کا احترام واجب تھا۔ احساسِ فرض ہمیشہ میرے دوسرے جذبات پر غالب آ جاتا ہے۔ اس لیے میں نے ان کا محبت اور کرم کے ساتھ استقبال کیا۔ لیکن انھیں اس قدر ابتر حالت میں دیکھ کر میرا صدمہ اور بڑھ گیا۔ میں نے سرحان البلاقی سے بات کی کہ وہ تھیٹر میں اپنی سابقہ ملازمتوں پر بحال ہو جائیں، اور وہ اس پر راضی بھی ہو گیا، لیکن ان دونوں نے تھیٹر میں کام کرنے اور وہاں کے لوگوں سے کوئی رابطہ رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان لوگوں میں سے کسی نے، سوائے ام ہانی اور عم احمد برجل کے، اس دوران ان سے ملنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس بات پر میں خوش ہوا تھا۔ وہ اب بالکل ویسے بن گئے تھے جیسا میں نے انھیں ڈرامے میں پیش کیا تھا۔ حالاں کہ وہ افلاس کے باعث افیون چھوڑنے پر مجبور ہونے کے باوجود اب بھی عجیب تھے اور میں انھیں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن میں نے ان کی شخصیت کو پوری طرح سمجھنے کا کبھی دعویٰ بھی نہ کیا تھا۔ میں نے ڈرامے میں انھیں افلاس اور منشیات کا شکار فنی ضرورت کے تحت دکھایا تھا۔ نہ جانے ڈرامے میں اپنے کردار کے بارے میں وہ کیا کہیں گے۔ کیا اس ڈرامے کے پیش ہونے کے بعد میں ان کا سامنا کر سکوں گا؟ ماں اب بھی مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ وہ میرے ساتھ رہنا چاہتی تھیں۔ لیکن میں اب آزاد ہونا چاہتا تھا۔ میں کہیں اور اکیلے رہنا چاہتا تھا، خواہ وہ جگہ چھوٹا سا ایک کمرہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں ان سے محبت نہیں تو نفرت بھی نہیں کرتا تھا۔ ڈرامے میں اپنا کردار دیکھ کر انھیں صدمہ پہنچے گا۔ ان کو معلوم ہو جائے گا کہ میں ان کے ایک ایک راز سے واقف ہوں۔ کیا اس کے بعد میں کبھی ان سے نظریں ملا سکوں گا؟ نہیں، نہیں، ہرگز نہیں! میں انھیں ان کے حال پر چھوڑ دوں گا، لیکن ان کی کفالت کا کوئی انتظام کر دوں گا۔ دکان کی تجویز بہت اچھی تھی۔ دراصل یہ عم احمد کی تجویز تھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ اس سے روزگار حاصل کرتے رہیں گے اور صدقِ دل سے توبہ کر لیں گے۔

***

میں طارق رمضان کے روبرو تھا۔ یوں تو اب ہم میں علیک سلیک ہونے لگی تھی، لیکن اس

Scanned with CamScanner

وقت وہ بڑی خصوصی دعوتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے سر پر سوار ہو گیا تھا۔ طارق ایک ایسا شخص ہے جس میں خلوص یا مروت نام کی کوئی شے نہیں۔ میں اس بات پر کئی بار حیران ہوا ہوں کہ وہ کن ہتھکنڈوں سے زندگی کے ساتھ نباہ رہا ہے۔ اس نے جھوٹ موٹ مجھ سے کہا:

"میں ڈرامے کی مبارک باد دینے آیا ہوں۔"

مجھے معلوم تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ بھی کوئی سراغ تفتیش کرنے آیا ہے۔ پھر بھی میں نے اخلاقاً اس کا شکریہ ادا کیا۔

ڈرامے کا ہیرو جو بہت بڑا انسان ہے اور ڈرامہ دیکھنے والوں کو اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہوئی

میں نے اس کی بات کو فوری طور پر نظر انداز کر دیا۔ اپنے خیال میں وہ مجھے ڈرامہ کی راہ سے بتا رہا تھا، لیکن مجھے پروا نہ تھی۔ میں وہ ڈرامے میں اس آدمی سے اصل زندگی میں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھ پر حملہ کرنے آیا ہے۔ میں نے اس کی طرف حقارت سے دیکھا تو وہ بول اٹھا:

تم نے یہ نہ سوچا کہ ڈرامہ دیکھ کر لوگ تمہارے بارے میں کچھ شک کریں گے؟

"مجھے اس کی پروا نہیں۔"

وہ اچانک پھٹ پڑا۔

تم کیسے سنگ دل قاتل ہو!

میں نے حقارت سے کہا:

اب تم ماضی کی باتیں کر رہے ہو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے یہ ایک محبت کا تجربہ تھا، جب کہ تمہارے لیے وہ رشتہ نفرت کے سوا کچھ نہ تھا۔

"کیا تم اپنا دفاع کر سکو گے؟"

"مجھ پر کوئی الزام نہیں ہے۔"

"تمہیں جلد ہی عدالت میں جانا پڑے گا۔"

"تم نہایت احمق اور حقیر ہو۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مسکرا کے کہنے لگا:

خیر میری تو قتل ہونے کی مستحق تھی، لیکن تو بھی پھانسی کے قابل ہے۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اس نفرت انگیز ملاقات کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی گرداب میں چکرا رہا ہوں۔ مجھے اپنے رہنے کے لیے کوئی دوسری جگہ تلاش کرنی پڑے گی۔ مجھے خود کو ان غبی لوگوں کی دسترس سے دور روپوش کر لینا پڑے گا۔ کیا میں سچ مچ پھانسی کے قابل ہوں؟ نہیں نہیں۔ اگر میری پوشیدہ خواہشیں مجھ کو مجرم ٹھہرائیں تب بھی نہیں۔ میری خواہشیں ناقابلِ برداشت بوجھ سے آزاد ہونے کی خواہشیں تھیں، ایسی محبوب ہستیوں سے آزاد ہونے کی نہیں۔ اور وہ خواہشیں وقتی گھٹن سے پیدا ہوئی تھیں، کسی دائمی جذبے کے باعث نہیں۔ کچھ بھی ہو، اب میں ایسی جگہ مزید نہیں رہ سکتا جہاں یہ شیطان کسی بھی وقت گھس آئے۔

***

ایک دلال نے مجھے مضافات میں ایک قیام گاہ "لاکوت دزور" میں کمرہ دلوا دیا۔ یہ بھی تنہائی تھی — گو دوسری قسم کی۔ میں تھا، میری کتابیں تھیں اور میرے خیالات تھے۔ میں زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں رہتا تھا۔ رات کے وقت تھوڑی دیر ورزش کے لیے ٹہلنے نکل جاتا تھا۔ نوکری سے میں استعفیٰ دے چکا تھا۔ اب میں نے طے کیا کہ بیٹھ کر ان گنت خیالات میں سے کوئی ایک منتخب کروں اور لکھنا شروع کر دوں۔ لیکن جب میں لکھنے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ ذہن میں ایک بھی خیال نہیں۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ میں صرف تنہائی میں نہیں رہ رہا تھا، میں ایک خلا میں رہ رہا تھا۔ مجھ کے لیے میرا غم لوٹ آیا — عمیق اور قاہر غم۔ میری نظروں میں طاہر تنک کی شبیہ مجسم ہونے لگی — ننھا سا، کمزور، بیمار، کسی انجانے وجود کے سامنے ایک ایک سانس کے لیے ایڑیاں رگڑتا ہوا۔ مجھے فرار کی خاطر فن سے رجوع کرتا تو وہاں ایک سنسان خلا کے سوا کچھ بھی نہ پاتا۔ میں جل بجھا تھا۔ جس شے نے میرے شعلے کو سیاہ پوش کر دیا اس نے وہاں مُردنی کے سوا کچھ بھی نہ چھوڑا تھا۔ زندگی سے میری رغبت مُردہ ہو چکی تھی۔

اس دوران میں حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میں اخباروں میں متواتر اپنے ڈرامے کی شاندار کامیابی کی خبریں پڑھ رہا تھا۔ درجنوں تنقید نگار مصنف کی تعریفیں کر رہے تھے اور پیش گوئیاں کر رہے تھے کہ اس کی صلاحیتوں سے تھیٹر کی دنیا کو کس قدر فائدہ ہوگا۔ ایک طرف یہ ستائشیں

Scanned with CamScanner

نہیں اور دوسری طرف تنہائی اور موت کے اس جسم میں میرا گھٹتا ہوا وجود۔ ایک بھی سطر لکھے بغیر مسلسل ناکامی زندگی کی سب سے بڑی ستم ظریفی تھی۔ میں اپنی ہڈیوں میں اترتی ہوئی اداسی سے بے حس ہو کر سوچتا: کون سی یہ قوت ٹوٹ گئی تھی!

سرحان ہلالی نے کہا تھا کہ یہ موسم بہار کا ہے۔ لیکن میں سوچنے تک سے معذور ہو چکا تھا۔ میرے خیالات راکھ میں تبدیل ہو رہے تھے۔ باطن میں تخلیق کا چشمہ سوکھ چکا تھا۔ میں موت کے ساتھ رہ رہا تھا۔ میں موت کو چھو سکتا تھا، موت کی بو سونگھ سکتا تھا، موت کو دیکھ سکتا تھا

جب میرے پاس پیسے ختم ہو گئے تو میں سرحان ہلالی کے پاس دوبارہ گیا۔ اس نے معاوضے کے علاوہ مجھے سو پاؤنڈ مزید دیے پر اعتراض نہیں کیا۔ میں موت کے ساتھ کسی دوڑ کے مقابلے میں شامل ہو گیا تھا لیکن میرا باطن اس حد تک بنجر تھا کہ میں ایک زندہ لاش سے بڑھ کر کچھ نہ تھا۔ مس میرے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں عبث ہوں، میرا وجود عبث ہے۔ مس میرے ساتھ کھلواڑ کر رہی تھی۔ وہ مجھے سرے سے موت سنا رہی تھی۔ جب پیسے دوبارہ ختم ہو گئے تو میں پھر سرحان ہلالی کے پاس پہنچا۔ اس بار اس نے سختی مگر شرافت کے ساتھ کہہ دیا کہ وہ مزید رقم صرف اس صورت میں دے گا کہ میں اسے ڈرامے کا کچھ حصہ دکھاؤں۔ اب میری حالت میں حزن اور بزدلی کے ساتھ مفلسی کا بھی اضافہ ہو گیا۔ تب میں نے ایک جائے پناہ کی سوچی باب الشعریہ لیکن کسی شے نے مجھے روک دیا۔ زندگی کے اس مقام پر جہاں میں اپنی مرضی سے ماں باپ کا ہو چکا تھا، اور جہاں میں اب بے گھر بھی ہونے والا تھا، نہ کوئی میرا ساتھی تھا نہ میں کسی کا۔ مجھے زندگی سے کوئی ربط باقی نہ تھا تو پھر میرا انجام وہی ہونا چاہیے جو ڈرامے کے ہیرو کا ہوا تھا۔ آخر کار میں نے اپنی آخری سطریں بھی سوچ لیں۔ میں اپنے آرام اور بار کا ذکر تک نہیں کرنا چاہتا۔ میرے دل میں ان کے لیے خود ہی حقارت تھی۔

عصر کی اذان سے ذرا پہلے میں جاپانی باغ کی طرف چلا گیا۔ میں وہاں ایک بنچ پر بیٹھ گیا چاروں طرف سے بے خبر، سرتاپا اپنے خیالوں میں غرق جو ہولناکی سے متصادم تھے۔ زندگی؟ خاتمہ؟ کہاں؟ کس طرح؟ اس رات میں گھنٹا بھر بھی نہ سویا تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ میرا سر بھاری ہونے لگا۔ دن کی روشنی تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ مجھ پر مردنی سی طاری ہو گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو مغرب پڑھنے کا وقت تھا۔ تاریکی آہستہ، بھاری قدم بڑھاتی چلی آ رہی تھی۔ میں کوئی گھنٹا بھر

سویا رہا تھا۔ میں بینچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اپنے جسم کی غیر متوقع چستی پر حیرت زدہ رہ گیا۔ میرے اندر زندگی کسی برقی رو کی طرح دوڑ رہی تھی۔ میرا سر بھاری نہیں تھا۔ میرے دل پر وہ پتھر کی گرہ بھی موجود نہیں تھی۔ یہ سب کیوں کر ہوا؟ غم و الم بادل کی طرح چھٹ گیا تھا۔ میں ایک بالکل نیا انسان بن چکا تھا۔ یہ کب پیدا ہوا؟ کیوں کر پیدا ہوا؟ صرف ایک گھنٹے کے عرصے میں یہ کایا کلپ کیسے ہو گئی؟ میں ایک گھنٹا نہیں، ایک کامل عمر تک سوتا رہا تھا اور اب اپنی زندگی کے ایک نئے دور میں بیدار ہوا تھا۔ بے شک اسی نیند میں کوئی بات واقع ہوئی۔ یہ راحت اور تازگی اور شادابی جو مجھے اپنے روئیں روئیں میں محسوس ہو رہی تھی، زندگی کا یہ سرور جس نے ماضی کا ہر دکھ حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا تھا ۔ مجھے اس ہمہ گیر تبدیلی کے آغاز کا ذرہ بھر احساس بھی نہ ہو سکا تھا، اور اب یہ آ گئی تھی۔ آ چکی تھی! شاید میں نے کوئی طویل سفر کامیابی سے طے کر لیا تھا۔ ورنہ یہ تازہ آلائش کہاں سے آئی؟ ناقابلِ فہم، غیر متوقع، شاید میں اس کا مستحق بھی نہ تھا، لیکن اتنی اصلی کہ چھوئی جا سکے، رگ و پے میں محسوس کی جا سکے۔ یہ نشاط آگیں مسرت ___ میری تنہائی اور مفلسی کے باوجود، میرے غم و الم، میرے زیاں، میری مخالفتوں کے باوجود ___ میں اسی نشاطِ حیات سے، اسی جوششِ مسرت سے پیوست رہنا چاہتا تھا جیسے یہ کوئی طلسمی تعویذ ہو۔ اس کی قوت اس کے اسرار ہی میں پوشیدہ ہے۔ دیکھو اس کی حیات افزا قوت فتح کے شادیانے بجاتی چلی آ رہی ہے۔ میں فوراً اسٹیشن کی طرف چل پڑا گو کہ وہ بے حد دور تھا۔ ہر قدم کے ساتھ ایک نئی، پُرحرارت قوت میرے وجود میں داخل ہو رہی تھی! امکانات ایک کے بعد ایک یوں روشن ہو رہے تھے جیسے بارش سے بھرے بوجھل بادل کھلے اور پرندے چہچہا رہے ہوں۔ میرا دل رواں زندگی سے معمور تھا، مشتاق تھا، زندگی کے لیے بے قرار تھا اور اس سے کچھ فرق نہ پڑ سکتا تھا کہ میری جیب میں ایک درہم بھی نہ تھا، دشمن میرے تعاقب میں تھے یا میں اپنے ساتھ صدمات کا بار لیے جا رہا تھا۔ کمرے میں چھوڑا ہوا خودکشی کا رقعہ مجھے کافی دور نکل جانے کے بعد یاد آیا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسے واپس نہیں لایا جا سکتا تھا۔ اب وہ کسی کے ہاتھ پڑ جائے تو کیا ہو سکتا ہے؟ مجھے اس کی فکر نہیں ہوئی۔ اس لیے مجھے کسی چیز کی فکر نہیں رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ جب مسرت کا چشمہ راستے کو آزاد کر دے تو یہ نشاط اپنے عروج پر ایک افلاس کے ہاتھوں تاراج، ہڈیوں تک برہنہ وجود پر بھی جگمگا سکتا ہے۔

**

Scanned with CamScanner

ضمیر نیازی

کی معروف اور اہم کتاب

The Press in Chains

کا اردو ترجمہ

صحافتِ پابندِ سلاسل

مجلد ۳۷۵ صفحات   قیمت: ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں

اے ۱۶ ، سعدی ، ٹمس ، بلاک ۱۵ ، گلستان جوہر ، کراچی ۷۵۲۹۰

VISA

بین الاقوامی سطح پر
اردو کے قارئین کے لیے
خوشخبری

اردو زبان کی تاریخ میں پہلی بار

اب دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اردو زبان کے شائقین

اپنی من پسند علمی ادبی اور اسلامی کتابیں

فضلی بک سپر مارکیٹ سے براہ راست اپنے پتے پر حاصل کر سکتے ہیں۔

Fazlee
BOOK SUPERMARKET
RETAILERS • WHOLESALERS • DISTRIBUTORS

رابطہ کیجئے بذریعہ انٹرنیٹ fazlee@tarique.khi.sdnpk.undp.org

رابطہ کیجئے بذریعہ فیکس 0092-21-2633887

رابطہ کیجئے بذریعہ فون 0092-21-2633853

رابطہ کیجئے بذریعہ خط : 4. Mama Parsi Building, Urdu Bazar
Karachi-74200 Pakistan.

آپ کا حُسن دوبارہ آشکارا!
این فرینچ
ہیئر ریموور
این فرینچ

ایک روشن اور محفوظ مستقبل کی نوید!

حبیب بینک کی ماہانہ آمدنی اسکیم

میں سرمایہ لگا کر

سرمایہ حکومت پاکستان کی ضمانت کے تحت محفوظ

۱۶٫۵* فیصد سالانہ

تک بیش بہا منافع حاصل کیجیے۔

گوشوارہ آمدنی

سرمایہ کاری	متوقع کل ماہانہ آمدنی*
۱۰,۰۰۰ روپے	۱۳۷ روپے ۵۰ پیسے
۵۰,۰۰۰ روپے	۶۸۷ روپے ۵۰ پیسے
۱۰۰,۰۰۰ روپے	۱۳۷۵ روپے
۵۰۰,۰۰۰ روپے	۶۸۷۵ روپے

اہم خصوصیات

- سرمایہ کاری کی کم سے کم حد ۱۰,۰۰۰ روپے۔
- سرمایہ کاری کی زیادہ سے زیادہ کوئی حد نہیں۔
- سرمایہ کاری کی رقم ایسی ہو جو دس ہزار سے مکمل طور پر تقسیم ہو جائے۔
- مدت تکمیل: پانچ سال۔
- منافع کی ماہ بہ ماہ ادائیگی۔
- منافع کی سرمایہ کاری: دس ہزار یا دس ہزار سے مکمل طور پر قابل تقسیم رقم لگائی جا سکتی ہے۔

تفصیلات کے لئے ہماری کسی بھی قریبی برانچ سے رابطہ کیجیے۔

* متوقع

آپ کا قابل اعتماد بینک

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (I) Islamabad

aaj

an urdu journal of literature and ideas

Published quarterly from Karachi, aaj presents each time a selection of contemporary writings from many languages of the world, translated in Urdu, as well as some ground-breaking Urdu writings of today. At the end of each regular issue a special section - a small anthology in itself - is devoted to a particular writer or subject. The special issues of aaj published so far have presented selections of Arabic, Persian and Hindi short stories, selected fiction of Gabriel Garcia Marquez, writings from different parts of the world covering the tragedy of Bosnia, and, recently, the "Story of Karachi" in two volumes.

Subscription

Pakistan:
Rs 300 (one year), Rs 500 (two years)
Please send the subscription through cheque/pay order/draft drawn in favour of
"Quarterly Aaj, Karachi"
to the following address:

Managing Editor, aaj,
A-16, Safari Heights,
Gulistan-e-Jauhar, Karachi 75290.
Tel: (021) 811-3474
e-mail: aaj@biruni.erum.com.pk

Outside Pakistan:
Individuls: US$ 25 (one year), US$ 45 (two years)
Institutions: US$ 40 (one year), US$ 70 (two years)
Please send the subscription in US dollars to

Dr Muhammad Umar Memon,
5417, Regent Street,
Madison, WI 53705, USA.
Tel: (608) 233-2942
Fax: (608) 265-3538
e-mail: mumemon@factstaff.wisc.edu

Subscription includes registered air mail charges.

Scanned with CamScanner

سٹی پریس

مطبوعات کے اس نئے سلسلے کے تحت ملک کے شہری اور دیہی علاقوں
کی تاریخ، سماجی صورتِ حال اور متعلقہ موضوعات سے متعلق کتابیں
اردو، انگریزی اور سندھی میں شائع کی جائیں گی۔
یہ کم قیمت کتابیں براہِ راست خریدنے والوں کو معقول رعایت پر دستیاب ہوں گی۔
آنے والی چند کتابوں کی تفصیل یہ ہے:

ناؤں مل ہوت چند

یادداشتیں (اردو ترجمہ)

(سندھ پر برطانوی قبضے اور کراچی شہر کے بسنے کا احوال)

جان برنٹن

John Brunton's Book (انگریزی)

(سندھ اور پنجاب میں ریلوے کی آمد کا احوال)

جمشید نسروان جی

کراچی کے محسن اور معمار کی شخصیت اور کام کے بارے میں مضامین کا انتخاب

اختر حمید خان

تبدیلی کی یادداشتیں

عارف حسن

Working with Government (انگریزی)

(اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے تجربات)

عارف حسن

No Land for the Poor (انگریزی)

(پاکستان کے شہری اور دیہی علاقوں میں رہائشی سہولتوں کی صورتِ حال)

آج کی کتابیں
اے ۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر۔ کراچی ۷۵۲۹۰

Scanned with CamScanner

قیمت: ۷۵ روپے

آج کی کتابیں
اے ۱۶، سفاری بالٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰